رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۲۱۲
ٹیلیفون نمبر ۳۵۲۵

زندگی آمیز اور زندگی آموز ادب کا نمائندہ

نقوش

۸۹

اگست ۱۹۶۱ء

مدیر

محمد طفیل

سالانہ چندہ ۲۰ روپے
ممالکِ غیر سے ۲۵ روپے

قیمت موجودہ شمارہ
دو روپے پچاس پیسے

ادارہ فروغ اُردو، لاہور

ترتیب

مضامین

نظمیں، غزلیں

افسانے

محمد طفیل پرنٹر پبلشر و ایڈیٹر نے نقوش پریس لاہور سے چھپوا کر ادارہ فروغ اردو لاہور سے شائع کیا

ٹون لاج۔ فلیٹ نمبر۲
پنڈی پوائنٹ، مری

برادرم ... سلام مسنون!

... کے چلنے دیکھئے کچھ فرق نہ پڑے گا۔ کوئی نہیں جو اس صفحہ کے پیسے بر
آپ کے پرچہ کو بغیر ملاوٹ کے ... بیمار ہو گیا۔ معلوم ہوا وہ خون خالص ہی تھا۔ جو اس میں رواں دواں
... بیمار کیا ہوا پرچہ بھی بیمار ہو گیا۔ مگر میرے عزیزوں کو بچے سے زیادہ میری جان عزیز ہے
پرچہ مجھے جان کی طرح عزیز ہے۔ مگر میں جو کچھ بھی اپنے محبوب کے لیے کر سکتا تھا
... مجھے یہاں ... بیٹھ گیا۔ یہاں بیٹھ کر میں جو کچھ بھی ... کے مرنے نہ اٹھا سکوں۔ حصہ نظم
... کے تحت ... مگر ایسا بھی نہیں کہ مارے شرم کے ... بارے میں رونا پڑے گا۔ اس
... کے ... ہیں ... تمام اصناف ادب کے بارے میں ... آج لکھی جا رہی ہیں۔ بس آج
... طرح کہ اب ... کل مجھے تمام اصناف ادب کے ... جیسی چیزیں آج لکھی جا رہی ہیں
ہے آج میں ... نظم کو رد ... ہوں ... روز نامہ بنتا جا رہا ہے ... تجربے ... ہوئے جن کی
چیزوں کا حصول اب روز بروز ... زوال مسلسل ہے (چند تجربے ...) ... کے سامنے ... رکھا ہے
برس بعد لکھی نہ جا سکیں گی ... ایک ... (ناول) ... نے یہ ... ادیبوں کے سامنے ... آج کے لکھنے والے
افسانے ملے، چند نظمیں اور ایک ... پہلے لکھنے والے ادیب ہوتے تھے۔ آج کے لکھنے والے
نظم اور زبان گھس گئی۔ مگر کون سنتا ہے۔ پہلے لکھنے والے ادیب ... ادب کی طرح اخلاق کا بھی حال بتا
آپ مجھ سے مری کے بارے میں کچھ پوچھیں۔ ادب کو ... انداز میں دکھانا چاہتو
... پاکستان بھر کے ... زدہ لوگ پہنچے ہوئے ہیں۔ عورتیں ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ... انداز میں دکھانا چاہتی
انھیں ... انداز میں دیکھ لینا چاہتے ہیں ... تو مال روڈ پہ آنکھیں ... کا سے ... تا ہوں کہ جیسے سا
اں ... ننگی چلی آ رہی ہو۔ ... آج تک اس وہم میں مبتلا رہا کہ میں ایک متوازن ذہن رکھتا ہوں۔ ۳۱
مولانا عبدالماجد دریابادی جیسا مومن ہوں اور نہ ... جیسا ... اس پر بھی میں نے ... ان
آخری عمر ... انسان بڑا نمازی اور پرہیزگار بن جاتا ہے۔ نماز میں پڑھتا ہے۔
بالکل اسی طرح میں بھی چاہتا ہوں کہ ادب کی جائے نماز بچھا لوں اور کچھ نیک کام کر جا
سارے ہی ادھورے خوابوں کی تعبیر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لوں۔ میری مراد اس کام سے
کر چکا ہوں۔ یا جن کے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔ اُن کاموں میں مثنوی نمبر، لاہور نمبر، مکاتیب ...
اور ڈرامہ نمبر ہیں ... لاہور نمبر پر بہت سا کام ہو چکا ہے۔ مزید دو تین مہینے کے لیے اس نمبر
مجھے بڑی خوشی ہوگی اگر میں ... جنم بھومی کے بارے میں ایک کام کی چیز پیش کر جاؤں۔ لاہور
دلوں کی دھڑکن بنا رہا۔ لاہور جو ادب کا مکہ اور مدینہ ہے۔ لاہور جو حسن اور خوبصورتی کا
یہاں ... میں نے جو کچھ بھی ... ہے۔ دو اس پرچہ کے علاوہ مثنوی نمبر ہی کے بار
خیال میں یہ نمبر بھی بڑے کام کا ہوگا۔ بڑے بڑے مشہور شعراء کی نایاب مگر غیر مطبوعہ مثنویاں اس نمبر
جوں جوں اس نمبر کے بارے میں کام کرتا جاتا ہوں لطف آ رہا ہے۔ ہائے کیسے کیسے مثنوی گو
ہمارے شعرا بھی کیا ... کے ... عشق کرتے تھے۔ شعر کہتے تھے۔ جانے ان کی ما قسمت کہ
مالا مال کر گئے۔
امید ہے اس شمارہ کے سلسلے میں اب میری ضرورت نہ پڑے گی۔ سارا
... لوٹ آؤں گا (زیادہ موزوں تو ... دیتیو)
اگلے تو بلا لیں ... کی طرف ... کی صحت اب اچھی ہے۔ یہ غریب پہلے ہی ... تھا۔ اس
میرے سب کو سلام عرض کر دیں۔ ... سلمہ ...

ادبی ملاقات

آل انڈیا ریڈیو دہلی پر مولانا عبدالماجد دریابادی سے۔
لکھنؤ یونیورسٹی کے پروفیسر احتشام حسین کی۔

پروفیسر احتشام صاحب: یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آل انڈیا ریڈیو نے اس موقعہ سے آج آپ سے ایک "ادبی ملاقات" کا موقع فراہم کر دیا۔ اس سلسلہ میں کچھ ایسی باتیں پوچھنی چاہتا ہوں جو ادب اور خاص کر اردو ادب کے طالب علموں کے لیے مفید ہوں۔ یہ عرض کر دوں کہ میں آپ کی فلسفیانہ، نفسیاتی، مذہبی اور دوسری علمی تحریریں بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھتا ہوں اور ان کے متعلق بھی بہت کچھ پوچھنا چاہتا ہوں کیونکہ مجھے ان میں بھی ادبی حسن نظر آتا ہے۔ لیکن اس وقت صرف خالص ادبی مسائل پر آپ کا وقت لوں گا۔ ممکن ہے میرے بعض سوالات آپ کو غیر ضروری معلوم ہوں لیکن جوابوں کی افادیت کے پیش نظر مجھے امید ہے کہ آپ ان کے جوابات بھی ارشاد فرمائیں گے۔ تو اجازت ہے؟

مولانا: جی جواب کیوں نہ دوں گا۔ اب تو آپ اور ریڈیو والے میری زبانی پر تل ہی گئے ہیں۔ مگر جناب والا احتشام آپ سے بات کرتے ڈر ہی لگتا ہے۔ تمہید ہی میں تو آپ نے وہ لام باندھ دیا کہ اب خدا معلوم آپ کیا سوال کر ڈالیں۔ کیا پوچھ بیٹھیں! آپ ٹھہرے ایک تو یونیورسٹی کے استاد اور پھر نقاد!

پروفیسر: تو سب سے پہلے یہ فرمائیے کہ آپ کی ادبی زندگی کی ابتدا کب ہوئی۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ میں آپ نے مضامین لکھنا شروع کر دیا تھا لیکن میں ذرا اس کی ابتدائی تفصیل جاننا چاہتا ہوں۔

مولانا: جی کیا عرض کروں۔ یہ سمجھئے کہ یہ خبط پیدائش کے ساتھ ہی لے کر آیا۔ جب سے اردو کی شُد بُد آئی، الم غلم جو چیز بھی ہاتھ آئی سامنے آ گئی، کیا اخبار، کیا رسالہ، کیا کتاب، بس بے پڑھے نہ چھوڑی۔ سمجھ میں آئے نہ آئے، کام پڑھ ڈالنے سے تھا۔ شرر صاحب کے دلگداز کی ایک جلد مل گئی۔ اس میں ناول "حسن انجلینا" نکل رہا تھا۔ اسے چاٹ گیا۔ مذہبی کتابیں بھی اپنی بساط بھر چھان ڈالیں، خصوصاً عیسائیوں سے مناظرہ والی۔ ۱۲ برس کے سن میں تھا اور ساتویں درجہ کا طالب علم۔ کہ پہلا مضمون اودھ اخبار لکھنؤ میں چھپ گیا، مگر گمنام۔ نام دینے کی ہمت کہاں سے لاتا۔ اور پھر والد ماجد کا ڈر الگ۔ نویں درجہ میں پہنچا تو سوفوکلیز (SOPHOCLES) یونانی کے ڈرامہ انٹی گانی (ANTIGONE) کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں شروع کر دیا۔

پروفیسر: کیا اور بات ہے۔ دلی میں نے یہ خاص طور پر جانتے تھے، میرا مطلب یہ ہے کہ کوئی خاص قسم کی ادبی تحریروں سے یا بعض اہم ادیبوں سے متاثر ہو کر آپ نے لکھنا شروع کیا یا اس وقت ادبی زندگی کو مقصدِ حیات بنانے کا خیال تھا؟

مولانا: شوق ایک تو تھا ہی۔ ہاں مولانا شبلی کی زندگی ہی میں ادبی زندگی شروع ہو گئی۔ انھیں کی انگلی پکڑ کر قلم نے چلنا سیکھا۔ اور برسوں چال انھیں کی نقالی کی۔ پھر جب ادبی جوانی پر پہنچ گیا تو ... دور آیا، اور اب ہادی رسوا، مرزا محمد ہادی بنے۔ دہلی امراؤ جان والے رسوا۔ ... اور ... تو بڑے علامہ تھے۔ باقی تھوڑا بہت فیض تو دونوں سے حاصل کیا۔ نام اس مختصر صحبت میں کہاں تک گناؤں۔ ادھر بعض رسالے والوں نے خوب جنگ پر چڑھایا۔ ادھر واہ واہ کہنے والوں کی لپیٹ نے پر لگایا۔ بس لکھنے لکھانے کی ایک لت سی پڑ گئی۔

پروفیسر: کیا آپ نے کبھی شعر بھی کہے؟ میں اس لیے پوچھتا ہوں کہ آپ کے اس دور کے ہم عصروں میں تقریباً سبھی نثر نگار بھی تھے اور شاعر بھی، مہدی افادی اور مولانا عبدالحق کو چھوڑ کر۔ مجھے خیال ہوا ممکن ہے آپ کو بھی اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی ہو۔

مولانا: ٹھیک آپ نے سوال کر ڈالا۔ یہ ہاں ایک زمانہ میں کچھ ہذیان بکا تھا۔ جان "غالب" پر جاتی تھی۔ مگر ان حضرت کی زمین اتنی منگلو ... میں کب تھی۔ آخر ... حسرت موہانی سے لگایا۔ غزلوں کی تک بندی جو کی، انھیں کا دیوان سامنے رکھ کر۔ شاعری گھر کی طرح تنہائی اور ... شادی اپنی پسند کی عنقریب ہونے والی تھی۔ ... دہلی آ کر ... سامنے رہی۔ ... ایک آدھ چیز حضرت اکبر کی خدمت میں روانہ کی۔ دل بڑھانے کے خیال سے انھوں نے خوب خوب داد دی۔ کلام زبانی ... تانے کا کبھی ہیاؤ نہ کھلا۔ خدا بخشے۔ مرزا محمد ہادی عزیز بھی بڑے کرم فرما تھے۔ ان بیچاروں نے لاکھ سر مارا، زبان نہ کھلنا تھی نہ کھلی۔ یہ دور ۱۹۱۳ء سے تین چار سال تک رہا۔ پھر دوسرا دور ۱۹۲۲ء و ۱۹۲۳ء میں آیا۔ اب طبیعت پر مذہب کا رنگ غالب آچکا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر نظر بند تھے۔ انھیں کی نعتیہ غزلوں پر کچھ کہا کہا کیا، یہ ... چیز ... ازروس پڑوس کے قوال ... عرسوں میں اب بھی ایک آدھ چیز گائے جاتے ہیں — گلستے کیا ہیں۔ ... زبانے جاتے ہیں۔

پروفیسر: عام طور سے آپ کو اردو، فارسی، عربی، انگریزی یا دوسری زبانوں کے کن ادیبوں نے سب سے زیادہ متاثر کیا اور کیا وہ تاثر عمر کے تقاضوں کے ساتھ زیادہ بدلا؟

مولانا: اردو کے اصل اُستادوں کے نام تو ابھی عرض کر چکا۔ فارسی میں صاحب مثنوی حضرت مولانائے روم کا کیا کہنا۔ برسوں ان کے ایک ایک شعر پر وجد کا عالم رہا۔ اب بھی ہے۔ اُن کے بعد دل میں جگہ خسرو اور جامی کی ہے، اور پھر اپنے غالب و اقبال کی۔ انگریزی میں طالب علمی کے زمانہ بھر تک شیکسپیر کا بخار رہا۔ بعد کو کشنش، میکالے، کمبلے، مارلے، ڈی۔ ایچ لارنس کی جانب رہی یا پھر بعض فرنچ ناول نویسوں کے انگریزی ترجموں پر توجہ رہی۔ اور اپنے دیس والوں میں گاندھی ایڈیٹر نیو انڈیا، ٹیگور اور محمد علی ایڈیٹر کامریڈ پر۔

پروفیسر: زود پشیماں کے علاوہ آپ نے کوئی اور ایسی چیز لکھی ہے جسے عرف عام میں تخلیقی کہتے ہیں؟

مولانا: جی نہیں، اسی ایک زود پشیماں پر پشیمانی اس مد پشیماں کو آج تک چلی آ رہی ہے۔ خیریت گزری کہ وہ نام کے ساتھ نہ چھپا۔

سن اس وقت ۲۲ سال کا تھا۔ ڈرامے کا اس وقت رسیا بنا ہوا تھا، پڑھنے کا بھی اور ناٹک دیکھنے کا بھی۔ اسکولی زندگی میں دو مرتبہ کیٹری پر انعام پا چکا تھا۔ شلیپیئر آغا حشر کی کمپنی لکھنؤ آئی۔ اُن سے لکنا چاہیئے کہ یارانہ گٹھ گیا۔ معاً بعد بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ راہ میں ریل پر بیکاری کا شغل۔ اور بمبئی کا ترنم۔ انہیں جاتیوں میں اس ڈرامہ کا پہلا مسودہ تیار ہو گیا۔ تخلیقی ادب تو میں سمجھا نہیں کہ کیا بلا ہے۔ باقی محض ادب اگر فرمایئے تو ایک ٹوٹے پھوٹے قلم سے "محمد علی ذاتی ڈائری"۔ دو جلدوں میں کچھ اسی صنف میں نکل چکی ہے۔

پروفیسر: کیا کسی خاص قسم کی ذہنی کشمکش کی وجہ سے آپ نے تخلیقی ادب کی طرف سے کنارہ کشی اختیار کی یا آپ کی افتادِ طبع اس سے بغاوت کرتی تھی؟

مولانا: خاص ادبی زندگی پہلے بھی نہ تھی۔ اس دور میں فلسفہ غالب تھا (اور نفسیات بھی فلسفہ ہی کی ایک شاخ اس وقت تک تھی سائنس کی شاخ ابھی تک نہیں بنی تھی) اور بعد کو مذہب غالب آگیا۔ ادبی حیثیت ضمنی اور ثانوی جب بھی رہی اب بھی ہے۔

پروفیسر: آپ کے جو ادبی مضامین، مضامینِ ماجد، مقالاتِ ماجد اور اکبر نامہ میں شامل ہیں۔ کیا ان کے علاوہ بھی کوئی مجموعہ زیرِ طبع یا زیرِ ترتیب ہے؟

مولانا: اب کیا عرض کروں۔ مضامین نامے کتاب ایک ناشر صاحب نے بغیر میری اجازت کے چھاپ ڈالی۔ مقالات بے شک میری ترتیب دی ہوئی ہے۔ لیکن یہ نام ایک ناشر صاحب کا طبع زاد ہے۔ میں تو اسے انشاءِ ماجد کہلاتا یا پھر ادبی مقالات۔ اکبر نامہ البتہ میرا چھپوایا ہوا ہے۔ لیکن معاذ اللہ غلطیوں کی پوٹ کی پوٹ۔ اچھا ہے کہ میری بدخطی کی سزا مجھے جی بھری مل گئی۔

پروفیسر: آپ کے مضامین کے مطالعہ سے کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ آپ ادبی اقدار کو اخلاقی اقدار کے تابع رکھنا چاہتے ہیں یا کم سے کم اس کے بغیر ادب کو قابلِ تحسین نہیں سمجھتے، اگر ایسا ہے تو کیا آپ ادب میں کسی خاص طرح کی مقصدیت یا افادیت کے قائل ہیں۔

مولانا: تری آواز مکے اور مدینے۔ صحیح سمجھے آپ۔ مذہب جب سے سمجھ میں آیا، اس کی ہمہ گیری، اس کی جہانداری بھی سمجھ میں آگئی۔ ادب کی تکمیل بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے۔ ادب صالح وصحت مند وہی جو صحیح مذہبیت کے تحت میں ہو۔

پروفیسر: ادب میں ایک اہم مسئلہ شخصیت کے اظہار کا بھی ہے آپ کے خیال میں اس اظہار کی نوعیت کیا ہے؟ کیا اس کا تعلق محض اسلوب اور طرزِ ادا سے ہے یا خیالات سے بھی؟

مولانا: جی دونوں ہی سے۔ خیالات سے بیشتر۔ اسلوب سے کم تر۔

پروفیسر: آپ کی ذہنی تعمیر میں تو فلسفہ، منطق اور نفسیات کا کافی ہاتھ رہا ہے، پھر آپ نے فلسفۂ ادب یا فلسفۂ تنقید جیسے مسائل کی طرف توجہ کیوں نہیں کی؟ یا آپ تنقید کے معاملہ میں سرے سے نظریہ اور نقطۂ نظر کے مخالف ہیں؟

مولانا: جی ہاں، اب یارانِ طریقت نے تنقید کو مستقل فن بنا لیا ہے۔ فراخ دل در ہیچ در ہیچ اور نقادی کو ایک پیشہ ٹھہرا لیا ہے۔ میں آتنا دماغ کہاں سے لاؤں، اور اپنی زبان کی ترکیب و ترتیب فرنگی سانچے میں کیسے فٹ کر لوں؟ میرے جی کو تو وہی سیدگی سادی روش مولانا شبلی اور حسرت موہانی کی لگتی ہے اور مرزا ہادی رسوا کا یہ قول نہیں بھولتا، کہ "بھئی میں تو غالب کا عاشق رہا ہوں۔ مدتوں دیوانِ غالب سرہانے رکھ کر سویا ہوں۔ لیکن جو شعر پہلی ہی مرتبہ سمجھ میں نہ آیا۔ اُسے دوبارہ نہ پڑھا۔ یہ سمجھ لیا کہ یہ

میں نے ہیں شعر پر جب غور کرنا پڑا تو وہ فلسفہ ہو گیا شعر کہاں رہا۔

پروفیسر: اس وقت اردو میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں طب و یابس بھی ہے۔ پھر بھی اگر آپ کو کچھ تحریریں پسند آتی ہیں تو کیا ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ موجودہ رفتار ادب سے مطمئن ہیں آپ نام نہ لینا چاہیں تو نہ لیں۔ میں آپ کا عام ردعمل جدید ادب کی طرف سے جاننا چاہتا ہوں۔

مولانا: جی، عام رفتار تو بگاڑ اور فساد ہی کی جانب ہے۔ زبان بگڑتی ہوئی، ترکیبیں بے ڈھنگی، محاورے غلط سلط، خیالات اوٹ پٹانگ، جملے ایسے خشک اور اکھڑی ہوئی کہ جیسے کوئی آموختہ یاد کر رہا ہے وہ بھی سے رکا رکا کر۔ ہاں کوئی دو فیصدی اب بھی ایسے ہیں۔ جو اردو ایسی لکھتے ہیں جیسے مادری زبان لکھی اور بولی جاتی ہے۔

پروفیسر: غالب اپنے "ناکردہ گناہوں کی حسرت" کی داد چاہتے تھے اور مولانا! ہم سب کوئی نہ کوئی "حسرت تعمیر" دل میں لیے بیٹھے ہیں، کیا آپ کو بھی کبھی یہ احساس ہوتا ہے کہ ادبی میدان میں آپ جو کچھ کرنا چاہتے تھے وہ نہ کر سکے؟

مولانا: جی، کیوں نہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ تعمیر کی ہی کہاں۔ جو کچھ ہے تعمیر کی حسرت ہی حسرت ہے۔

پروفیسر: آپ کی علمی اور مذہبی تصانیف کا سلسلہ تو جاری ہے کیا کسی ادبی سلسلہ پر بھی کوئی مستقل تصنیف مرتب کرنے کا خیال ہے؟

مولانا: جی نہیں۔ اب کسی خالص ادبی سطح پر نزول کی مہلت کہاں۔ مجذوب مرحوم تو آپ کو یاد ہوں گے۔ ہی لکھنؤ میں برسوں گزارے۔ راہ طریقت کے ساتھ نام کے مجذوب کیا خوب کہہ گئے ہیں ؎

جس کا پڑا ہے جام کا شغل ہے صبح و شام کا
اب میں تمہارے کام کا اے ہمہ نفس رہا نہیں

اور عارف رومیؒ کا تو کہنا ہی کیا ؎

قافیہ اندیشم و دلدار من ۔۔۔ گویدم مندیش جز دیدار من

پروفیسر: ایک آخری سوال اور! کیا اس وقت بھی کبھی کبھی آپ کو تفریحی ادب کے مطالعہ کا وقت ملتا ہے؟ اگر ملتا ہے تو آپ کس قسم کی اور کن مصنفوں کی تحریریں پڑھتے ہیں؟

مولانا: جی ہاں، کسی حد تک کیوں نہیں۔ سرشار کا فسانہ آزاد آج بھی مزہ دے جاتا ہے۔ اور حال کے لکھنے والوں میں شفیع دہلوی ہیں، دہلی ریڈیو کے حضرت "آوارہ" ہیں اور دس پانچ اور بھی۔ بزم اردو انہیں کے دم سے قائم ہے۔

پروفیسر: مولانا! میں آپ کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے اپنے جوابات سے مجھے سرفراز فرمایا۔

مولانا: یہ کہئے کہ دنیا کے سامنے اپنی رسوائی و تشہیر کا سامان فراہم کر دیا۔

شمشیر تیز تر

قاضی عبدالودود

شمشیر تیز تر احمد علی کا وہ رسالہ ہے جو انھوں نے غالب کے رسالے تیغِ تیز کے جواب میں لکھا تھا۔ اس کے صفحہ ۱ پر جو کچھ مرقوم ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالہ (شمشیر تیز تر = ۱۸۶۷) ۱۸۶۷ء میں بسعی عبداللہ خاں مطبع نبوی (مولوی غلام نبی خاں) میں چھپا تھا۔ صفحہ ۲ تا ۱۵ میں غالب، عبدالصمد، فدا شاگرد احمد علی، باقر علی باقر، فخرالدین حسین سخن تلامذۂ غالب کے قطعات اور علی کی طرف سے باقر و سخن کے قطعوں کا جواب بطور قطعہ ہے۔ یہ سب قطعات ایک ہی زمین میں ہیں۔

صفحہ ۱۵ کی پشت پر جو صفحہ ہے، وہ صفحہ ۱ قرار دیا گیا ہے۔ اور اصل رسالہ وہاں سے شروع ہو کر صفحہ ۴۰ میں تمام ہو جاتا ہے۔ صفحہ ۱ میں بسم اللہ۔۔۔۔ الخ کے بعد دس سطریں ہیں لیکن علی العموم فی صفحہ ۱۷ سطریں ہیں۔ پہلی سطر یہ ہے:

"الحمد للہ رب العالمین، حافظ العباد من سیف لسان المتقلبین"

تیسری سطر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مصنف سنی تھا۔

دیباچۂ شمشیر تیز تر = ش کی عبارات ذیل ملاحظہ ہوں:

"چوں۔۔۔۔۔ مؤید برہان مطبوع گشتہ بنظر۔۔۔ غالب۔۔۔ رسیدہ، برو در مدتی پراگندہ گفتاری چند ناتمام بر بعض مواضع آں بطریقِ التقاط جمع کردہ موجز رسالہ مسمّٰی بہ تیغ تیز نہ بفارسی بل بحکم آں کہ ترکی او تمام شد، بزبان خودش اردو برقم آوردہ۔۔۔۔ و پیش ازیں برہان قاطع را پس از مطالعہ جوابہا چیزی محو و اثبات نمودہ بار دیگر بطبع آوردہ و نقش درفش کاویانی کردہ۔۔۔۔ و نہ اندیشید کہ چوں بدست احمدی کیشان افتد پارہ پارہ شود۔۔۔۔ و وقتی تیغ تیز برآوردہ و نفہمید کہ ایں پیش جوہر شناسان تیغ چوبینہ بیش نیست۔ بما نا ہمان مثل است کہ گفتہ اند: ہیچ ابن ربیع کہ شخصی جبان و کذاب بودہ است تیغی داشت کہ در رود و در چوب فرقی نبودہ است و او بعنوان ""برعکس نہند نام زنگی کافور"" آں تیغ را لعاب المنیہ نام کردہ بود۔۔۔۔ اگرچہ مرا احتیاج گفتگو درخصوص ایں رسالۂ ہندی نبود زیرا کہ آنچہ دریں رسالہ

است با جواب مؤید برہان تعلق ندارد ... لیکن از برای آنکہ کوتہ اندیشاں فریب
نخورند ... سکوت دریں مقام نا ملایم نمود " صلا تا صلا

غالب نے قاطع برہان کی اشاعت اوّل میں تو نہیں، لیکن اس کی اشاعت ثانی میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہندوستانیوں کے سوا کسی نے فارسی لغت نہیں لکھا۔ احمد علی نے اپنے دیباچے میں یہ ثابت کیا ہے کہ سروری صاحب مجمع الفرس ایرانی تھا۔ اس کے بعد اس نے فرہنگ جہانگیری اور اس کے جامع سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ

"تمادت سروری ... کہ شاعر فاضل است بر جلالت قدر میر جلال الدین حسین
انجو فرہنگ او حجت متین است مراسکات منکران را ..... در ..... مآثر الامرا ....
مرقوم است میر جمال الدین انجو .... از اعیان سادات شیراز اند ... بولایت دکن
وارد شدہ حکام آنجا مراسم احترام .... بجا آوردہ .. .. بملازمت عرش آشیانی
داکبر) رسیدہ .... با شاہزادہ سلیم خصوصیت تمام داشت، پس از جلوس منصب
چہار ہزاری و مرحمت نقارہ و علم پایہ برتر افراخت .... منصب پنج ہزاری پس از آں بحکومت بہار تلمذ گرفتہ"

مگر جمال الدین حسین انجو کا باپ ایران سے آیا تھا۔ وہ خود ہندوستان میں تولد ہوا تھا۔ احمد علی نے لکھا ہے کہ انجو نے زردشتیوں سے بھی تحقیق لغات کی تھی اور یہ صحیح ہے۔ اس نے سروری و انجو دونوں کے مآخذ کی فہرست بھی دی ہے۔ جس میں بہت سی فرہنگیں ایرانیوں کی لکھی ہوئی شامل ہیں۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جب عربی لغات صحاح، قاموس، صراح جو اہل زبان کی تالیف نہیں، مستند سمجھے جاتے ہیں تو اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ ہندیوں کی فارسی فرہنگیں یک قلم غیر معتبر متصور ہوں۔ (صلا تا صلا)

احمد علی نے مندرجات تیغ تیز سے بحث کرتے ہوئے امور ذیل کی خاص طور پر تردید کی ہے:

(۱) غالب نے لکھا تھا کہ قاطع برہان کے خلاف جو کتابیں نکلی تھیں، ان میں تیسری قاطع القاطع اور چوتھی مؤید برہان تھی۔ وہ دونوں کے سنین طبع دے کر ثابت کرتا ہے کہ قاطع القاطع چوتھی اور مؤید برہان تیسری ہے۔

(۲) غالب نے الزام لگایا تھا کہ احمد علی نے ان کا ایک فقرہ چرایا تھا اور اسے مسخ کر دیا تھا۔ غالب جو فقرہ اس کی طرف منسوب کرتے ہیں یہ ہے "غم گفتار پارسی زبان خورد" خود ان کا فقرہ یہ ہے: "غم تباہی آئین گفتار پارسی خورد" احمد علی کہتا ہے کہ میرا فقرہ دراصل یہ ہے "غم تباہی گفتار فارسی خورد" ظاہر ہے کہ اس میں کچھ سقم نہیں۔ سرقے کے متعلق وہ بقسم کہتا ہے کہ وقت تحریر غالب کا فقرہ مجھے یاد نہ تھا (شمشیر صلا)

(۳) غالب کا اعتراض یہ ہے کہ دال و ذال سے متعلق ایک بالکل نئی بات جو عبدالصمد نے مجھ سے کہی تھی اور کوئی دوسرا اس سے واقف نہ تھا، احمد علی نے چرائی اور اپنے قول کی حیثیت سے پیش کی۔ احمد علی کا جواب یہ ہے کہ وہ عبارتیں جن میں یہ مطالب ہیں، اس کی نہیں صراحتہً فرہنگ جہانگیری سے منقول ہیں۔ ظاہر ہے کہ چوری کا الزام نہ صاحب فرہنگ پر ہو سکتا ہے۔ نہ احمد علی پر۔

(غالب) "مدرس صاحب کا یہ قاعدہ کہ سوال کا جواب نہ دیں اور خارج از مبحث دفتر کے دفتر لکھے جائیں۔"

استوار ہے کہ کبھی چوکتے نہیں۔ چنانچہ صفحہ ۱۶ اور صفحہ ۶۹ میں پاژاج کی بحث میں حضرت نے کیسے کیسے کنویں جھانکے ہیں۔ زاج کو جیم سے بھی جائز رکھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کبھی نہیں ہو سکتا۔ زچہ بجیم سہ نقطہ لفظ زاج بجیم سہ نقطہ ہے۔ جو اس کو جیم ابجد سے لکھے وہ غلط گو اور اس کا قول مردود۔"

(۱) محمد معترض در قاطع برہان گفتہ کہ ہے ہے پاژاج دایہ شہرۂ ہند را گویند پازاج زنے را گویند کہ خدمت زنان باردار کند و بچہ از شکم بیرون آرد و در عرفِ آں را قابلہ و در ہندی دائی و عجیب در مؤید برہان نوشتہ کہ در نثر خانۂ دستان غالب مرقوم ست و پازاج دایہ ناف کہ تعہد زچہ کند و تقبیل با جیم فارسی و موید تیم تازی ایں بیت منصور شیرازی ؎

بناز مادر ایام طفل بخت ترا

بزرگ کند اندر کنار چوں پازاج

انتہی و کذا فی مؤید الفضلا و مدار الافاضل و سروری کاشانی میفرماید "پازاج بزائے معجمہ و جیم تازی بوزن تاراج دایہ باشد مثالش منصور شیرازی گوید ؎ بناز مادر ایام ..... الخ و در فرہنگ (فرہنگ جہانگیری) بمعنی قابلہ آوردہ کہ نام ناف و مادہ چہ نیز گویند و بایں بیت سوزنی تمسک شدہ ...

گفتہ من حامل زادہ طبع

نبود ہر خشوک را پازاج

در ذمودہ کہ منصور شیرازی سہو کردہ کہ بمعنی دایہ نظم کردہ اما بجاد این بے اطاعت میرسد کہ چوں زاچ زان زایندہ باشد پازاج یعنی زنے کہ خدمت او کند۔ پس دایہ را پازاج تواں گفت چہ او نیز مقصد زنان زایندہ می کند۔ تم کلام السروری و در رشیدی نیز گفتہ کہ پازاج بجیم تازی ہمپائی کنندہ بازن زاں اعم ازانکہ مرضعہ باشد یا قابلہ۔ پس تخطئہ جہانگیری فرق است انتہی۔ و خان آرزو در پازاج از قوسی ایرانی و غیرہ ہر دو معنی نقل کردہ و گفتہ کہ تخطیہ بمعنی شہرہ خطا ست تم کلامہ پس تخطیہ غالب ہم بمعنی شہرہ خطا باشد۔ تمام شد بحث نص مؤید برہان۔

است اہل تمیز و انصاف انصاف دہند بیان معترض و عجیب نگاہی و مصداق ایں مقولہ "کیسے کیسے کنویں جھانکے ہیں" کیست جواب سوال دادہ شد یا نہ و کلام خارج از بحث کردہ شد یا نہ ارشاد ی (کذا) و منصور شیرازی و سروری کاشانی و قوسی ایرانی وغیرہم کہ زاج بہ قافیۂ تاراج و مانند آں بجیم ابجد آوردہ صادق اند یا معترض و از روی ایں فتوی کہ ہندوستانی اہل زبان کے برخلاف تو ہوتے "بمخالفت ایں اہل زبان گفتار غالب ہندی مقبول است یا مردود۔ و ازینکہ معترض دریں رسالہ ہمیں از جیم پازاج می راند و از معنی آں لفظ حرفی نزد معلوم میشود کہ آں انکار معنی مرضعہ کہ اورا در قاطع برہان بود بعد از مطالعہ مؤید برہان نماند و ناکسہ سروری کاشانی را تسلیم نمود۔ کاش لفظ او را ہم مثل معنی صحیح داشتی و جیم ابجد را درست پنداشتی" صفحہ ۶۹

احمد علی نے غالب کے ان نئے اعتراضات پر بھی توجہ کی ہے جو قاطع برہان کی اشاعت دوم میں بڑھائے گئے تھے۔ اور غالب نے اشاعت دوم میں جو مطالب کی ترمیم کی ہے، ان کا بھی ذکر کیا ہے۔

آخر میں یہ عبارات ملتی ہیں:

مکاتب با خدمت مرزا نوشہ بدیں چنیں امور اقدام نکردمی و طرح قاطع برہان و متعلقات آں نیند اختی کہ پیش ہر کہ ستبدہ و محمود اوی آری ع بر کتابہ آبرد کاریکہ مرزا کردہ است" چوں معترض بعدا مناظرہ سخن می کند و بیشتر بمکابرہ در می تابد۔ بہمیں قدر اکتفا نمودم و راہ خموشی پیمودم۔ انشاء اللہ دیگر با او دریں باب سخن نگویم سخن بپایاں انجامید و رسالہ باختتام رسید"

اس کے بعد ایک قطعۂ تاریخ ہے اور اس کے بعد "صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین تمت" مرقوم ہے۔

صفحات ۱۰۵ تا ۱۰۶ میں تین قطعات تاریخ ہیں۔ پہلے قطعے (۱۸۶۷ء) کے جو محمد اشرف خاں یکے از معلمین مدرسہ احمدیہ کا ہے دو شعر یہ ہیں:

ہر آنکس ز احمد بود منحرف   نہ غالب کہ مغلوب و مرتد بود
ہر آنکس بپیش خرد کافر است   کہ او مبطل قول احمد بود

دوسرا قطعہ امداد علی مضطر کا ہے (۱۸۶۸ء) آخری کاتب کتاب کا ہے۔ مصرع تاریخ یہ ہے "ترکی و دادہ جواب ترکی ہے" ۱۲۸۶۔ غالب ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے تھے۔ اس رسالے کا انطباع ان کی زندگی میں شروع ہوا تھا، ختم اس وقت ہوا جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری

علمی و ادبی کارنامے

محمد عبداللہ قریشی

تصنیفات

مولانا فیض الحسن عربی۔ فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے باکمال ادیب اور نادر الکلام شاعر تھے۔ حضرت صہبائی سے مشورۂ سخن لیتے تھے اور فیضی کے مانند خیال تخلص بھی کرتے تھے۔[1] سخن فہمی اور نکتہ سنجی میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ ان کے دم قدم سے پنجاب میں اردو کا باغ لہلہا رہا تھا۔ ان کی موجودگی سے انجمن پنجاب کے مشاعروں میں بڑی رونق ہوتی تھی۔ وہ اپنے شاگردوں کے ساتھ ان میں شریک ہو کر داد سخن دیتے اور اردو کی آبیاری کرتے۔ مولانا محمد حسین آزاد سے ان کی اکثر نوک جھونک رہتی جو بڑی پر لطف اور مفید ہوتی تھی۔

بہت سی تصانیف مولانا کے علم وفضل کی یادگار ہیں۔ مندرجہ ذیل کتابیں خاص طور پر مشہور ہیں۔

نمبر شمار	کتاب کا نام	سال تصنیف یا سال طبع	صفحات
۱	حل ابیات بیضاوی (عربی) مطبوعہ	۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء)	۱۲۰
۲	تعلیقات الجلالین (عربی) مطبوعہ	۱۲۸۷ھ (۱۸۷۰ء)	۳۰۷
۳	فیضی۔ شرح حماسہ (عربی) مطبوعہ	۱۲۹۴ھ (۱۸۷۷ء)	۸۰۰
۴	تحفۂ صدیقیہ (عربی) مطبوعہ	۱۲۹۵ھ (۱۸۷۸ء)	۶۴
۵	حاشیہ دیوان حسانؓ بن ثابت (عربی) مطبوعہ	۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء)	۱۳۰
۶	ریاض الفیض شرح السبع المعلقات (عربی۔ فارسی۔ اردو) مطبوعہ	۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء)	۴۷۱

[1] خمخانۂ جاوید۔ جلد سوم ص۱۶۵

۷	حاشیہ دیوان النابغۃ الذبیانی (عربی)	دستیاب نہیں ہوا	—
۸	فیض القاموس (عربی) مطبوعہ	۱۲۹۹ھ (۱۸۸۱ء)	—
۹	عروض المفتاح (عربی) مطبوعہ	۱۳۰۲ھ (۱۸۸۴ء)	۶۴
۱۰	دیوان الفیض (عربی) مطبوعہ	۱۳۳۴ھ (۱۹۱۵ء)	۸۴
۱۱	شرح تاریخ تیموری (عربی) غیر مطبوعہ	مولانا فیض الحسن کے پوتے مولوی	—
۱۲	ضوء المشکوٰۃ (شرح مشکوٰۃ المصابیح)	نصر العزیز قریشی کے پاس سہارن پور	—
	(عربی) غیر مطبوعہ تالیف ۱۲۷۳ھ	میں موجود ہیں۔	
۱۳	خلاصہ کتاب زیلاقی (عربی) غیر مطبوعہ	۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء)	—
۱۴	قرابادین فیضی (فارسی) غیر مطبوعہ	۱۲۷۸ھ (۱۸۶۱ء)	—
۱۵	نسیم فیض (دیوان فارسی) مطبوعہ	۱۳۲۱ھ (۱۹۰۳ء)	۲۴
۱۶	مثنوی روضۂ فیض (فارسی) مطبوعہ	۱۳۱۸ھ (۱۹۰۰ء)	۴۸
۱۷	مثنوی چشمۂ فیض (فارسی) مطبوعہ		
۱۸	مثنوی صبح عید (اردو) مطبوعہ	۱۲۹۹ھ (۱۸۸۲ء)	۶۴
۱۹	فیضیہ (اردو) مطبوعہ	۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ء)	۴۲
۲۰	گلزار فیض (دیوان اردو) غیر مطبوعہ	—	—

مولوی عبد الغفور خاں نساخ[1] نے تذکرہ "سخن شعرا" میں مثنوی روضۂ فیض اور مثنوی چشمۂ فیض کے علاوہ مندرجہ ذیل تصانیف کا بھی ذکر کیا ہے :۔

[1] ابو محمد عبد الغفور خاں خالدی نساخ مشرقی بنگال کے ایک ضلع فرید پور میں ۱۲۴۹ھ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد قاضی فقیر محمد ابن قاضی محمد رضا کلکتہ ہائی کورٹ کے سربرآوردہ وکیل تھے۔ علم و ادب اور تاریخ سے خاص شغف تھا۔ جامع التواریخ کے نام سے ایک کتاب بھی تالیف کی تھی۔ نساخ نے حافظ ضیغم کی شاگردی اختیار کی۔ ڈپٹی مجسٹریٹ اور ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے ان کا تبادلہ بہار اور بنگال کے مختلف مقامات پر ہوتا رہا۔ جہاں گئے شاعری کا لوہا منوایا۔ جب ان کا پہلا دیوان "دفتر بے مثال" شائع ہوا تو غالب نے تحسین آمیز خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی بے شمار تصانیف میں تذکرہ سخن شعرا مشہور ہے جو ۱۲۹۱ھ میں لکھنؤ سے شائع ہوا۔ قطعہ منتخب اور فارسی گو شعرا کا بھی ایک تذکرہ مرتب کیا تھا جس کا نام تذکرۃ المعاصرین تھا۔ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء میں انتقال کیا۔ (دیکھو کتاب بنگال میں اردو از وفا راشدی اور مضمون "خطوط داغ" از امتیاز علی خاں عرشی رامپوری مطبوعہ رسالہ اردو ادب علی گڑھ ستمبر ۱۹۵۶ء جلد ۵ شمارہ نمبر ۲ ص ۴۵)

"مولوی فیض الحسن باشندۂ سہارنپور مقیم دہلی صاحب شواہد التفسیر و شواہد خمسہ و تذکرہ صحابہ ...... وغیرہ کتب کثیرہ عربی و فارسی[1]..."

نساخ نے یہ تذکرہ بارہ برس کی محنت سے ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں مکمل کر لیا تھا۔ "سخن شعراء" تاریخی نام ہے۔ مولانا فیض الحسن اس وقت تک لاہور نہیں آئے تھے اور دہلی میں مقیم تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کی مذکورہ بالا تصانیف نہ محض مکمل ہو چکی تھیں بلکہ خاصی شہرت پا چکی تھیں۔ ان میں سے شواہد التفسیر تو وہی ہے جس کا دوسرا نام "حل ابیات بیضاوی" رکھا گیا۔ البتہ شواہد خمسہ اور تذکرہ صحابہ کا کوئی سراغ اب تک نہ مل سکا۔ ابوالنصر سید علی حسن خاں ابن نواب صدیق حسن خاں نے اپنے تذکرہ "بزم سخن"، تصنیف ۱۲۹۸ھ (۱۸۸۱ء) میں بھی ان دونوں کتابوں کو مولانا فیض الحسن کے نام منسوب کیا ہے[2]

جن تصانیف کی تفصیلات سے ہمیں آگاہی کا موقع مل سکا ان کی کیفیت درج ذیل ہے:-

(۱) حل ابیات بیضاوی

قرآن مجید کی تفسیروں میں بیضاوی کا خاص درجہ ہے۔ یہ قاضی نصیر الدین بیضاوی کی تصنیف ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآن مجید کی تشریح بالعموم لغت اور صرف و نحو کے ذریعے سے کی گئی ہے۔ مولانا فیض الحسن نے ان تمام اشعار کی تشریح فرمادی ہے جو تفسیر بیضاوی میں مذکور ہیں تاکہ ان کے سمجھنے اور صحیح تفسیر ذہن نشین کر لینے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

مولانا فیض الحسن سے پیشتر تفسیر بیضاوی پر کئی حاشیے لکھے جا چکے تھے جن میں سے ایک حاشیہ علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی کا تھا جو انڈیا آفس لائبریری میں ہے[3]

دوسرا قابل ذکر حاشیہ حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی المتوفی ۲۹ محرم ۹۹۸ھ نے لکھا جو بے حد مقبول ہوا۔ یہ دسویں اور گیارھویں صدی میں عرب و شام میں عام طور پر زیر درس تھا[4] اس حاشیہ کا ایک قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ حیدر آباد دکن میں ہے اور دوسرا ۲۲ شہر ذی الحجہ روز دوشنبہ ۱۰۳۰ھ کا لکھا ہوا نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی مرحوم کے کتب خانہ واقع حبیب گنج (علی گڑھ) میں ہے[5]

بیضاوی پر ایک اور حاشیہ بھی ملتا ہے جو مظہر الدین گاوزرونی کا ہے اور شاہ وجیہ الدین صاحب نے اپنے ہاتھ سے اس کو نقل کیا ہے۔

---

[1] تذکرہ سخن شعرا مطبوعہ نولکشور صفحہ ۲۷۵

[2] بزم سخن مطبوعہ مطبع نامی مفید عام آگرہ صفحہ ۹۴

[3] دیکھو فہرست عربی مخطوطات انڈیا آفس لائبریری مرتبہ سی۔ اے۔ اسٹوری۔

[4] دیکھو مضمون "حضرت شاہ وجیہ الدین علوی گجراتی" از سید ابوظفر ندوی مطبوعہ معارف اعظم گڑھ مارچ ۱۹۳۲ء صفحہ ۲۲۱

[5] دیکھو مضمون "حاشیہ بیضاوی شاہ وجیہ الدین صاحب" از سید سلیمان ندوی مطبوعہ معارف اپریل ۳۲ء صفحہ ۲۹۹-۳۰۰

مولانا فیض الحسن نے حل ابیات بیضاوی کا مسودہ اپنے فاضل استاد مولانا فضل حق خیرآبادی کی خدمت میں پیش کیا تو انھوں نے اسے بے حد پسند فرمایا اور اپنے قیمتی مشوروں سے کتاب کی افادیت کو چار چاند لگائے۔

یہ کتاب $\frac{۲۲ \times ۲۹}{۸}$ سائز کے ۱۲۰ صفحات کی ہے اور ۷ رجب ۱۲۷۱ھ (۱۸۵۴ء) کو مطبع فخر المطابع دہلی میں باہتمام نیاز احمد طبع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا دوسرا نام "شواہد التفسیر" ہے اور یہ عربی میں ہے۔

"حل ابیات بیضاوی" ایسی کتاب تھی کہ بڑی بڑی درسگاہوں میں اس سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ مولانا سید عبدالحیٔ رائے بریلوی "ارمغان احباب" میں لکھتے ہیں کہ وہ میاں نذیر حسین محدث دہلوی کے درس[1] میں شریک تھے۔ بیضاوی کا سبق شروع ہوا۔ شواہد میں "عشق" کا شعر آ گیا۔ اس میں دیر تک قاری اور سامع متوجہ رہے۔ مگر پھر بھی ناکامیاب رہے۔ مولوی صاحب (میاں نذیر حسین) نے فرمایا کہ حل ابیات ہمارے پاس ہے۔ اس میں خوب حل کر دیا ہے۔[2]

(۲) تعلیقات الجلالین

یہ $\frac{۲۶ \times ۲۰}{۸}$ سائز کے ۲۰۰ صفحوں کی کتاب ہے اور عربی میں ہے۔ اسے حاشیہ تفسیر جلالین بھی کہتے ہیں۔ یہ شعبان ۱۲۹۷ھ میں حافظ عبدالرزاق نے اہتمام سے انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ میں طبع ہوئی تھی۔

اس کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب سرسید احمد خاں کا تقرر بحیثیت صدرالصدور غازی پور میں ہوا۔ تو انھوں نے مولانا فیض الحسن کو وہاں آنے کی دعوت دی۔ مولانا وہاں پہنچے اور سرسید کے مہمان ہوئے۔ اس دوران سرسید نے انھیں اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ تفسیر جلالین پر تعلیقات لکھیں تاکہ اس کی مدد سے تفسیر کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ چنانچہ انہی کی تحریک سے یہ شرح لکھی گئی۔

سرمایہ پاس نہ ہونے کی وجہ سے اس کا نصف حصہ شائع کیا گیا اور وعدہ کیا گیا کہ اس کی فروخت سے جو رقم وصول ہو گی اس سے باقی کا نصف حصہ طبع کیا جائے گا۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بقیہ نصف چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔

تفسیر جلالین میں قرآن مجید کی تشریح حد درجہ ایجاز و اختصار سے کی گئی ہے۔ مولانا تعلیقات کے آغاز میں فرماتے ہیں:

> "تفسیر جلالین لفظی اور معنوی اعتبار سے قرآن مجید کی بہترین تفسیروں میں شمار ہوتی ہے اور کثرت سے پڑھی جاتی ہے۔ اس میں کئی ایسے حقائق اور معارف موجود ہیں جن کی طرف ابھی تک لوگوں کی توجہ مبذول نہیں ہوئی۔ یہ دیکھ کر میں نے

---

[1] شیخ الکل میاں صاحب سید نذیر حسین محدث دہلوی (المتوفی ۱۰ رجب ۱۳۲۰ھ) کا یہ درس ان کے مدرسہ واقعہ پھاٹک حبش خاں دہلی میں ساٹھ برس تک قائم رہا۔ اس میں ہندوستان اور بیرونی ممالک کے طالب علم شریک ہوتے تھے۔ ابتدا میں آپ تمام علوم پڑھاتے تھے مگر آخری زمانے میں صرف حدیث و تفسیر پر کاربند رہے (دیکھو مقالہ "ہندوستان میں اہل حدیث کی علمی خدمات" از مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی مطبوعہ علی گڑھ برقی پریس دہلی ۱۹۳۷ء۔ ص ۱۵)

[2] ارمغان احباب بواسطہ معارف اعظم گڑھ بابت جنوری ۱۹۲۹ء ص ۱۳

ارادہ کیا کہ اپنی کم فہمی اور قلت بضاعت کے باوجود اس کتاب کی شرح لکھوں۔ چنانچہ میں نے اللہ کا نام لے کر کام شروع کر دیا۔ اس کام کے دوران مجھے کئی مصائب اور شدائد پیش آئے۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور برابر اس نیک کام میں مشغول رہا، یہاں تک کہ اسے ختم کر کے ہی چھوڑا۔ فی الحال اس کتاب کا نصف حصہ شائع کیا جا رہا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ تفسیر مذکور کے مشکل حصوں کی تشریح اور مجمل حصوں کی توضیح اپنی ہمت اور علم کے مطابق کر دوں۔[1]

آخر میں یہ بھی لکھتے ہیں :- اس کتاب کی اشاعت میں نواب محمود علی خاں (ریاست چھتاری) نے میری گرانقدر مدد کی ہے۔ جسے میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔[2]" (ترجمہ)

(۳) فیضی (شرح حماسہ)

کتاب الحماسہ مختلف اصناف اور مختلف شعراء کے عربی اشعار کا مجموعہ ہے۔ جسے ابو تمام حبیب بن اوس المتوفی ۲۳۶ھ (۸۵۰ء) نے مرتب کیا تھا۔ ابو تمام خلیفہ مامون الرشید اور معتصم کے زمانے کا مشہور شاعر تھا۔ اس نے اپنے ذوق کے موافق مختلف شعراء کے اشعار جمع کر کے کتاب کی صورت دے دی ہے۔ مولانا فیض الحسن نے اس کی تشریح عربی میں لکھی ہے۔ خود فرماتے ہیں :-

"حماسہ ایک متداول اور کثرت سے پڑھی جانے والی کتاب ہے۔ لیکن اس کی اب تک کوئی ایسی شرح موجود نہ تھی جس سے مدارس کے طلبہ کو کما حقہٗ فائدہ پہنچ سکے۔ علامہ تبریزی نے ایک شرح لکھی ہے مگر وہ اس قدر ضخیم ہے کہ طالب علموں کو اس کے پڑھنے کی ہمت نہیں ہو سکتی۔ طلبہ کی اس اہم ضرورت کا احساس کرتے ہوئے میں نے ان کے لیے یہ شرح لکھی ہے۔ جس میں اشعار کے معنی بیان کئے ہیں۔ لغوی تشریح کی ہے۔ اشعار میں جہاں جہاں واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ان اسماء اور انساب پر بحث کی ہے۔ جن کے متعلق نہ تو مولف نے اور نہ کسی شارح نے کوئی تفصیل بیان کی ہے۔ ہر جگہ یہ بتا دیا ہے کہ جس شاعر کے شعر درج کئے گئے ہیں۔ وہ شاعر زمانۂ جاہلیت کا ہے یا زمانۂ اسلام کا۔ اس شرح کے لکھنے میں تبریزی، اغانی۔

---

[1] تعلیقات الجلالین ص ۲
[2] تعلیقات الجلالین ص ۳۰۷

ابن خلدون۔ کامل المبرد۔ الاصابہ۔ اسد الغابہ اور کئی دوسری کتابوں سے مدد لی گئی ہے[1]۔

"اس ضمن میں ایک حادثہ کا ذکر کر دینا (بھی) مناسب سمجھتا ہوں۔ جب میں نے یہ شرح مکمل کر لی۔ تو میرے ایک کافر نعمت شاگرد عبد الجبار ملکاپوری[2] نے چند روز کے لیے اس کا مسودہ مجھ سے مستعار لیا اور اسے نقل کر کے اور بعض جگہ خفیف سا تغیر و تبدل کر کے اپنے نام سے چھپوا دیا۔ خدا تعالے اسے اس کی سزا دے اور آخرت میں دوزخ اس کا مسکن بنائے[3]" (ترجمہ)

یہ ضخیم کتاب ہے اور $\frac{22 \times 29}{8}$ سائز کے آٹھ سو صفحوں پر مشتمل ہے۔ جنوری ۱۸۷۷ء ۱۲۹۴ھ میں نولکشور پریس نے شائع کی۔

(۴) تحفۂ صدیقیہ

اس کتاب میں اُم زرع کی مشہور حدیث کی شرح عربی زبان میں کی گئی ہے۔ اس کے متعلق مولانا فیض الحسن لکھتے ہیں:۔

"کافی عرصہ سے میرے دل میں اس بات کی خواہش پیدا ہو رہی تھی کہ میں اُم زرع کی مشہور و معروف حدیث کی تشریح و توضیح کروں۔ لیکن فرصت نہ ملنے کی وجہ سے یہ کام نہ ہو سکا۔ اسی اثنا میں بیمار ہو گیا اور بیماری نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ موت ہر وقت میرے سامنے گردش کرنے لگی۔ یہ دیکھ کر میں نے نذر مانی کہ اگر میں بیماری سے شفایاب ہو گیا تو اس کام کو ضرور کروں گا۔ خدا تعالے نے فضل کیا بیماری جاتی رہی۔ میں باقی رہ گیا۔ لیکن اس کے باوجود میں یہ کام شروع نہ کر سکا۔ ارادہ ہی کرتا رہا کہ اب شروع کرتا ہوں اور اب ضرور شروع کروں گا۔ آخر نواب صدیق حسن[4] صاحب (رئیس بھوپال) نے خود اپنی زبان مبارک سے مجھے اس کا ارشاد

---

[1] بایں ہمہ جو قبولیت مولانا اعزاز علی دیوبندی کی شرح حماسہ کو حاصل ہوئی وہ مولانا فیض الحسن کی کتاب کو نصیب نہ ہو سکی۔ (قریشی)

[2] ملکاپور ضلع بلڈانہ میں واقع ہے۔ دیکھو پوسٹل گائڈ و جامع اللغات جلد چہارم۔

[3] فیضی (شرح حماسہ) ص ۲-۳

[4] نواب صدیق حسن بن نواب سید اولاد حسن قنوجی ۱۹ جمادی الاولی ۱۲۴۸ھ کو بانس بریلی میں (جہاں آپ کا ننھیال تھا) پیدا ہوئے۔ حسینی سید تھے۔ ۳۲ واسطوں سے سلسلہ نسب آنحضرت صلعم تک پہنچتا ہے۔ چند برس مختلف اساتذہ سے پڑھنے کے بعد ۱۲۶۹ھ میں دہلی آئے اور مفتی صدر الدین آزردہ کی خدمت میں ایک سال آٹھ ماہ حاضر رہ کر "جملہ کتب معقول رسمیہ از منطق و حکمت و از علم دین اکثر از بخاری و چیزے از تفسیر بیضاوی و معاملات ہدایہ و فقہ و اصول فقہ و عقائد و ادب" آپ سے اکتساب کئے۔ ۲۱ سال کی عمر میں (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

فرمایا اور میری ہمت بندھائی۔ ان کے ارشاد کے مطابق میں نے یہ کام شروع کیا اور خدا تعالیٰ کے فضل سے اختتام پذیر کر لیا۔"[1] (ترجمہ)

اُم زرع کی حدیث کا خلاصہ مطلب[2] یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں یہ کہانی کہنی شروع کی۔ فرمایا:۔

"ایک دن گیارہ سہیلیاں ایک جگہ بیٹھی تھیں۔ باہم طے پایا کہ ہر ایک اپنے اپنے شوہر کا حال بے کم و کاست سنائے۔ پہلی بولی۔ میرا شوہر اونٹ کا گوشت ہے، جو کسی پہاڑ پر رکھا ہو۔ نہ میدان ہے کہ وہاں تک کوئی پہنچ جائے اور نہ گوشت ہی اچھا ہے کہ اسے کوئی اٹھا لے جائے۔

دوسری نے کہا۔ میں اپنے شوہر کا حال نہیں بیان کروں گی۔ اگر بیان کروں تو اس قدر طویل ہے کہ ڈر ہے کچھ چھوڑ نہ جاؤں یا اندر باہر کا سب حال نہ کہہ دوں۔

تیسری نے کہا۔ میرا شوہر بڑا درشت مزاج ہے۔ بولوں تو طلاق پاؤں اور چپ رہوں تو یوں سمجھو کہ بیاہی ہوں نہ بن بیاہی۔

چوتھی بولی۔ میرا شوہر حجاز کی رات ہے، نہ گرم نہ سرد۔ نہ ڈر ہے نہ ملال

پانچویں نے کہا۔ میرا شوہر گھر آتا ہے تو چیتا بن جاتا ہے۔ باہر جاتا ہے تو شیر ہو جاتا ہے۔ جو وعدہ کرے اس میں پرسش کی حاجت نہیں۔

چھٹی نے کہا۔ میرا شوہر کھاتا ہے تو اکیلا سب چٹ کر جاتا ہے۔ پیتا ہے تو سب سڑپ جاتا ہے۔ لیٹتا ہے تو خود سب اوڑھ لیتا ہے۔ کبھی دریافت حال کے لیے اندر بات نہیں کرتا۔

ساتویں بولی۔ میرا شوہر بیوقوف اور نامرد ہے۔ کبھی سر پھوڑ دے۔ کبھی کچھ توڑ دے۔

(بقیہ حاشیہ) علوم متداولہ سے فارغ ہو کر ۳۰ روپیہ ماہانہ مشاہرہ پر بھوپال میں ملازم ہوئے اور حسن کارگزاری پر عہدۂ دبیر تک پہنچے جس کا سلسلہ صفر ۱۲۷۲ھ سے ۱۲ محرم ۱۲۷۳ھ تک رہا۔ ۱۲۷۵ھ میں چند ماہ ٹونک میں ملازمت کی مگر وہاں کی معاشرت پسند نہ آئی ۱۲ صفر ۱۲۷۶ھ کو پھر بھوپال پہنچے۔ اس مرتبہ ۷۵ روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ اقبال نے یاوری کی۔ پہلے مدارالمہام کی لڑکی سے شادی ہوئی۔ پھر نواب شاہجہان بیگم صاحبہ رئیسہ بھوپال نے (جو بیوہ ہو چکی تھیں) آپ کی قابلیت اور دیانت دیکھ کر شریک امور سلطنت بنانا پسند کیا اور آپ سے نکاح کر لیا۔ جب دستار فضیلت طرۂ شاہانہ سے مزین ہوئی تو بھوپال کی قسمت جاگ اٹھی اور آپ نے مسلمانوں کو دینی و دنیوی برکتوں سے مالا مال کر دیا۔ آپ نے مختلف علوم و فنون پر عربی۔ فارسی۔ اردو میں ۲۲۲ کتابیں لکھیں اور تمام کی تمام ہزارہا کی تعداد میں چھپوا کر مفت تقسیم فرمائیں۔ ۲۹ جمادی الاخری ۱۳۰۷ھ (۱۷ فروری ۱۸۹۰ء) کو انتقال کیا اور اپنے خاص قبرستان میں دفن کئے گئے۔ (مفصل حالات کے لیے دیکھو مآثر صدیقی و تراجم علمائے حدیث ہند ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء از مولانا ابو یحییٰ امام خاں نوشہروی صفحات ۲۷۷-۳۱۲ و قضا الادب من ذکر علماء النحو والادب۔ صفحات ۲۵۷-۲۵۸)

[1] تحفہ صدیقیہ۔ صفحہ ۳۰۲

[2] یہ خلاصہ سیرۃ عائشہؓ مصنفہ سید سلیمان ندوی سے اخذ کیا گیا ہے۔

آٹھویں نے کہا: میرا شوہر چھونے میں خرگوش (نرم وگداز) اور سونگھنے میں کُسم (ایک قسم کا پھول) ہے۔

نویں نے کہا: میرے شوہر کا بڑا امکان ہے (امیر ہے)۔ اس کی تلوار کا پرتلا لمبا ہے (بلند و بالا ہے) اس کا چولہا کبھی ٹھنڈا نہیں ہوتا۔ ان میں راکھ ہر وقت موجود رہتی ہے (فیاض ہے)

دسویں نے کہا: میرا شوہر مالک ہے اور تم مالک کو کیا سمجھیں۔ وہ ان سب سے بہتر ہے۔ اس کے اونٹوں کا بڑا گلہ ہے۔ وہ جو گھر ہی پڑے رہتے ہیں، چرنے نہیں جاتے (اس خیال سے کہ خدا جانے مہمان کس وقت آجائے اور ان کو ذبح کرنے کی ضرورت پڑے) باجے کی آواز سن لیں تو سمجھ جائیں کہ موت کا دن آگیا۔ (یعنی کوئی تقریب ہے۔ اس میں ذبح ہونا ہوگا)

گیارھویں نے اپنی بڑی طویل داستان شروع کی۔ کہا: میرے شوہر کا نام ابوزرع ہے۔ تم ابوزرع کو کیا سمجھیں؟ اس نے زیوروں سے میرے کان اور چربی سے میرے بازو بھر دیئے۔ مسرت سے میرا دل خوش کر دیا۔ بکری والوں کے گھرانے میں مجھے پایا۔ لیکن ہنہنانے والے گھوڑوں، بلبلانے والے اونٹوں، غلہ ملنے والے اور پھٹکنے والے مزدوروں میں لا کر مجھے رکھ دیا۔ بولتی ہوں تو کوئی برا نہیں کہتا۔ سوتی ہوں تو صبح کر دیتی ہوں۔ پیتی ہوں تو سب پی جاتی ہوں۔

اُم ابی زرع کیسی ہے؟ اس کے کپڑوں کی گٹھڑی بھاری اور اس کے رہنے کا گھر بڑا وسیع ہے۔

اور ابوزرع کا بیٹا، جانتی ہو وہ کیسا ہے؟ سوتا ہے تو شمشیر برہنہ معلوم ہوتا ہے۔ کھاتا ہے تو حلوان کا دست کھا جاتا ہے۔

ابوزرع کی بیٹی، اور ابوزرع کی بیٹی کیسی ہے؟ والدین کی فرمانبردار اور سوکن کے لیے رشک۔

ابوزرع کی لونڈی، ابوزرع کی لونڈی کیسی ہے؟ کبھی گھر کی کوئی بات باہر نہیں دہراتی۔ اناج فضول برباد نہیں کرتی۔ صفائی پسند ہے۔ گھر کو کوڑا کرکٹ سے نہیں بھرتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تحمل کے ساتھ دیر تک یہ کہانی سنتے رہے۔ پھر فرمایا۔ عائشہؓ! میں تمہارے لیے ویسا ہی ہوں جیسا ابوزرع اُم زرع کے لیے۔

یہ کتاب ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں مطبع خورشید عالم لاہور میں طبع ہوئی۔ ۲۰x۲۶/۸ سائز کے ۴۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۵) دیوانِ حسانؓ بن ثابت

حضرت حسانؓ بن ثابت انصاری عرب کے ایک مشہور شاعر تھے، جو ہجرت نبوی سے ساٹھ سال قبل (۵۶۲ء میں) یثرب میں پیدا ہوئے اور ۶۸۲ء/۶۴ھ میں ایک سو بیس سال کی عمر پا کر فوت ہوئے۔ وہ ابتدا میں ملوک و امراء کی شان میں قصیدے لکھ لکھ کر بڑے انعام اور صلے حاصل کیا کرتے تھے۔ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے، تو حضرت حسانؓ بھی مسلمان ہو گئے اور تمام بادشاہان دنیا کو چھوڑ کر صرف بارگاہ نبوت ہی کے ہو رہے۔ بقول ابو عبیدہؓ وہ ایام جاہلیت میں انصار کے شاعر تھے اور آغاز اسلام میں خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدح گو اور ثنا خواں۔ آپ کے کلام سے اسلام کی اشاعت میں بڑی مدد ملی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا کہ حسانؓ کے شعر اعدا کے لیے تیر سے زیادہ سخت

ہیں۔ پھر فرمایا کہ جب تک حسانؓ مدح رسولؐ میں لگا رہتا ہے روح القدس اس کی تائید کرتا ہے[1]

مولانا فیض الحسن نے حضرت حسانؓ کے مختصر حالات زندگی اور دیوان حسانؓ پر مفید حواشی عربی میں لکھے ہیں اور یہ محشی دیوان ۱۲۹۶ھ ۱۸۷۸ء میں ڈاکٹر لائٹنر بانیٔ بیت العلوم پنجاب کی فرمائش پر مطبع انجمن پنجاب میں چھپا۔ سائز ۲۲×۱۸/۸ اور حجم ۱۲۰ صفحات ہے۔

(۶) ریاض الفیض (شرح السبع المعلقات)

سبع معلقات عربی کے ان چوٹی کے سات قصیدوں کا مجموعہ ہے جو زمانۂ جاہلیت میں کہے گئے تھے اور خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں تھے۔ اس میں مندرجہ ذیل شاعروں کے قصیدے شامل ہیں :۔

(۱) امراءالقیس المتوفی سنہ ۵۴۰ء
(۲) طرفہ بن العبد المتوفی سنہ ۵۵۰ء
(۳) زہیر بن ابی سلمےٰ المتوفی سنہ ۶۳۰ء
(۴) لبید بن ربیعہ المتوفی سنہ ۶۷۵ء
(۵) عمرو بن کلثوم المتوفی سنہ ۵۷۰ء
(۶) عنترہ بن شداد المتوفی سنہ ۶۱۵ء
(۷) حارث حلزہ المتوفی سنہ ۵۸۰ء

کتاب ریاض الفیض میں ان قصائد کی شرح بیان کی گئی ہے۔ اس شرح کے متعلق مولانا فیض الحسن کتاب کے شروع میں لکھتے ہیں :۔

> "السبع المعلقات کا درجہ عربی ادب میں بہت بلند ہے۔ اب تک اس کی کوئی شرح منظر عام پر نہیں آئی تھی جو عربی زبان کے شائقوں کے لیے حرف آخر کا کام دے سکے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اس ضرورت کو پورا کروں اور ان قصائد کی ایسی شرح لکھوں جو شائقین ادب کے مفید مطلب ہو۔ اسی اثناء میں پنجاب یونیورسٹی کے مشہور فاضل رجسٹرار مسٹر جی ڈبلیو لائٹنر سے اس کے متعلق بات ہوئی۔ انھوں نے میری ہمت بندھائی اور پر زور اصرار کیا کہ میں معلقات کی شرح ضرور لکھوں۔ چنانچہ ان کے تقاضے اور حوصلہ افزائی کے نتیجے میں یہ کتاب منصۂ شہود پر آئی"[2] (ترجمہ)

---

[1] مفصل حالات کے لیے دیکھو اصابہ جلد ا تذکرہ حسانؓ بن ثابت و تاریخ المشاہیر از قاضی محمد سلیمان منصور پوری صفحہ ۲۰۷ - ۲۱۰ اور روضۃ الادبا از مولوی محمد دین صفحہ ۵۳ +

[2] ریاض الفیض صفحہ ۱ - ۲

مولانا فیض الحسن نے اس شرح میں مندرجہ ذیل امور کا التزام کیا ہے :۔

(الف) ہر قصیدے کی ابتدا میں صاحب قصیدہ کے مختصر حالات بیان کئے ہیں تاکہ قارئین کو قصیدہ کے معانی و مطالب اور واقعات سمجھنے میں آسانی ہو۔

(ب) ہر شعر کی تشریح پہلے لغت کے اعتبار سے فرمائی ہے۔ پھر صرف و نحو کے طریقے سے اس کے اجزا کی جانچ پڑتال کی ہے۔ ساتھ ساتھ اشعار میں جو محاورات آئے ہیں ان پر بحث کی ہے اور جن واقعات کا ان میں ذکر ہے ان کا پس منظر بیان کیا ہے۔

(ج) اس کے بعد فارسی اور ہندی (اردو) میں شعر کا ترجمہ کر دیا ہے۔

اس لحاظ سے یہ کتاب عربی، فارسی، اردو تینوں زبانوں میں ہے۔

ذیل میں نمونہ کے طور پر صرف دو شعروں کا اردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ اس وقت کی اردو تحریر کا بھی اندازہ ہو سکے۔ امراء القیس کے قصیدہ کے پہلے دو شعر ہیں ؎

قِفَا نَبْکِ مِنْ ذِکْرَی حَبِیْبٍ وَّمَنْزِلِ
بِسِقْطِ اللِّوَی بَیْنَ الدَّخُوْلِ فَحَوْمَلِ

فَتُوْضِحَ فَالْمِقْرَاۃِ لَمْ یَعْفُ رَسْمُھَا
لِمَا نَسَجَتْھَا مِنْ جَنُوْبٍ وَّشَمْاَلِ

(ترجمہ) آؤ ہمیں یاد آگیا ٹھہر جاؤ کہ ہم ملکر رو دیں ایک دوست کے ذکر اور اس کی منزلوں کی یاد سے جو بیچ موضع دخول سے لے کر موضع حومل تک اور موضع توضح تک اور مقرات تک تھیں اور حال یہ ہے کہ نشان ان کے اور تربت دکھائی ہواؤں کی مار مار پر اب تک باقی ہیں۔[1]

مولانا ان قصائد کی شرح سے ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۸ھ مطابق ۲۵ اپریل ۱۸۸۱ء بروز اتوار فارغ ہوئے۔ یہ کتاب ۲۲×۱۸ سائز کے ۱۷۴ صفحوں میں چھپی ہوئی ہے اور مطبع انجمن پنجاب لاہور میں چھپی ہے۔[2]

کتاب کے آخر میں سولہ صفحوں کا غلط نامہ بھی ہے۔ کثرت اغلاط کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ مصنف (مولانا فیض الحسن) ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۱ء سے شدید بیماری میں مبتلا رہے۔ یہاں تک کہ زندوں میں ان کا شمار ہی نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ بعض اخباروں نے تو ان کے انتقال کی غلط خبر بھی اڑا دی تھی۔ ایسی بیماری کے ایام میں جن لوگوں کے سپرد کتاب کے مقابلہ کا کام کیا گیا وہ اس کے اہل نہ ہوئے۔ سنگ ساز نے بھی فرض شناسی کا ثبوت نہ دیا مگر اس کے سوا چارہ بھی کیا تھا۔[3]

چہ تواں کرد مرد ماں اینند

---

[1] ریاض الفیض ص ۶

[2] مولانا حامد حسن قادری نے اپنی کتاب "داستان تاریخ اردو" کے صفحہ ۶۵۹ پر اس کتاب کا نام "روضۃ الفیض" لکھا ہے جو غلط ہے۔

[3] ریاض الفیض ص ۵۶۱

(۷) حاشیہ دیوان النابغۃ الذبیانی

نابغہ ذبیانی دورِ جاہلیت کا مشہور و معروف شاعر ہے۔ اس کا شمار عرب کے صفِ اول کے شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ قبیلہ غطفان کی ایک شاخ بنو ذبیان سے تعلق رکھتا تھا۔ نام زیاد بن معاویہ بن ضباب تھا۔ لیکن وہ فن شعر میں حیرت انگیز دسترس رکھنے کی وجہ سے نابغہ (کمال کو پہنچا ہوا) کے لقب سے مشہور تھا۔ شعرائے عرب میں اس کو بلند ترین مرتبہ حاصل تھا اور اس کے پایہ کا دوسرا کوئی نہ تھا۔ عکاظ کے میلے میں اس کے لیے خاص طور پر ایک الگ خیمہ نصب کیا جاتا اور عرب کے سربرآوردہ شاعر اسے اپنا کلام سناتے جن میں اعشیٰ۔ حضرت حسانؓ بن ثابت اور بی بی خنساء خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

حیرہ میں آلِ منذر اور شام میں غسان دونوں سے اس کے تعلقات تھے۔ اس زمانے میں حیرہ کا بادشاہ نعمان بن منذر اور غسانیوں کا عمرو بن حارث الغسانی تھا۔ نابغہ نے ان دونوں بادشاہوں اور ان کے خاندانوں کی تعریف و توصیف اور مدح و ستائش میں بڑے لمبے چوڑے قصیدے کہے ہیں، جو اس دیوان میں موجود ہیں۔

مولانا فیض الحسن نے اس دیوان کا حاشیہ لکھا تھا جو حاشیہ نابغہ ذبیانی کے نام سے مشہور تھا۔ مگر ان کی یہ کتاب کہیں نظر سے نہیں گزری۔ اس لیے اس کے بارے میں کسی قسم کی رائے کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اصل دیوان مطبع الہلال مصر سے شائع ہو چکا ہے۔

(۸) فیض القاموس

یہ ۵۶ صفحات کی کتاب مطبع انجمن پنجاب، لاہور میں باہتمام منشی نظام الدین ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۱ء میں طبع ہوئی تھی۔ اس کے شروع میں مولانا نے لکھا ہے:۔

> "خطبۂ قاموس کا شمار بہت ہی مشکل خطبات میں ہوتا ہے۔ مجھ سے پہلے جن اصحاب نے اس کی شرحیں لکھیں کسی طور بھی قارئین کے مفید مطلب نہ تھیں۔ انھوں نے ایندھن کی طرح بے ترتیبی سے مختلف باتیں جمع کر دی تھیں۔ یہ دیکھتے ہوئے میں نے اس کی ایک مفصل شرح لکھنے کا ارادہ کیا تاکہ اس کے ذریعے دنیا میں میرا نام عزت سے لیا جائے اور میں آخرت میں اجرِ عظیم کا مستحق ٹھہرایا جاؤں۔ میں نے اس شرح کے لکھنے میں نہ دن کا خیال کیا نہ رات کا۔ یہاں تک کہ کھانے پینے اور سونے کو اپنے اوپر حرام کر لیا۔ دراصل اس میں میں نے اپنی پوری قوت صرف کر دی ہے۔"
>
> (ترجمہ)

یہ کتاب عربی میں ہے۔

(۹) عروض المفتاح

یہ کتاب علم عروض کے متعلق ہے اور مولانا ابو یعقوب سکاکی کی لکھی ہوئی ہے۔ ابو یعقوب یوسف بن محمد سراج الدین خوارزمی سکاکی ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء میں پیدا ہوا۔ علم صرف و نحو۔ بدیع۔ بیان۔ معانی۔ اشتقاق۔ عروض۔ لغت۔ شعر۔ تسخیر جن۔ دعوت کواکب۔ طلسمات۔ سحر۔ سیمیا۔ خواص الارض۔ ابدان فلکی وغیرہ میں عالم متبحر تھا۔ اس نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ جن میں سب سے زیادہ شہرت مفتاح العلوم کو حاصل ہوئی جو اس نے بارہ علموں میں تصنیف کی۔ صاحب تلخیص نے اس کتاب کی تیسری قسم کو جو فن فصاحت و بلاغت میں ہے مختصر کر کے اس کا نام تلخیص رکھا اور تفتازانی نے اس کی دو شرحیں مطول اور مختصر تصنیف کیں۔ یہ دونوں کتابیں ہمیشہ درس و تدریس میں شامل رہی ہیں۔ سکاکی تین سال سلطان چغتائی خان بن چنگیز خان حاکم ماوراء النہر کی قید میں رہ کر ماہ رجب ۶۲۶ھ/۱۲۲۸ء میں فوت ہوا۔[1] "فیصلہ دف عمر" اور "مجموعہ اسرار" تاریخ وفات ہیں۔[2]

مولانا فیض الحسن نے عروض المفتاح میں بڑی محنت سے اصل عربی متن کی تصحیح کی ہے اور جگہ جگہ عربی زبان ہی میں کار آمد حواشی لکھے ہیں جن سے کتاب کے مطالب سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ محشی نسخہ آپ نے اپنے شاگردان عزیز مولوی ظفر الدین محمد مولوی ناصر و قاضی فاضل اور مولوی محمد امین مولوی فاضل و قاضی فاضل ساکنان گوجرانوالہ کی تحریک اور تقاضے سے تاریخ ۱۳۰۲ھ/۱۸۸۴ء میں مطبع گلزار محمدی لاہور سے طبع کرایا۔ کتاب ۸/۲۲×۲۹ سائز کے ۴۰ صفحات کی ہے۔

(۱۰) دیوان الفیض

یہ مولانا فیض الحسن کے عربی کلام کا مجموعہ ہے۔ جو ان کے شاگرد رشید مولانا حمید الدین فراہی نے ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں مطبع اختر دکن حیدرآباد دکن سے چھپوا کر شائع کیا۔ یہ ۸/۲۰×۲۶ سائز کے ۸۲ صفحات کا ہے۔ اس میں زیادہ تر حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نعتیہ قصائد ہیں۔ چند قصیدوں میں اپنے ذاتی اور اپنے متعلقین کے حالات کا ذکر ہے۔ اپنے دوستوں، مہربانوں اور مربیوں کی تعریف میں بھی کئی قصیدے لکھے ہیں۔ مثلاً نواب محمد صدیق خاں علوی۔ نواب کلب علی خاں والی رامپور۔ سلطان عبد المجید خاں والئے ترکی۔ نواب صدیق حسن خاں رئیس بھوپال۔ نواب شاہجہان بیگم رئیسہ بھوپال وغیرہ۔ بعض رشتہ داروں، دوستوں اور محسنوں کی وفات پر جو مرثیے آپ نے لکھے تھے وہ بھی اس میں موجود ہیں۔ مثلاً مولوی احمد علی محدث سہارنپوری[3]۔ مو

---

[1] روضۃ الادبا از مولوی محمد الدین مطبوعہ انجمن پنجاب لاہور ۱۸۷۹ء صفحہ ۲۱۶۔

[2] حدائق الحنفیہ از مولوی فقیر محمد صفحات ۲۴۸ - ۲۴۹۔

[3] مولانا احمد علی اپنے زمانے میں حدیث کے امام مانے جاتے تھے۔ اس وقت علمائے احناف میں آپ سے بڑھ کر علم حدیث کوئی عالم ہندوستان میں نہ تھا۔ انھوں نے مولانا وجیہ الدین صدیقی سہارنپوری اور مولانا شاہ عبد الحی بڈھانوی (تلمیذ شاہ عبد العزیز محدث دہلوی) سے حدیث پڑھنے کے بعد ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء میں مکہ مکرمہ جا کر مولانا شاہ محمد اسحاق دہلوی مہاجر سے دوبارہ پڑھی ا

(باقی اگلے صفحہ)

فضل حق خیرآبادی مولوی محمد قاسم[1] نانوتوی (دیوبند) - مولوی احمد حسن مرادآبادی - مولوی گل محمد - حکیم محمود حسن وغیرہ - کسی شہر میں مولانا فیض الحسن کچھ مدت مقیم رہے، لیکن اس کی آب و ہوا مزاج کو راس نہ آئی - اس شہر کی ہجو بھی درج کتاب ہے -

(۱۱) شرح تاریخ تیموری

یہ کتاب بھی مولانا فیض الحسن نے عربی زبان میں لکھی تھی - اصل کتاب کا نام عجائب المقدور فی نوائب (اخبار) تیمور ہے جو ابن عرب شاہ کی تصنیف ہے -

ابن عرب شاہ کا پورا نام ابوالعباس احمد بن محمد بن عبداللہ بن عرب شاہ تھا، جو دمشق کا رہنے والا تھا - وہ دو برس کا تھا جب تیمور نے شام فتح کیا اور اسے والدہ اور بھائیوں سمیت ۸۰۳ھ / ۱۴۰۰ء میں زبردستی سمرقند لے آیا، سمرقند ہی میں

(بقیہ حاشیہ) اجازت حاصل کی - دہلی میں اپنا مطبع احمدی قائم کیا اور حدیث کی قلمی کتابیں بڑی محنت سے چھاپ کر عام کیں - ۱۲۶۵ھ / ۱۸۴۸ء میں جامع ترمذی اور ۱۲۶۷ھ / ۱۸۵۰ء میں صحیح بخاری شائع کی - موخر الذکر کی تصحیح و تحشیہ میں پورے بیس برس صرف کئے - ۱۸۵۷ء کے غدر میں سب کچھ لٹ گیا - دو برس تک اپنے مکان میں بیٹھ کر درس دیتے رہے - پھر شیخ الٰہی بخش رئیس کیمپ میرٹھ کی خاطر سے کلکتہ جاکر کاروبار جاری کیا - وہاں بڑی صحت سے نو بجے تک بعد حافظ جمال الدین میں جاکر درس دیتے تھے - دس برس کے بعد وطن میں واپس آکر ہمہ تن درس میں مشغول ہوگئے - سیکڑوں علماء فیض یاب ہوئے - بقول صاحب حدائق الحنفیہ ایک رسالہ الدلیل القوی علی ترک القرأۃ للمقتدی بڑی تحقیق سے فارسی میں تصنیف فرمایا جس کا ترجمہ اردو میں بھی چھپا (صفحہ ۴۹۲) - ۷ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ (۱۸۷۹ء) کو سہارنپور میں بمرض فالج وفات پائی - "خزانۂ خوبی" آپ کی تاریخ وفات ہے (حیات شبلی از مولانا سید سلیمان ندوی صفحہ ۸۵ - ۸۶)

[1] مولانا محمد قاسم بن شیخ اسد علی شعبان ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء میں دیوبند سے ۱۲ کوس کے فاصلے پر بستی نانوتہ میں پیدا ہوئے - تاریخی نام آپ کا خورشید حسن تھا - گیارہ برس کی عمر میں دہلی جاکر شاہ عبدالغنی محدث دہلوی سے حدیث پڑھی اور حاجی امداد اللہ کے مرید ہوئے - چند دن اینگلو عربک سکول میں بھی پڑھتے رہے - پھر ترک تعلیم کرکے کچھ عرصہ تحشیہ و تصحیح میں مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی مدد کی - ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد مکہ معظمہ چلے گئے - ۱۲۷۷ھ میں حج سے واپس آکر میرٹھ میں منشی ممتاز علی کے پریس میں کام کیا - جب قصبہ دیوبند میں مدرسہ قائم ہوا تو وہاں چلے آئے اور اس کی سرپرستی کرکے اسے دارالعلوم کے درجہ تک پہنچایا - ۱۲۸۵ھ میں پھر حج کیا - عوام میں ان کی زیادہ شہرت مباحثوں اور مناظروں کی وجہ سے ہوئی جو عیسائی اور آریہ سماجیوں کے ساتھ ہوتے تھے - پچاس سال کی عمر سے پہلے ۴ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ / ۱۸۷۹ء کو جمعرات کے روز بمقام دیوبند وفات پا گئے - "بدر مباحث روشن نفس" آپ کی تاریخ وفات ہے - قوم کی علمی تاریخ میں ان کا مرتبہ بڑا بلند ہے اور دیوبند سے انتساب کی بنا پر ان کا نام ادب و احترام سے لیا جاتا ہے (مفصل حالات کے لیے دیکھیے سوانح عمری مولانا محمد قاسم مطبوعہ طبع قاسمی دیوبند رمضان المبارک ۱۳۵۱ھ / ۱۹۳۲ء، سوانح قاسمی از مولانا مناظر احسن گیلانی و کتاب موج کوثر از شیخ محمد اکرام ایم اے صفحات ۲۱۸ - ۲۱۹ حدائق الحنفیہ از مولوی فقیر محمد صفحات ۴۹۱ - ۴۹۳) -

اس نے تکمیل تعلیم کی اور عربی کے علاوہ فارسی اور ترکی میں کمال حاصل کیا۔ ابتدا میں اس نے سعد الدین وراوینی کی مشہور کتاب مرزبان نامہ کو عربی میں منتقل کیا، جو اس کی شہرت کا پہلا زینہ ثابت ہوا۔

ابن عرب شاہ نے دور دور کی سیاحت کی۔ خطا (تاتار چینی) خوارزم۔ دشت اور اشتر خان کی سیر کے بعد ادرنا میں قیام کا ارادہ کیا۔ چنانچہ سلطان محمد اول (عثمانی) کی ملازمت اختیار کی اور اس کا دبیر مقرر ہوا، مگر زیادہ عرصہ وہاں نہ رہا۔ ۸۲۵ھ/۱۴۲۱ء میں اپنے وطن مالوف دمشق واپس آیا اور سات برس تک وہاں رہا۔ اس کے بعد حج کیا۔ ۸۴۰ھ/۱۴۳۶ء میں قاہرہ میں مقیم ہوا۔ اور ۸۵۴ھ/۱۴۵۰ء میں فوت ہو گیا۔

تیمور کی سوانح عمری "عجائب المقدور فی نوائب تیمور" ابن عرب شاہ کی مشہور تصنیف ہے۔ اس میں اس نے تیمور کے خلاف معاندانہ تلخ بیانی سے کام لیا ہے۔ اس تاریخ کے ایک ایک ورق سے تیمور کے خلاف کھلم کھلا نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ "شرف الدین علی یزدی اور دیگر سیرت نگاروں کی مبالغہ آمیز خوشامد اور مدح سرائی کے خلاف یہ کتاب ایک واضح بغاوت ہے۔ جہاں ایرانی مورخ تیمور کو خدائی صفات کا پیکر بتلاتے ہیں اور بڑے تکلف سے اس کے قتل عام۔ لوٹ مار اور کلہ منار بنانے کے واقعات کو صفات جلالیہ یا قہریہ کہتے ہیں، وہاں ابن عرب شاہ ان کو خبث شیطانی کے نتائج سے تعبیر کرنے پر مائل ہے۔ یہ کتاب ۱۲۳۴ھ/۱۸۱۸ء میں کلکتہ سے شائع ہوئی تھی۔

ابن عرب شاہ کی ایک اور تصنیف فاکہۃ الخلفاء ہے جسے اس کی باقی تمام کتابوں سے بڑھ کر شہرت حاصل ہوئی۔ یہ بھی چھپ چکی ہے[1]

شرح تاریخ تیموری ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ اس کا ایک قلمی نسخہ مولانا فیض الحسن کے فرزند مولوی رشید احمد کے ہاتھ کا جامن رنگ سے لکھا ہوا ان کے فرزند مولوی نصر العزیز قریشی کے پاس سہارنپور میں موجود ہے۔ جس کے شروع میں مولانا فیض الحسن فرماتے ہیں:۔

"میں دیوان متنبی کی ایسی شرح لکھنی چاہتا تھا، جو معلمین اور متعلمین دونوں کے لیے یکساں طور پر مفید ہو، لیکن میرے محترم دوست قاضی ظفر الدین اور میرے فرزند رشید نے مجھ پر زور دیا کہ متنبی کی شرح لکھنے سے پہلے میں تاریخ تیموری کی شرح لکھوں کیونکہ وہ بھی دیوان متنبی اور مقامات حریری کی طرح متداول ہے۔ اگرچہ موخرالذکر دونوں کتابیں تاریخ تیموری سے زیادہ شہرت کی مالک ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی بہت زیادہ شرحیں لکھی جا چکی ہیں، مگر اب تک کسی شخص کی طرف سے تاریخ تیموری کے رموز و نکات اور اسرار کھولنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ ان کی یہ بات مجھے پسند آئی اور میں نے اللہ کا نام لے کر یہ کام شروع کر دیا۔"

---

[1] تاریخ ادبیات عربی از بروکلمین صفحات ۲۹ ... ۳۰

(۱۲) ضوء المشکوٰۃ

یہ حدیث کی مشہور کتاب "مشکوٰۃ المصابیح" کی شرح ہے، جو عربی زبان میں ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح شیخ ولی الدین بن محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزی نے مرتب کی تھی۔ وہ اس کتاب کی تالیف سے جمعہ کے روز آخر رمضان المبارک ۷۳۷ھ کو فارغ ہوئے۔ یہ کتاب تین سو ابواب پر مشتمل ہے اور امام بخاری۔ امام مسلم۔ امام مالک۔ امام شافعی۔ امام احمد بن حنبل۔ ترمذی۔ ابو داؤد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔ دارمی۔ دارقطنی اور بیہقی وغیرہ کی مستند کتب احادیث کا انتخاب ہے۔ اس کی بہت سی شرحیں مختلف وقتوں میں عربی۔ فارسی۔ اردو اور دیگر زبانوں میں لکھی جا چکی ہیں۔ مولانا فیض الحسن نے بھی اس کی نہایت عالمانہ شرح عربی زبان میں لکھی ہے، جس کا ذکر مولانا کے شاگرد مولوی محمد الدین مرحوم نے اپنی کتاب روضۃ الادبا میں کیا ہے[1]۔

ضوء المشکوٰۃ کی شرح لکھنے کا کام جلالین کی شرح اور اس کی تعلیقات سے فارغ ہونے کے بعد شروع کیا گیا تھا اور اس میں تمام حل طلب امور کی تشریح کرنے نیز اسماء اور انساب کی اچھی طرح چھان بین کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کتاب غیر مطبوعہ ہے۔ اس کا ایک مخطوطہ مولانا کے پوتے مولوی نصر العزیز قریشی کے پاس تھا۔ نیز یہ بھی موجود ہے۔ جس کے آخر میں روز جمعہ ۵ رجب ۱۲۷۲ھ مطابق ۱۶ مئی ۱۸۵۶ء لکھا ہے۔

(۱۳) خلاصہ کتاب ایلاقی

ایلاقی ایلاق سے منسوب ہے جو ترکستان کے اس علاقے کا نام تھا جو دریائے ایلاق کے جنوب میں دریائے سیحوں کے اس بڑے خم کے شمال میں واقع تھا جو اس دریا نے خجند کے قریب اختیار کیا تھا۔ اس علاقے کا صدر شہر تونکث تھا جس کا اب کوئی نام و نشان باقی نہیں[2]۔

شیخ الرئیس بو علی سینا کے شاگردوں میں سید ابو عبد اللہ محمد بن یوسف شرف الدین ایلاقی بہت بڑے طبیب گزرے ہیں[3]۔ انھوں نے استاد کی مشہور کتاب "قانون" کا خلاصہ اور الاسباب والعلامات[4] دو کتابیں یادگار چھوڑیں۔ مختصر کا ایک قلمی نسخہ مکتوبہ ۸۱۷ھ حیدر آباد دکن میں موجود ہے[5] اور دوسری کتاب کی شرح علامہ سمنانی نے معالجات ایلاقی کے نام

---

[1] روضۃ الادبا مطبوعہ ۱۸۷۹ء صفحہ ۱۴۸

[2] جغرافیہ خلافت مشرقی تصنیف جی لی اسٹرینج ترجمہ اردو محمد جمیل الرحمٰن مطبوعہ مطبع جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن ۱۳۴۹ھ (۱۹۱۲ء) صفحہ ۴۹۷۔

[3] تاریخ الاطبا از حکیم ڈاکٹر غلام جیلانی صفحہ ۳۱۹۔

[4] اس نام کی ایک کتاب علامہ نجیب الدین سمرقندی نے بھی لکھی تھی اور اس کی شرح علامہ نفیس کرمانی صاحب نفیسی نے کی تھی۔

[5] طب اسلامی صفحہ ۷۶ بحوالہ طب العرب مرتبہ ای۔ جی براؤن مترجمہ و تشریحات و تنقیدات از حکیم سید علی احمد نیر واسطی ۱۹۵۱ء ادارہ ثقافت اسلامی لاہور صفحہ ۳۰۷۔

سے کی تھی[۱]۔

کتاب الاوائل فی عربی میں علم طب کے متعلق بہت جامع و نافع اور مفید کتاب ہے۔ مولانا فیض الحسن نے اس کا خلاصہ عربی میں کیا ہے۔ جو ابھی تک شائع نہیں ہوا۔ اس غرض کے لیے مولانا نے کتاب سے چند ایسے اصول منتخب کئے جو عام فہم تھے جیسے مفردات جن کا استعمال ہمارے ملک میں کثرت سے ہوتا ہے اور ایسے مرکبات لیے جن کے اجزا سہل الحصول ہیں۔ اس طرح یہ خلاصہ مرتب کیا۔ کتاب کے آخر میں کوئی تاریخ وغیرہ درج نہیں۔

اس خلاصے کے ساتھ فل سکیپ سائز کے ڈیڑھ سو کے قریب صفحات کا ایک اور رسالہ ہے جو فارسی میں ہے۔ اس میں مفردات کی کتابوں سے چند ایسی دوائیں چھانٹ کر درج کی گئی ہیں جو اس ملک میں عام طور پر پائی جاتی اور استعمال ہوتی ہیں نیز ان کے خواص بیان کئے گئے ہیں، جو استادوں کی زبانی معلوم ہوئے۔ دہم شعبان ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء اس کتاب کے خاتمہ کی تاریخ ہے۔

نمونہ کے طور پر کتاب کی چند ابتدائی سطریں ذیل میں درج کی جاتی ہیں:-

"بادنجان دشتی ہندی بھٹ کٹیا گرم وخشک است۔ حماد بارش دافع اورام بلغمیہ سیاہ کنندۂ مو و خوردنش نافع سرفہ وضیق النفس وفساد بلغم وصفرا و تپ بلغمی و درد پہلو و عسر بول و تبلانِ (؟) مرو قاتل دیدان و دافع امراض زنان عقیمہ۔"

یہ رسالہ بھی ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔

(۴) قرابادین فیضی

مولانا فیض الحسن ابھی دہلی ہی میں تھے کہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ مولانا اپنی جان بچا کر دہلی سے نکلے۔ اس وقت آپ کے پاس کوئی اثاثہ نہ تھا طرح طرح کی سختیاں برداشت کرتے آخر کار اپنے وطن مالوف سہارنپور پہنچے۔ ان واقعات نے آپ کی طبیعت پر گہرا اثر ڈالا اور سفر کی صعوبتوں نے نڈھال کر دیا۔

سہارنپور پہنچ کر آپ نے تہیہ کیا کہ گوشہ نشین ہو جائیں اور کسی بات میں دخل نہ دیں چنانچہ دل شکستہ و خاطر خستہ چندے یونہی بسر اوقات کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد جب طبیعت کو سکون حاصل ہوا تو بعض بے تکلف دوستوں نے اصرار کیا کہ آپ اپنے مشاغل جاری فرمائیں اور خدمت خلق کی خاطر طب کا مشغلہ اختیار کر کے مطب جاری کریں۔ ان کے اصرار سے مجبور ہو کر آپ نے مطب جاری کیا۔ یہ کتاب اسی زمانے کی یادگار ہے۔

قرابادین فیضی میں آپ نے اپنے تجربات کا نچوڑ اور مجرب نیز بہدف نسخے یکجا کئے ہیں۔ یہ کتاب فارسی میں ہے اور ۱۷ ربیع الثانی ۱۲۷۸ھ/۱۸۶۱ء کو مکمل ہوئی[۲] مگر ابھی تک زیور طبع سے آراستہ نہیں ہوئی۔

---

[۱] اکسیر اعظم جلد اول از حکیم اعظم خاں مطبوعہ مطبع نظامی کانپور ۱۲۸۶ھ صفحہ ۵۔

[۲] دیباچہ قرابادین فیضی (قلمی)

(۱۵) نسیم فیض (دیوان فارسی)

مولانا فیض الحسن نے اپنے فارسی کلام کا مجموعہ بھی مرتب کیا تھا، جو نسیم فیض کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ یہ مولانا کے فرزند مولوی رشید احمد نے ماہ صفر ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) میں مطبع فیض عام لاہور سے چھپوایا تھا۔ ۲۰×۲۶/۸ سائز کے چوبیس صفحوں پر مشتمل ہے۔ کلام کا رنگ وہی ہے جو ایک ایرانی خوش گو کا ہوتا ہے۔ وہی بندش کی چستی، خیالات کی رنگینی، تراکیب کا تنوع، فقروں کا دروبست اور الفاظ کا ترنم تمام دیوان پر حاوی ہے۔ ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسے خیالات ادا کرتے تھے جو واقعی ان کے دل میں موجزن ہوتے تھے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو جسے غالب پیچیدہ بندشوں سے اس طرح بیان کرتا ہے ؎

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

مولانا کا قلم اس طرح واضح فرماتا ہے ؎

زاہد بریں مناز کہ دنیا گزاشتم — ایں ہمت من است کہ عقبیٰ گزاشتم

اقبال علیہ الرحمۃ نے شاید اسی مضمون کو اس طرح لیا ہے[1] ؎

زاہد کمال ترک سے ملتی ہے یاں مراد
دنیا جو چھوڑ دی ہے تو عقبیٰ بھی چھوڑ دے

مولانا کی اس غزل کے چند شعر اور ملاحظہ فرمائیے ؎

امشب کہ دامن بت رعنا گرفتم — بال ہما و شہپر عنقا گزاشتم
چوں پائے خود بدامن راحت نمی کشم — آسودگی بہ نقش کف پا گزاشتم
شرم آمدم کہ شکوۂ درد جگر کنم — دست طبیب و پائے مسیحا گزاشتم
مطرب دگر مبا کہ سر چنگ و نے نماند — ساقی برو کہ ساغر و مینا گزاشتم
کارم خراب بود کہ می کردم آرزو — خود رام شد دمے کہ تمنا گزاشتم
جز یک گلیم کہنہ دگر بر سرم نبود — واں ہم بحکم ہمت والا گزاشتم

ایں است فیض صحبت پیر مغاں کہ باز
زہد و صلاح و توبہ و تقویٰ گزاشتم

حضرت آغا شاعر قزلباش دہلوی کا ایک مشہور شعر ہے ؎

جب مرے ہونٹوں سے لعل شکریں چھوٹے ہوئے — لفظ جو دشنام کے نکلے وہ سب ٹوٹے ہوئے

---

[1] حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں مندرجہ مجلہ اقبال لاہور نومبر ۱۹۵۴ء صفحہ ۴۳۔

اس سنّتے چلتے مولانا فیض احسن کے بھی چند شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

دشنام تلخ یار بود چون شکر لذیذ　　لیکن که شہد ہم نبود آں قدر لذیذ
بے حسن غور و فکر نباشد سخن لطیف　　بے چاشنی نام نگردد ثمر لذیذ
جائے که دشمنی است بود نوش ہم چو نیش　　وانجا که دوستی است بود تلخ تر لذیذ
در زعم آنکه ہمچو من این چاشنی چشید　　جز حرف تلخ دوست نباشد دگر لذیذ

پھر ایک غزل کے یہ شعر ملاحظہ فرمائیے ۔

در شعلهٔ عشق دریں خانه سوختیم　　گاہے چو شمع و گاه چو پروانه سوختیم
ما خانه یگانه و بیگانه سوختیم　　یعنی که خانقاه و صنم خانه سوختیم
صاحب بہار ه ایست که تا لم نمی شود　　از اضطراب این دل دیوانه سوختیم
چون گل دریں بہار شگفتیم چند روز　　آخر بسان سبزهٔ بیگانه سوختیم

اے فیض ضبط آه شرر بار تا بہ کے
آہے کشیده ایم که ویرانه سوختیم

ایک اور غزل کے چند شعر یہ ہیں ۔ یہ غزل لاہور کے مشاعروں میں پڑھی جانے کے بعد رسالہ گلدستہ سخن[1] میں بھی شائع ہوئی تھی ۔ مگر نسیم فیض کی ترتیب کے وقت نظر ثانی سے اس میں بہت کچھ ترمیم ہو چکی ہے ۔

خوشا دمے که دلارام محض رام تو بود　　عدو بحکم تو بود و فلک بکام تو بود
سرت بسجدهٔ ختم بود تا نماز سحر　　شبے که پیر خرابا تیاں امام تو بود
تو مبتلائے شب تار غم بایں شدهٔ　　که ہر شب آں مہ تاباں چراغ شام تو بود
ہمه نظاره ہمه نو بچرخ می دیدند　　مگر نگاهِ من آنگاه سوئے بام تو بود
دمے که سرو روانِ تو در خرام آمد　　ندرو نیز تماشائے خرام تو بود
شبے که ماه وشاں ہمچو خوشهٔ پروین　　ہم شدند مقام شرف مقام تو بود
دمے که حسن خدا داد منقسم می شد　　تمام دولت خوبی نصیب نام تو بود
چه نو ازادهٔ چه عمل کرده سپہر ساختهٔ　　که آں غزال حرم شب شکار دام تو بود
عروج نشهٔ وحدت ترا بجائے برد　　که صاف ساغر منصور درد جام تو بود

برو بکار خود اے فیض کاین کشود امروز
که پختگی ہوا بت خیال خام تو بود

---

[1] رسالہ گلدستہ سخن نمبر ۲ بابت ماہ جون ۱۸۸۶ء صفحہ ۲۰ و نسیم فیض صفحہ ۱۴-۱۴۱ ۔

فارسی میں مولانا فیض الحسن کا ایک مختصر سا قصیدہ بھی ملا ہے، جو نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال کی شان میں ہے۔ یہ قصیدہ مولانا کے مطبوعہ مجموعہ کلام "نسیم فیض" میں شامل نہیں۔ البتہ نواب صدیق حسن خاں رئیس بھوپال کی کتاب "حجج الکرامہ فی آثار القیامہ"[1] کے آخر میں شائع ہوا ہے۔ عنوان میں مولانا کا ذکر یوں کیا گیا ہے:-

"نتیجۂ خاطر ارجمند و فکر آسمان پیوند، فاضل بلند پایہ، عالم گراں مایہ، ادیب فرید این زمن مولوی فیض الحسن سہارنپوری سلمہم اللہ تعالےٰ"

اس کے تیس شعر ہیں، ان میں چند حسب ذیل ہیں ؎

منم کہ میکشم از بخت و از گردوں فریاد   کہ در حضیض خودم با عروج استعداد
درین امید شبابم تمام شد کہ ششے   بچشم خود نگرم چہرۂ حصول مراد
در اشتیاق حصول مراد جاں دادم   چنانکہ در غم شیریں بہ بیستوں فرہاد
بکام خود نتوانم بکام خویش رسید   خدا کند کہ کسے خیزد از پئے امداد
کہ خیزد از پئے امداد چوں من بدبخت   جز آنکہ در کنف اوست دین و دولت داد
جناب شاہجہاں بیگم آں کہ ہمت او   ہزار دولت قاروں فسردہ دہد برباد
بسعی ہمت او مدعا مراد حصول   بصرف دولت او بے قدر حصول مراد
کسے نماند کہ مقصود او نشد حاصل   مگر کسے کہ چو من دور و بے نصیب افتاد
ہر آنچہ بود در امکاں ہمہ بفضل آمد   بداد دانش و دنیا و دین و حسن نہاد
اساس دولت او بر زمین انصاف است   جہاں بجنبد اگر جنبد این چنین بنیاد

تبر ناب دست کہ دست ستم دراز کند   زباں بہ لرزہ فتد از تلفظ بیداد

کرا مجال کہ سوئیش نظر کند بے باک   کرا دماغ کہ بپیشش بدم کشد آزاد
حجاب عفت او مانع وصول نظر   شکوہ ملکت او میل دیدۂ حساد
بحکم عصمت او کو مناط عفت اوست   بہ بزم او نتواں غنچہ لب بخندہ کشاد
ثنائے او نتوانم جز ایں دعا چہ کنم   کہ تا سکون اراضی و دور سبع شداد

بہار دولت او باد قائم و دائم
بحق سید کونین و آلہ الامجاد

---

[1] حجج الکرامہ فی آثار القیامہ از نواب محمد صدیق حسن خاں مطبوعہ مطبع شاہجہانی بھوپال ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء صفحہ ۵۰۲۔

(۱۶) مثنوی روضۂ فیض ، (۱۷) مثنوی چشمۂ فیض

یہ دونوں مثنویاں فارسی میں ہیں اور یکم مئی ۱۹۰۳ء؍۱۳۲۱ھ کو مطبع نور احمدی لاہور سے اکٹھی شائع ہوئی ہیں۔ کتاب ۲۰×۲۶؍۸ سائز کے ۸۰ صفحات کی ہے۔ مثنوی روضۂ فیض متن میں اور چشمۂ فیض حاشیہ میں ہے۔ روضۂ فیض کی ابتدا اس شعر سے ہوتی ہے ؎

اے کہ من مرغ ثنا خوانِ توام
طوطیٔ شاخ گلستانِ توام

حمد کے بعد نعت اور مولوی فضل حق خیر آبادی کی مدح ہے۔ پھر اصل داستان ان اشعار سے شروع ہوتی ہے ؎

ہر کہ سرمایۂ ہستی دارد — نشۂ حسن پرستی دارد
رام پور بہ کہ بود منزل او — کار بہ چیں شہر بود قابل او
طرفہ شہرے کہ بہشت آباد است — کشت حسن است کہ در فریاد است

اور خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے ؎

بقربی کہ قریب تو بود — بہ حبیبی کہ حبیب تو بود
بغریبی کہ براہ تو شتافت — خفۂ توفیق رفیق خود ساخت
فیض را فائز کامش گرداں — بخت فیروز غلامش گرداں

مثنوی چشمۂ فیض کے ابتدائی دو شعر یہ ہیں ؎

بنامِ آں کہ رقص بسمل او — زمیں گرد انداز پہلو بہ پہلو
بفرمائش طپشہائے نو اندازہ — نیاز کشتگان خنجر ناز

اور خاتمہ اس دعا پر ہے ؎

الٰہی حسرت دردِ تو دارم — بہ سوز محبت در کنارم
منم مشتاق عشق آتش افروز — ہمہ در بند سودائے خرد سوز
ندارم آرزوئے گلشن و باغ — ندارم جز تمنائے گل داغ
دماغ لالہ و نسریں ندارم — سر آں دو ہوائے ایں ندارم
الٰہی آتشے خواہم کہ بلخت — چو خار خشک سوزد خانہ در خست

نمی خواہم کہ بر بستر نشینم
مگر روزے بہ خاکستر نشینم

مولانا کی دو فارسی مثنویوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ سید زاہد حسین صاحب زاہد سہارنپوری کے کتب خانے میں قلمی موجود تھیں جو ہنوز طبع ہو کر منظر عام پر نہیں آئیں۔ معلوم نہیں وہ کونسی مثنویاں ہیں۔

(۱۸) مثنوی صبح عید

یہ مثنوی جو ۲۶×۲۰/۸ سائز کے ۴۶ صفحات کی ہے۔ مولانا نے اپنے زمانۂ شباب میں سہارنپور کی مشہور گانے والی طوائف عیدن کے نام پر لکھی تھی۔ اس کا مطلع بعض تذکرہ نگاروں نے یہ لکھا ہے ؎

بنام آں کہ رقصِ بسمل اُو

زمیں گرداند از پہلو بہ پہلو

ـــــــ حالانکہ یہ مولانا کی فارسی مثنوی چشمۂ فیض کا مطلع ہے۔ مثنوی صبح عید مولانا نے دہلی کی ایک مجلس میں سنائی تھی اور بہت پسند کی گئی تھی۔ بعد میں انجمن اخوان الصفا لاہور کی طرف سے حافظ محمد دین تمیم لاہوری نے مطبع گلزار محمدی میں چھپوا کر ۱۲۹۹ھ/۱۸۸۲ء میں لاہور سے شائع کی تھی۔ قاضی فضل حسین صاحب قاضی نے اس کا قطعۂ تاریخ یوں کہا ہے[1] ؎

مثنوی چھپ کے جو آئی تو کسی نے یہ کہا   یہ ستم ہے کہ نہ ہو اس کی نرالی تاریخ

جونہی یہ کان میں پہنچی تو وہیں قاضی نے   مطلع نیّرِ فیض اس کی نکالی تاریخ

اس قطعۂ تاریخ کی روشنی میں مولانا حامد حسن قادری کا یہ بیان درست معلوم نہیں ہوتا کہ یہ مثنوی مولانا کی وفات کے بعد ۱۳۱۰ھ/۱۸۹۲ء میں لاہور میں چھپی[2]۔ دراصل یہ اس مثنوی کا دوسرا ایڈیشن تھا جو مطبع مجتبائی لاہور میں چھپا تھا۔

اس میں تقریباً ساڑھے گیارہ سو[3] شعر ہیں۔ ایک داستانِ عشق نظم کی ہے۔ قصہ کچھ نہیں لیکن نظم کے اکثر حصے لطیف ہیں۔ ذیل میں چند شعر پیش کئے جاتے ہیں۔ مثنوی تعریفِ عشق سے شروع ہوتی ہے ؎

عشق کیا اک بلا ہے آفت ہے   شور ہنگامۂ قیامت ہے

ننگ و ناموس کو تباہ کرے   زہد سالوس کو تباہ کرے

یہ کسی جی کو جینے جی نہ لگے   دوست کیا دشمنوں کو بھی نہ لگے

مختصر یہ کہ ہے یہ وہ چوکھٹ   گھر کے گھر ہو گئے جہاں چوپٹ

عشق عاشق ہے اپنی جانوں کا   اس کو کیا درد پائمالوں کا

درد ہے پردا ہے دردوں کی   عشق علت ہے نیم مردوں کی

دیکھ کر عشق کے نئے دھندے   جی جلاتے ہیں چین کے بندے

عشق ہے اک بلائے شور انگیز   خانماں سوز و خانہ برہم ریز

---

[1] مثنوی صبح عید صفحہ ٦٢

[2] داستان تاریخ اردو صفحہ ٦٦٠

[3] مولانا حامد حسن قادری نے اس مثنوی کے چھ سو شعر بتلائے ہیں جو صحیح نہیں۔ دیکھو داستان تاریخ اردو صفحہ ٦٦٠۔

اس کا مصداق ہے یہ افسانہ　　جس کا سامع ہو سُن کے دیوانہ
گرم ہوں شورشوں کے ہنگامے　　چاک ہوں جیب کی طرح جامے
کیوں نہ ہو یہ مری زبانی ہے　　گو یہ خود ہی غضب کہانی ہے
میں ہوں اک سینہ ریش خستہ دروں　　سر بسر جوشِ عشق و شورِ جنوں
درد یاں اوڑھنا بچھونا ہے　　گریہ یاں قسمتوں کا رونا ہے
دل یہاں درد کا ٹھکانا ہے　　سینہ یاں نشتروں کا خانہ ہے
یاں زباں ہے زبانۂ آتش　　حرف رنگیں ہے شعلۂ سرکش

ہیں یہ سب درد کی کرامتیں
ورنہ کس کو نصیب یہ باتیں

داستان کے چند شعر یہ ہیں ؎

یہی دو چار رہ گئے باقی　　شیشہ شہر نہ جام مطرب و ساقی
کہ یکایک بتانِ گل رخسار　　آ گئے سامنے سے مثلِ بہار
ہو گیا حسنِ تازہ خوش ظہور　　بام و در سے لگا برسنے نور
روشنی سے ہوئی نظر خیرہ　　نور سے ہو گیا مکاں تیرہ
ہاں تو جیسے نشانے دامن گل　　واں گلوں کی دہنیا نہ ہوائی تواں
گورے گورے وہ پھول سے چہرے　　پھول کانوں کے پھولوں کے سہرے
ایک تو سب کے پھول سے بردوش　　اس پہ پھولوں کی بار تا بنِ گوش
بسکہ اپنی بہار پاتے تھے　　پھولے پھولے نہیں سماتے تھے
صبح نوروز تھی وہ رات نہ تھی　　عید تھی خود شب برات نہ تھی
الغرض وہ بتانِ گل رخسار　　کھل کے بیٹھے تھے جمع یکبار
ان میں تو چلبلی تھی اک بلا کی بھری　　سر سے لے پاؤں تک ادا سے بھری
حسن گویا صنعتِ آفاق　　ناز گویا محضِ غارتِ عشاق
پورے سانچوں ڈھلے ہوئے اعضا　　سچے کانٹوں تلا ہوا نقشا
حسنِ ذاتی تھا ذات میں اسکی　　بانک تھی بات بات میں اسکی
ان کمالوں پہ خوب گاتی تھی　　گانے والوں میں نام پاتی تھی
ایک توڑا لگا دیا اُس نے　　تا کعبہ جلا دیا اُس نے

۱؎ بڑی عبدن

صبر تاراج اضطراب ہوا　　　　الغرض کام سب خراب ہوا
خفیہ خفیہ ہوئیں ملاقاتیں　　　　آنکھوں آنکھوں میں ہو گئیں باتیں
یہ ہوا اس کا وہ ہوئی اس کی
کون مرتے تھے بن پڑی کس کی

(۱۹) فیضیہ

یہ ۱۸×۲۲/۸ سائز کے ۴۲ صفحوں کا چھوٹا سا رسالہ ہے، جس میں فن مناظرہ پر بحث کی گئی ہے۔ ایک زمانے میں مولوی فاضل کے امیدواروں سے سالانہ امتحانات میں اس فن کے متعلق سوالات پوچھے جاتے تھے۔ لیکن طالب علموں کو جواب دینے میں بہت دشواری پیش آتی تھی۔ اس لیے ڈاکٹر لائٹنر کے ایما پر مولانا فیض الحسن نے یہ رسالہ تالیف کیا، جو ماہ سنہ ۱۲۹۹ھ / ۱۸۸۲ء میں مطبع انجمن پنجاب لاہور میں طبع ہوا۔[۱]

یہ رسالہ اردو میں ہے اور ایک مقدمہ، چند مطالب اور خاتمہ پر مشتمل ہے۔ مقدمے میں علم کی تعریف، موضوع، غایت، اقسام بحث اور اصطلاحوں کا بیان ہے اور خاتمے میں وہ باتیں لکھی ہیں، جو فریقین کو مناظرہ کے وقت پیش نظر رکھنی چاہئیں۔ کتاب کے شروع میں یہ کھلا اعتراف بھی موجود ہے کہ "میں اس فن سے بخوبی واقف نہیں ہوں۔ اگر خدانخواستہ کہیں بھول چوک ہو جائے تو معافی کا مستحق ہوں۔"[۲]

(۲۰) گلزارِ فیض

مولانا فیض الحسن کے اردو دیوان کا نام "گلزارِ فیض" تھا، مگر وہ دستیاب نہیں ہوا۔

اردو میں رنگِ تغزل

اردو میں مولانا فیض الحسن کا رنگِ تغزل اس قسم کا تھا ؎

ہنگامِ ذبح ہاتھ جو اس کا بہل گیا　　　　قسمت کی بات ہے کہ مرا وقت ٹل گیا
جوں توں کر اس کو راہ پہ لائے تو تھے مگر　　　　جونہی سُنی رقیب کی آہٹ مچل گیا
جی میں یہ تھی کہ خوب نکالیں گے من کے چاؤ　　　　پر وصل کی خوشی میں مرا دم نکل گیا

---

[۱] یہی رسالہ مولوی غلام مصطفےٰ نے اپنی کتاب "خلاصۃ الرشیدیہ تسہیل الشریفیہ" کے حاشیہ پر نقل کیا ہے، جو سنہ ۱۳۲۰ھ / ۱۹۰۲ء کی تصنیف ہے۔ اس پر لکھا ہے: "اس کتاب کے حاشیہ کو رسالہ فیضیہ سے زینت دی گئی ہے جسے ہمارے استاد اور فاضل اجل مولانا فیض الحسن نے عربی اور اردو طلبہ کی آسانی کے لیے مختلف کتابوں سے اخذ کر کے تصنیف کیا۔"

[۲] فیضیہ صفحہ ۲

ہیں وہ بلا بلا ہوں کہ کل میری نبض پر
انگلی دھری نہ تھی کہ رقیب آپ جل گیا

کشتہ کی تیرے صبح سے حالت بیاہ تھی
ڈھلتے ہی دن کے نیل بھی آنکھوں کا ڈھل گیا

پہچانتے مجھے نقش قدم کو مرے رقیب
آخر ہی بن آئی کہ آنکھوں کے بل گیا

کل میں نے بھی بزم میں پینے سے توبہ کی
اور یہ بھی میں ہی تھا کہ پھسل کر سنبھل گیا

تھی فیض کو جو پھول سے کھلنے کی آرزو
یاں تک گل اُس نے کھائے کہ پھولوں سے پھل گیا[1]

اس جفا پر بھی کی وفا ہم نے
کیا کیا تم نے کیا کیا ہم نے

کرتے ہیں زہر سے علاج فراق
خوب سوچی ہے یہ دوا ہم نے

چھیڑ کر ان کو بزم دشمن میں
جو نہ سننا تھا وہ سنا ہم نے

لیتے ہیں جو رہی غنیمت ہے
جب کیا شکوۂ جفا ہم نے

ملا جو خاک میں کوئی تو قبر یہ بولی
کہ اتنے روز رہے آپ اے جناب کہاں

کشتۂ ناز کی بالیں پہ مسیحا بیٹھے
جب وہ جیتا نہ اٹھا اٹھ کے الگ جا بیٹھے

مدتوں پہنچا تھا کسی ڈھب سے وہاں تک لیکن
بات کرنے بھی نہ پایا کہ رقیب آ بیٹھے

یہ تمنا ہے کہ دو بات کروں خلوت میں
پر کوئی وقت نہیں ہے کہ وہ تنہا بیٹھے

خاک لے کر ترے کوچہ سے اٹھیں گے عشاق
ہاں مگر جم کے بیٹھوں کوئی مجھ سا بیٹھے

پیسے والوں کی بڑی آؤ بھگت ہے ورنہ
کون پوچھے ہے غریبوں کو اٹھے یا بیٹھے

بت پرستی کے لیے ایک وہی کافی تھا
پھر صنم خانہ میں تم کس کے لیے آ بیٹھے

جب تک اس خاک کے پتلے میں ہوا باقی ہے
تب تک امکان نہیں ہے کہ بگولا بیٹھے

وہم اٹھتے ہیں مرے جی سے خدا خیر کرے
اب تک آئے وہ نہیں آج کہاں جا بیٹھے

کل میاں فیض سے کس بات پہ جھگڑا تھا کہ جو تم
قسم کھا کے اٹھے دیں وہ قسم کھا بیٹھے[2]

---

[1] ماخوذ از رسالہ گلدستۂ سخن مطبوعہ انجمن پنجاب لاہور بابت مارچ سنہ ۱۸۸۰ء۔
[2] رسالہ گلدستۂ سخن نمبر ۳ بابت ماہ فروری سنہ ۱۸۸۱ء صفحہ ۱۵

دو شعر مولوی عبدالغفور خاں نسّاخ نے تذکرہ سخن شعرا میں نقل کئے ہیں ؎

عجب کچھ طور تھا شب قیس کا کیا جانئے کیا تھا
کوئی وحشت سی وحشت تھی کوئی سودا سا سودا تھا

غنیمت ہے کہ بعد از مرگ عاشق اتنا کہتے ہیں
بُرا تھا یا بھلا تھا خیر جیسا تھا وہ اپنا تھا[1]

ابوالنصر سید علی حسن خاں[2] نے تذکرہ بزم سخن[3] میں مندرجہ بالا اشعار کے علاوہ ذیل کی رباعی بھی درج ہے ؎

سنتے ہیں وہ ہر کسی کی ایسی ویسی — کاش ان کی طبیعت ہی نہ ہوتی ایسی
چھیڑی دمِ صبح ہے تو گالی سرِ شام — اور بیچ کا فقرہ تیری ایسی تیسی

مولانا کے چند متفرق شعر اور بھی ملاحظہ فرمائیے ؎

رونے میں نہ تھا جو تری آنکھوں کا تصور — آئے گُلِ نرگس مرے دامن میں کہاں سے
کس نے لیا اس چاند سے رُخسار کا بوسہ — یہ داغ لگا رُخِ روشن میں کہاں سے

اڑتی تھی ابھی خاک گلستاں میں خدایا
اک بار یہ پھول آگئے گلشن میں کہاں سے

آگے بھی منتوں سے نہ تھی قدر و منزلت — پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی
قسمت کی بات ہے کوئی قسمت کو کیا کرے — پھولوں کی مار مار پہ دامن رہا تہی

ایک شعر کی داد

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ نہایت حسین و جمیل اشعار حسب موقع استعمال کرتے تھے اور کہیں پامال اور ادنیٰ اشعار نہیں لکھتے تھے۔ ۲۵ مارچ ۱۹۱۴ء کو مسلمان رہنماؤں کا ایک وفد لارڈ ہارڈنگ سے ملا تھا،

---

[1] تذکرہ سخن شعرا مطبوعہ نولکشور صفحہ ۳۷۵

[2] سید علی حسن خاں، نواب صدیق حسن کے فرزند تھے۔ ۲۴ ربیع الثانی ۱۲۸۲ھ کو پنج شنبہ کے روز پیدا ہوئے۔ والد کے فیض صحبت نے کتاب و سنت اور فنون دانش و حکمت کا ذوق آشنا بنایا۔ بہترین اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ شرافت نسب کے ساتھ علم و دولت دونوں کے جامع تھے۔ وہ عربی زبان کے عالم، فارسی کے ماہر اور اردو کے مشاق اہل قلم تھے۔ شعرائے اردو کا تذکرہ بزم سخن، مردم دیدہ، مقطرۃ السلام، مآثر صدیقی اور دیگر متعدد تاریخی اور مذہبی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ ۳ رمضان المبارک ۱۳۵۵ھ (مطابق ۱۹ نومبر ۱۹۳۶ء) کی صبح کو اپنی کوٹھی بھوپال ہوس لال باغ لکھنؤ میں بہتر برس کی عمر پاکر انتقال کیا (تراجم علمائے حدیث ہند صفحات ۲۱۲-۲۲۸ و رسالہ معارف اعظم گڈھ جلد ۳۸ نمبر ۶)

[3] تذکرہ بزم سخن صفحہ ۹۴

اس کی تفصیل بیان کرتے ہوئے مولانا یکم اپریل ۱۹۱۳ء کے الہلال میں مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے ایک شعر کی داد اس طرح دیتے ہیں[1]

"موقع پر کوئی اچھا شعر یاد آجائے تو بمقتضائے ذوق تحسین باز نہیں رہ سکتا۔
مولانا فیض الحسن مرحوم عربی کے ادیب تھے اردو کے شاعر نہ تھے تاہم کبھی کبھی
اچھے شعر بھی کہہ جاتے تھے۔ ایک اُن کا یہ معاملہ شعر مجھے نہیں بھولتا ؎
پہلے ہی اپنی کون سی تھی قدر و منزلت
پر شب کی منتوں نے ڈبو دی رہی سہی

نعتیہ قصائد

ان غزلوں کے علاوہ مولانا فیض الحسن کے نعتیہ قصائد بھی ملتے ہیں۔ مولوی کرامت علی خان شہیدی بریلوی کے مشہور قصیدہ کی زمین میں قافیہ بدل کر آپ نے ایک نعتیہ قصیدہ کہا ہے، جس کے چند شعر یہ ہیں ؎

ترا رتبہ ہے یا احمد مقام اللہ اکبر کا
ترا رتبہ شناسی رتبہ ہے بیچون داور کا

ترے مشعر بریں کے بام و در پہ فرط رفعت سے
نہیں جز سایۂ روح الامین سایہ کبوتر کا

وہ طوبیٰ جس کا پیچا ہے ستوں سے تیری مسجد کا
وہ جنت جس کی شہرت ہے وہ نقشہ ہے ترے گھر کا

ٹھکانا ہے ٹھکانوں کا سہارا بے سہاروں کو
تو ہے تکیہ غریبوں کا حجر دستہ ترے در کا

کوئی صورت نہیں اپنی کہ رہاں اک بھروسہ ہے
علیؓ کا فاطمہؓ کا آپ کا شبیرؓ و شبرؓ کا

کسی کو گر کسی کا آسرا ہو ہو، مبارک ہو
مجھے جو کچھ ہے وہ ہے آسرا اک آل حیدرؓ کا

تمنا ہے کہ اک اک بال کی سو سو بلائیں لوں
جو نقشہ باندھ جائے تری زلف معنبر کا

تمنا ہے کہ پہلو لوٹوں ترے صحرا کے کانٹوں پر
رگ مجنوں کو پھر سودا ہوا ہے نوک نشتر کا

ہمیں رونے سے کیا نسبت مگر جب تیرا نام آئے
تو کچھ نقشہ بندھا جاتا ہے اپنے دیدۂ تر کا

بُرا ہوں یا بھلا ہوں فیض جیسا ہوں تمہارا ہوں
طریقہ ہے کریموں کا نباہنا اپنے چاکر کا

یہ جوش بے قراری ہے کہ مرغ نیم بسمل بھی
یہ کہتا ہے چلو دیکھیں تماشا فیض مضطر کا[2]

اس نعت کے تاثر کے بارے میں مولوی نور احمد صاحب تذکرۂ نوکلیہ میں لکھتے ہیں کہ "ایک رات میں نماز عشا

---

[1] مضمون "الہلال کا مطالعہ" مطبوعہ معارف اعظم گڑھ بابت جون ۱۹۵۳ء شمارہ ۲ جلد ۱۸ صفحہ ۴۲۹

[2] بوستان نعت مرتبہ سیف کلانوری مطبع فیروز پرنٹنگ ورکس لاہور ۱۳۲۹ھ صفحہ ۲۴-۲۵

مولوی فیض الحسن مرحوم کی یہ نعتیہ غزل پڑھ رہا تھا۔ پڑھتے پڑھتے رقّت طاری ہوئی اور اسی حالت میں عالمِ غنودگی میں چلا گیا۔ دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نورانی شکل میں میرے سامنے کھڑے ہیں۔[1]

ایک دفعہ دلّی کی کسی صحبت میں ذکر ہوا کہ مولانا شہیدی نے نعتیہ قصیدے میں یہ قافیہ ایسا لکھا ہے کہ اب ہونا مشکل ہے ؎

ہمیشہ اس کے صاحبزادوں کا گہوارہ جنباں تھا
عجب ذی مرتبہ خادم تھا روح الامیں کو بھی خوشامد کا

مولانا فیض الحسن نے فرمایا۔ یہ قافیہ میں نے بھی نظم کیا ہے ؎

طوافِ کعبہ مشتاقِ زیارت کو بہانہ ہے
کوئی ڈھب چاہیے آخر رقیبوں کو خوشامد کا

تمام مجمع نے بے حد تعریف کی اور کہا۔ واقعی یہ شعر بھی بے مثل ہوا ہے۔[2] یہ سارا قصیدہ پڑھنے کے قابل ہے، جو حسبِ ذیل ہے اور مولوی شہیدی کے قصیدے سے کسی طرح کم نہیں ؎

کوئی چرچا سا چرچا تھا کسی کی آمد آمد کا
مگر اب سمجھے کہ وہ اک شور تھا تشریف احمدؐ کا

کوئی دو چار دن دم سے کے اقلیمِ عدم کی لی
کہ اس سلطان کے قابل تھا قلمرو ملک سرمد کا

حبیبِ خاصِ حق ہے باعثِ ایجادِ عالم ہے
وہ سب کچھ ہے نکالو کوئی ڈھنگ اس کی خوشامد کا

وہیں لب چاٹتی رہ جاتی ہے فرطِ حلاوت سے
زباں پر جب کبھی نام آتا ہے پیارے محمدؐ کا

جہاں عرشِ بریں کو فرش ہونے کی تمنا ہو
علوِ مرتبہ کیا پوچھنے ہو واں کی مسند کا

بساطِ ماہتاب اک چاندنی ہے اس کے کوٹھے کی
فلک ہے آسمانی شامیانہ اس کے مرقد کا

بجائے چوبِ زیرِ اس شامیانہ کے قد طوبیٰ
بجائے سنگِ فرش اس چاندنی پر درِ فرقد کا

بہ ہے اس کے سیے شایاں کہ وہ ہو فخرِ کل ورنہ
ہزاروں میں کہیں ہوتا ہے فخر اپنے اب و جد کا

وہاں وہ محرمِ علمِ لدنی درس فرماتا تھا
جہاں روح الامیں آموختہ پڑھتا تھا ابجد کا

اسے اس کے دفترِ عالی میں اک ادنیٰ محرر سے
کہاں تک رفتہ رفتہ مرتبہ پہنچا عطارد کا

یہ بحر اوج پا ہے جس کو جزر و مد سے کام رہتا ہے
پر اس دریا کو غیر از جزر دھیان آتا نہ تھا مد کا

کوئی حد اس کے رتبہ کی تصور میں نہیں آتی
ٹھکانا ہے مقامِ حیرت اس کی غایتِ حد کا

وہ قامت غیرتِ طوبیٰ وہ چہرہ رشکِ جنت
نہیں پیدا ہوا کوئی گل و سرو اس خد و قد کا

طواف اس کا نصیبِ جانِ مشتاقاں بھی ہو جاتا
فرشتے کو کوئی دم چھوٹتے گرد اس کی گنبد کا

حریمِ روضہ کو جو حرمتِ کعبہ ہوئی حاصل
تو اس کے سنگِ در نے پایہ پایا سنگِ اسود کا

---

[1] تذکرۂ نوکلیہ بواسطہ کتاب وجدانی نشتر مصنفہ منشی محمد الدین فوق مرحوم (قلمی)

[2] حسن خیال از مرزا رمزی الپوری صفحہ ۱۳۶

سوادِ ہند تک ساری سفید آنکھیں نظر آئیں
نہ ہوتا گر سوادِ چشم سایہ آپ کے قد کا

یہاں جسمِ مبارک جا بجا تدبیر فرما تھا
وہاں ملکِ عدم میں دخل تھا روحِ مجرد کا

کہاں یوسف کہاں وہ جانِ جاناں کوئی نسبت ہے
وہ اپنے باپ کا محبوب تھا اور یہ خود ایزد کا

گئے اپنے شبِ معراج امت کے لیے آخر
معافی کی سند لی کیا ٹھکانا اس جد و کد کا

مدینہ کے ارادے ہی کریں کیا جا کے کعبہ کو
نہیں اللہ کے گھر میں ٹھکانا اپنے مقصد کا

یہ عاصی صرف مشتاقِ مدینہ ہے نہیں اس کو
ہوس بغداد کی، حسرت نجف کی، شوق مشہد کا

طوافِ کعبہ مشتاقِ زیارت کو بہانہ ہے
کوئی ڈھب چاہیے آخر رقیبوں کو خوشامد کا

گئے کوچہ میں اس کے جانے والے پر گئے آئے
نرالا ہے کوئی ڈھنگ اس کے کوچہ کی شد آمد کا

بہشت جی جانتا ہے آپ کو اور کیوں نہ جی چاہے
محبت کوئی ترکہ ہے کسی کے جد امجد کا

یہ تاثیرِ محبت ہے کہ شعر اپنے نرالے ہیں
وگرنہ کوئی ہوتا ہے قصیدہ اس شد و مد کا

کوئی طاعت نہیں جز مدح گوئی وہ بھی مدت سے
یہی ساماں ہو شاید فائق کی عیشِ مخلد کا

مُرقّع دہلی

عہدِ محمد شاہ کی ایک تالیف

خلیق انجم

"مرقع دہلی" خانِ دوراں نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں سالار جنگ مؤتمن الدولہ مؤتمن الملک کی فارسی تالیف ہے۔ جو عہد محمد شاہ میں لکھی گئی۔ نواب صاحب نے ۱۱۵۱ھ سے ۱۱۵۴ھ تک کے وہ حالات و واقعات لکھے ہیں جو اس دور کی دہلی میں انھوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ اُن شخصیات کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ جنھوں نے نواب صاحب کو متاثر کیا تھا۔ اسی لیے اس میں برگزیدہ ہستیوں، شاعروں، فنکاروں، سے لے کر طوائفوں اور امردوں تک سب کی تصویریں ملتی ہیں۔ اس دور کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی حالات پر کام کرنے والے کے لیے یہ کتاب ناگزیر ہے۔ فارسی متن حکیم سید مظفر حسین نے مع مقدمے کے تاج پریس حیدرآباد دکن سے شائع کیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا ذبیح صاحب نے کیا۔ اور اس پر نظرِ ثانی حسن نظامی نے کی تھی۔ جو ۱۹۲۳ء میں محبوب المطابع برقی پریس دہلی میں شائع ہوا۔ یہ ترجمہ بالکل آزاد ہے۔ بلکہ اس حد تک آزاد ہے کہ اصل فارسی متن سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔

نواب صاحب[1] کے جدِ امجد کا نام خاندان قلی خاں تھا جو قندھار سے ہندوستان آئے تھے۔ روز شنبہ دہ جمادی ثانی ۱۰۴۸ھ کو شاہجہاں کے دربار میں حاضر ہوئے۔ خلعت اور ایک ہزار روپیہ نقد عطا ہوا۔ جب علی مردان خاں کو شاہجہاں نے کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا تو خاندان قلی خاں بھی اُن کے ساتھ کشمیر گئے۔ اور ساری زندگی وہیں گزاری۔ وفات کے بعد اُن کے لڑکے درگاہ قلی خاں اوّل کو شاہجہان نے ضلع پٹنہ میں جاگیر بخشی اور منصب سے نوازا۔ اس میں علی مردان خاں کی سفارش کو دخل تھا۔ جنھوں نے بعد میں درگاہ قلی خاں اوّل کو اپنے صوبہ کا میر سامان مقرر کیا۔ علی مردان خاں کی وفات کے بعد شہزادہ اورنگ زیب نے خان موصوف کو اپنے منصب داروں میں شریک کر لیا۔ اورنگ زیب کے ساتھ درگاہ قلی خاں دکن آئے۔ اور کچھ عرصہ یہاں رہ کر شمالی ہند واپس آگئے۔ اور یہیں وفات پائی۔ درگاہ قلی خاں کے بیٹے نورروز قلی خاں دھاروار کی قلعداری پر سرفراز کیے گئے۔ اور زندگی بھر اسی عہدے پر فائز رہے اور یہیں انتقال کیا۔ نورروز قلی خاں کے صاحبزادے خاندان قلی خاں ثانی کو مغل دربار سے جاگیر اور منصب عطا ہوا۔ اور اورنگ آباد میں اُن کا تقرر ہوا۔ خانِ دوراں نواب ذوالقدر درگاہ قلی خاں مولف "مرقع دہلی" انھیں کے لڑکے تھے۔ نواب صاحب ۲۹ رجب ۱۱۲۲ھ کو سنگمنیر (دکن) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی

---

[1] نواب صاحب کے خاندانی حالات اور سوانح "مرقع دہلی" کے مقدمے سے لیے گئے۔

تعلیم و تربیت اپنے والد سے پائی۔ اور پھر نظام الملک آصف جاہ کے زیر تعلیم رہے۔ چودہ سال کی عمر (۱۱۲۷ھ) میں نواب صاحب نے آبائی منصب اور جاگیر حاصل کی۔ اور نظام الملک نے مصاحبت میں رہنے کی اجازت دی۔ اور چھ سال بعد ہم رکاب رہنے کی عزت بخشی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد مرہٹے برابر طاقت حاصل کرتے جا رہے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ ۱۱۳۷ھ میں مرہٹہ سردار باجی راؤ دہلی میں داخل ہو گیا۔ اور مغل فوج کچھ نہ کر سکی۔ محمد شاہ نے ۱۱۵۱ھ میں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو کچلنے کے لیے دکن سے نظام الملک آصف جاہ کو بلایا۔ نظام الملک فوجیں لے کر دہلی کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت نواب درگاہ قلی خاں بھی ہمراہ تھے۔ بلکہ انھیں سوانح نویسی کے عہدے پر فائز کر دیا گیا تھا۔ نظام الملک پہلے دہلی آئے اور پھر ۱۱۵۱ھ (۱۷۳۸ء) میں مرہٹوں کی تادیب کے لیے روانہ ہو گئے۔ شاہی فوج کو شکست ہوئی اور ناکام لوٹنا پڑا۔ اسی زمانے میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کر دیا۔ نواب درگاہ قلی خاں اس وقت دہلی میں تھے۔ بلکہ آصف جاہ اور محمد شاہ کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے تمام واقعات سے بخوبی واقف تھے۔ تقریباً تین سال دہلی میں رہ کر نواب صاحب اپنے آقا نظام الملک کے ساتھ ۱۱۵۴ھ میں اپنے وطن واپس چلے گئے۔

یہ کتاب انھیں تین سال کے واقعات اور حالات پر مبنی ہے، دہلی تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ لیکن اب بھی پورے ہندوستان میں دہلی تہذیب و تمدن کا ایسا مینار تھی۔ جو پورے ہندوستان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ہندوستانی اور ولایت زادے ادیب، شاعر، عالم و فاضل اور دوسرے فنون کے ماہر دہلی کو اپنا مسکن بنائے ہوئے تھے۔ نواب صاحب کو دہلی سے بہت عقیدت اور محبت تھی انھوں نے اس برباد شہر کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے۔ وہ بہت ہمدردانہ ہیں۔ کہیں کہیں یہ تو محسوس ہوتا ہے کہ بے پناہ عقیدت کی وجہ سے ان کے لب و لہجہ میں مبالغہ کا رنگ آ گیا ہے۔ لیکن بظاہر اس کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ انھوں نے دروغ گوئی سے کام لیا ہو۔ یہ بات دوسری ہے کہ انھیں کہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ درگاہ قلی خاں نے مختصر سی کتاب میں اس سماج کے تمام گوشوں پر اس طرح روشنی ڈالی ہے۔ کہ اس دور کی پوری تصویر ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔ یہ کتاب مغل زوال کی مکمل تصویر ہے۔ اس میں سب سے اہم وہ عبرت ناک واقعات ہیں جو مزارات عرس اور اہل دہلی کی عیاشیوں سے متعلق ہیں۔ اس کتاب کے بارے میں کچھ کہنے سے مناسب ہے کہ اس دور کے سیاسی اور سماجی حالات کا مختصر سا جائزہ لے لیا جائے۔ نادر شاہ کے حملے اور اس کے اثرات پر تھوڑا روشنی ڈال دی جائے۔ کیونکہ مرقع دہلی اس دور کی یادگار ہے جب دہلی میں نادر شاہ نے قتل و غارت گری کی تھی۔

مغل زوال کی ابتدا خود اکبر کے عہد میں ہو چکی تھی۔ کیونکہ جس اقتصادی نظام پر حکومت کی بنیاد تھی۔ وہ ترقی کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اور اب اس نظام میں مزید ترقی کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لیے تنزل لازمی تھا۔ اکبر، جہانگیر اور شاہجہان اپنے تدبر، بصیرت، حکمت اور گہری سوجھ بوجھ سے اس زوال کے دریا پر بند لگائے ہوئے تھے۔ اورنگ زیب کے عہد میں زوال کے اثرات نمایاں ہونے شروع ہوئے۔ لیکن اورنگ زیب جیسے مدبر اور سیاست داں نے مخالف طاقتوں کو ابھرنے نہیں دیا۔ اس کی وفات کے بعد مغل تخت کو کوئی ایسا بادشاہ نصیب نہ ہوا جو مغل تخت اور تلوار کی آبرو بچا سکتا۔ اس لیے زوال پر لگتے گئے۔ بند اچانک ٹوٹ گئے اور بہتا مارتا ہوا ایسا سمندر بن گیا جس کی موجوں کی تیزی اور تندی سامنے آنے والی ہر قوت کو تنکے کی طرح بہائے لیے جا رہی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد کسانوں کی بغاوت اور بڑھ گئی۔ وراثت کے جھگڑے، بادشاہوں کی نااہلیت امرا و رؤسا کی سازشیں صوبہ داروں کی خود مختاریت، فوجی کمزوری، شاہی خزانے میں روپے کی کمی نے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیا۔ سید عبداللہ خاں

حسین علی خاں جیسے امرانے اتنا اقتدار حاصل کر لیا کہ عنانِ حکومت اُن کے ہاتھ آگئی۔ درباری سازشیں اتنی بڑھیں کہ کئی بادشاہوں کو اپنی متاعِ حیات قربان کرنی پڑی۔ اکثر صوبے خود مختار ہو گئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مالی اعتبار سے مرکزی حکومت کمزور ہو گئی۔ فوجوں کی تنخواہیں رُک گئیں اور خزانے میں فوجی اخراجات کے لیے روپیہ نہیں رہا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد سب سے اہم واقعہ نادر شاہ کا حملہ ہے جس نے حکومت کے خزانے خالی کر دیئے۔ عام لوگوں کو بھوکا اور ننگا کر دیا۔ چونکہ مرقع دہلی کا نادر شاہ کے حملے سے گہرا تعلق ہے۔ اس لیے اس حملہ کا مختصر جائزہ لینا ضروری ہے۔

۱۳ فروری ۱۷۳۹ء کو نادر شاہ اور مغل فوج میں جنگ ہوئی۔ دو گھنٹے میں جنگ کا فیصلہ ہو گیا۔ یعنی مغل فوج کو شکست ہوئی۔ درباری سازشوں نے ایسے خطرناک موقعہ پر بھی کام کیا۔ برہان الملک کے بہکانے سے نادر شاہ دہلی آگیا۔ دہلی پہنچ کر جو اُس نے قتل و غارت گری کی ہے وہ ایک ایسے مؤرخ کی زبانی سنئے جس نے یہ انسانیت سوز بہیمانہ مناظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ یہ واقعات ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں لکھے گئے افسوس کہ مولف کا نام معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ لکھتا ہے:

> "گھڑی دن باقی تھا۔ شہر کے لوگوں نے مشہور کر دیا کہ نادر شاہ کا انتقال ہو گیا تمام غارت گر اور حرامزادے جمع ہوئے۔ پندرہ تاریخ کو ہر طرف یورش کر دی بندوق اور دوسرے ہتھیاروں سے تمام رات قتل و غارت گری کی۔ ایرانی (نادر شاہ کے سپاہی) کوچوں اور گلیوں میں مارے مارے پھر رہے تھے اور امان مانگتے تھے۔ آخر صبح ہوئی۔ نادر شاہ کو یہ خبر پہنچی۔ غصہ اور غضب سے بھر گیا۔ نادر شاہ نے بیرون شہر سے اپنی فوجیں طلب کیں اور خود قلعہ سے باہر آگیا۔ چاندنی چوک میں مسجد روشن الدولہ میں بیٹھ گیا اور قتل عام اور اسیر اہلِ شہر کا حکم دے دیا۔ چنانچہ قزلباشوں نے شریفوں کے علاقوں پر حملہ کر دیا اور وہاں خونریزی کی .... ایک پاس تک یہی معرکہ خونریزی قائم رہا۔ چوک سعد اللہ خاں، چاندنی چوک، دریبہ گڑھ اور بیاشاہجہان آباد غارت و برباد ہو گئے اور شاہجہان آباد تو اس طرح برباد ہوا کہ دہلی دروازہ سے لے کر نخاس تک بالکل ویران ہو گیا۔ کوئی عمارت باقی نہیں رہی۔ معلوم ہوتا تھا برسوں سے یہاں آبادی ہی نہیں ..... پردہ نشین عورتوں نے ناموس کی خاطر کنوؤں میں چھلانگ لگادی اور بہت سی عورتیں مر گئیں۔[۵]"
>
> (فارسی سے ترجمہ)

ہیمنز ویرز کا بیان ہے کہ عزت و ناموس کی خاطر دس ہزار عورتوں نے کنوؤں میں چھلانگ لگا کر جان دی۔ کچھ عورتیں دو تین دن کے بعد زندہ نکالی گئیں۔ اس حملہ سے جو جانی نقصان ہوا وہ اتنا اہم نہیں جتنا مالی نقصان ہے۔ جس کی وجہ سے مغل حکومت کی شہ رگ سے خون رسنے لگا تھا۔ سر ہنری ٹارنس لکھتے ہیں:۔

---

۵ حقیقتِ برآمدنِ نادر شاہ بہ دہلی (قلمی)، رضا لائبریری رامپور

...... غرض یہ ہے کہ جب چند روز میں خزانے اور لوگوں کی ذاتی دولت اپنے قبضے میں لانے سے فرصت ملی تو (معلوم ہوا) کہ اتنے سونے چاندی کے برتن، جواہرات سے مرصع اسباب اور نفیس چیزیں حاصل ہوئی تھیں کہ منصب اور دفتر نویس ان کی فہرست بنانے بناتے عاجز آ گئے تھے۔ تخت طاؤس.... بھی اس میں شامل تھا..... دو کروڑ روپے کے جواہرات وغیرہ........ نادر شاہ کے خزانے میں منتقل ہو گئے۔ دارالخلافے امراء رؤسا اور مختلف علاقوں کے صوبہ داروں نے بھی کروڑوں اور لاکھوں روپے نقد، جواہر، مرصع آلات، نفیس سامان ہدیہ کے طور پر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا — سعادت خاں کی وفات کے بعد صوبہ اودھ لکھنؤ محصل بھیجے گئے، ایک کروڑ روپیہ.. .... ہاتھی اور بے انتہا سامان سعادت خاں کے صوبے سے خزانہ عامرہ میں داخل ہوئے...... دہلی کے دوران قیام میں اس سلطنت کے خزانوں، امراء رؤسا اور دور نزدیک کے صوبہ داروں سے پندرہ کروڑ روپیہ نادر شاہ کے خزانے میں آیا۔[1]

(فارسی سے ترجمہ)

فریزر کا بیان ہے کہ نقد جواہر ظروف و لباس اور دیگر اشیاء ستر کروڑ روپے کی تھیں۔ اس کے علاوہ نادر شاہ اپنے ساتھ ایک ہزار ہاتھی، سات ہزار گھوڑے، دس ہزار اونٹ، ایک سو تیس ادیب و شاعر، دو سو معمار، تین سو سنگتراش اور دو سو بڑھئی لے گیا تھا۔[2] اس طرح ایشیا کی سب سے بڑی دولت مند حکومت کے خزانے بالکل خالی ہو گئے۔

کسی شخصی حکومت کے بدلنے کا عوام پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔ مغل حکومت میں زوال آ چکا تھا۔ لیکن ہندوستان کی کوئی اد

---

[1] تاریخ نادری ص/۲۵۵

[2] محمد شاہ کے بعد مغل خزانے کی حالت اور بھی ابتر ہو گئی۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ بقول شاکر خاں: —

"احمد شاہ کے زمانے میں محلات شاہی کے ساز و سامان کی فہرست بنا کر دکانداروں کو دے دی گئی تھی تاکہ اس کو فروخت کر کے سپاہیوں کی تنخواہیں ادا کر دی جائیں۔"

(تذکرہ شاکر خاں (قلمی) بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات) ص/۱۲

اور بقول صاحب تاریخ عالمگیر ثانی ——

فوجیوں نے افلاس سے تنگ آ کر گھوڑے بیچ دیئے تھے۔ پیدل فوج کے پاس وردیاں نہیں رہی تھیں۔ جانوروں کو چارہ نہ ملتا تھا۔ اس وجہ سے وہ مرنے لگے تھے۔ اپنے گھر میں سے باہر نہ نکلتے تھے۔ بعض اوقات شاہی سواروں کی ہمراہی میں بھی نہ ہوتے تھے!!

(تاریخ عالمگیر ثانی (قلمی) بحوالہ شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات ص [۱۶۲-۳

طاقت اس حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کی اہل بھی نہیں تھی۔ اس لیے حکومت کا زوال عوام کا زوال بن گیا۔ جو مصیبت بادشاہوں پر آئی تھی۔ اس کا اثر امرا و رؤسا سے لے کر عوام تک سب پر برابر پڑا تھا۔ حکومت کی حالت ایک ایسے مریض کی تھی جس پر جاں کنی کا عالم طاری ہو مگر موت نہیں آتی تھی۔ اور یہ تکلیف بادشاہ، امرا و رؤسا اور عوام تک سب کی زندگی کو اجیرن بنائے ہوئے تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی گردن پر ایک ننگی تلوار لٹکی ہوئی تھی جو کسی وقت بھی ان کے سر کو جسم سے علیحدہ کر سکتی تھی۔ عظمتِ ماضی کا احساس اُن سے زخموں پر نمک تو چھڑک سکتا تھا۔ سکون نہیں پہنچا سکتا تھا۔ جاگیردار طبقہ کے دست و بازو شل ہو چکے تھے۔ دشمنوں پر بجلی کی طرح کوندنے والی تلوار زنگ آلود ہو چکی تھی۔ اس لیے سماج کے تمام افراد کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ اور وہ تھا فرار "زندگی اور اس کے تلخ حقائق سے فرار۔ نواب صاحب کی تالیف "مرقع دہلی" اسی فرار کی دردناک داستان ہے۔ فرار کی دو نمایاں صورتیں تھیں۔ مذہب کا سہارا لے کر انفرادی نجات کی کوشش کی جائے۔ ساری دنیا میں ناکامی کے احساس کو مٹانے کے لیے عالم آخرت کے لیے جدوجہد کی جائے۔ اور دوسرا راستہ تھا دین و دنیا سے بے نیاز ہو کر رامش و رنگ و بو میں ڈوب جایا جائے ؎

آنچہ در جملۂ آفاق دریں جا حاضر
شاہد و شمع و شراب و شکر و نائے و سرود

فرار کی یہ دونوں صورتیں نمایاں نظر آتی ہیں۔ اس عہد میں قبر پرستی اور تصوف کو جتنی مقبولیت ہوئی ہندوستان میں شاید اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ لوگ اپنے افعال و اعمال درست کرنے کی بجائے "عالم آخرت" کے لیے ایسی ہی چیزوں کا سہارا تلاش کرتے تھے۔ خود نواب صاحب کو ان چیزوں سے بڑی عقیدت تھی۔ انھوں نے "مرقع دہلی" کی ابتدا دہلی کے متبرک مقام "قدم شریف" سے کی ہے۔ اس کے بارے میں لکھتے ہیں:-

> ...... یہاں حضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم کا نشان ہے کہ جن کے آستاں کی خاک اربابِ بصیرت کیلئے سرمہ اور جن کے راستے کا غبار اہلِ فطرت کے دل کے سکون کا سبب ہے ...... جمعرات کے دن درگاہ کے صحن میں زائرین کا اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ ہزاروں مصیبتیں اٹھانے کے بعد قدم شریف تک پہنچنا ممکن ہے۔ اور ربیع الاول کے مہینے میں تو دن رات ایسا ہی مجمع رہتا ہے۔ فقرا اور زائرین دور دور کے شہروں اور مقاموں سے زیارت کے لیے آتے ہیں...... سعادت منش لوگ آخرت میں اجر پانے کے لیے اس درگاہ کے احاطہ میں بہت زیادہ روپیہ خرچ کرکے مکان خریدتے ہیں اور آخرت کا مکان (قبر) بناتے ہیں[1]

انفرادی نجات کی کوششوں کی انتہا یہ تھی کہ لوگ بزرگوں کے قریب دفن ہونے میں اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ ان بزرگوں

---

[1] "مرقع دہلی" کے جتنے بھی اقتباسات دیئے گئے ہیں۔ وہ اصل فارسی متن سے ترجمہ کئے گئے ہیں۔ اقتباسات کے اختصار کے خیال سے لفظی ترجمہ نہیں کیا۔

کی وجہ سے وہ جہنم کی آگ سے محفوظ رہیں گے۔ نواب صاحب نے خواجہ باقی اللہ کی درگاہ کے متعلق بھی یہی لکھا ہے: ۔

"اس درگاہ کے متعلق عجیب و غریب خوارق میں ایک بات یہ ہے کہ اہلِ دہلی تلاش
کے بعد شہر کے لوگ اپنے عزیزوں کو اس کے احاطے میں دفن کرتے ہیں تاکہ اُن کے
ہمسائیگی کی وجہ سے جہنم کی آگ سے محفوظ رہیں۔"

عوام زندگی کی جدوجہد سے دور رہتے تھے۔ مشکلات پڑنے پر خود اُن کا مداوا کرنے کی بجائے قبروں یا سوتے بزرگوں سے مدد اور استعانت چاہتے تھے۔ شاہ ترکمان کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں: ۔

"..... ۲۴ رجب کو عرس ہوتا ہے۔ خادم اور معتقد عرس کے دن مناسب آئین کے
مطابق اہتمام کرتے ہیں۔ کثرتِ چراغاں اور قنادیل کی وجہ سے صحن فلک نورانی معلوم ہوتا
ہے...... اہلِ دہلی کو اس مزار سے بڑی عقیدت ہے۔ وہ اپنی مشکلات میں اس
روضۂ شریف سے مدد چاہتے ہیں۔"

اس طرح نواب صاحب نے سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء، نصیرالدین چراغ دہلوی، شاہ حسن رسول نما، شاہ بایزید اللہ، شاہ عزیز اللہ اور مرزا بیدل وغیرہ کے مزارات کا بھی ذکر کیا ہے۔ جہاں بقول ان کے نور برستا ہے۔ لوگ نذر و نیاز اور منتیں لے کر آتے تھے۔ اور اپنے دامن کو مراد کے پھولوں سے بھر کر لے جاتے تھے۔ اور جن کے قریب دفن ہونے سے انسان جہنم کی آگ سے محفوظ ہو جاتا تھا۔ ان مزارات کے علاوہ لوگوں کو صوفیوں سے بھی بڑا اعتقاد تھا۔ نواب صاحب نے اس دور کی جتنے بزرگ ہستیوں کا ذکر کیا ہے، وہ سب گمنام ہیں۔ حافظ شاہ سعداللہ کے بارے میں نواب صاحب لکھتے ہیں۔ بہت بلند مرتبہ بزرگ ہیں۔ لوگ انھیں ولی سمجھتے ہیں۔ مشہور ہے کہ قطبیت کے درجہ تک پہنچ گئے ہیں۔ آپ کی کرامت مشہور ہے کہ آپ نے بہت سے اندھوں کو بینائی بخشی ہے۔ صاف دل اور روشن ضمیر ہیں۔ نقش بندی سلسلے سے بیعت ہیں۔ اس لیے سماع سے دلچسپی نہیں رکھتے۔ شاہ غلام محمد داؤد پورہ بھی بارعب اور برگزیدہ ہستی ہیں۔ اکثر روزہ رکھتے ہیں۔ بہت دُبلے پتلے اور کمزور جسم کے ہیں۔ کسی سے کچھ نہیں لیتے۔ اگر کبھی کوئی نذرانہ قبول بھی کرتے ہیں تو حاضرین میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ رات کو کھچڑی کھاتے ہیں اور کبھی تنہا نہیں کھاتے۔ قوالی سنتے ہیں۔ محمد شاہ بادشاہ نے بہت کوشش کی کہ یہ وظیفہ قبول کر لیں مگر انھوں نے صاف انکار کر دیا۔ شاہ محمد امیر نقش بندی سلسلے کے بزرگ ہیں۔ صاحبِ کمال اور پُرجلال ہیں۔ سارا وقت استغراق میں گزرتا ہے۔ بہت تھوڑی دیر آرام کرتے ہیں۔ کشمیر کے لوگ خصوصیت سے معتقد ہیں۔ امرائے شہر اور اعتماد الدولہ بھی آپ کا مرید ہے۔ ایک اور بزرگ شاہ پانصد منی ہیں۔ یہ نوران کے ر والے ہیں۔ گدھے کی سواری کرتے ہیں۔ ان کے ہاں تمام دن مہمانوں کا مجمع رہتا ہے۔ میر سید محمد بہت متوکل اور قانع بزرگ ہیں۔ چہرہ آفتاب کی طرح چمکدار اور چاند کی مانند نورانی رہتا ہے۔ کسی سے کچھ لینا پسند نہیں کرتے۔ حق گو بے باک ایسے ہیں کہ کسی رئیس اور بادشاہ کی پرواہ نہیں کرتے۔ بڑے شیریں سخن اور شیریں مقال ہیں۔ مجنوں نانک شاہی، مجنوں کی طرح دُبلے پتلے اور نازک ہیں۔ کے کنارے ایک تکیہ میں رہتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان سب ان کی زیارت کو آتے ہیں۔ جو کچھ نذرانہ ملتا ہے غریبوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ بڑے رنگین مزاج اور شوخ طبیعت بزرگ ہیں۔ اعلیٰ سے اعلیٰ باریک کپڑا پہنتے ہیں۔ خورد و نوش میں بڑا تکلف اور اہتمام کرتے ہیں

ی مجلسوں اور بزرگوں کے عرسوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے ہیں۔ اور عجیب و غریب حرکتیں کرتے ہیں۔ فارسی کے بے انتہا اشعار یاد ہیں اور ریختہ گوئی میں کمال حاصل ہے۔ ایک اور بزرگ شاہ غلام محمد ہیں۔ ان کے ہاں ہر سہ شنبہ کو مجلس سماع منعقد ہوتی ہے شہر کے قوال اور اہل ذوق جمع ہوتے ہیں۔ شاہ رحمت اللہ بھی دہلی کے مشہور بزرگ ہیں۔ ریا اور نمائش سے بچتے ہیں۔ کلال بچوں پر بہت مہربان ہیں تاکہ لوگ انھیں شرابی سمجھیں اور اُن پر ملامت کریں۔ غریبوں کے بڑے ہمدرد ہیں۔

ان فقیروں اور صوفیوں کے ذکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں خانقاہی نظام عروج کی انتہا پر تھا۔ خانقاہ ایک ایسی پناہ گاہ بن گئی تھی۔ جہاں حالات سے نظریں چرا کر کچھ دیر کے لیے آرام کیا جا سکتا تھا۔ ان بزرگوں، خانقاہوں اور مزاروں کی مقبولیت کی بنیاد اقتصادی اور سیاسی بدحالی پر تھی۔ سعادت یار خاں رنگینؔ کے شہر آشوب کا ابتدائیہ اس ذہنی فرار پر بخوبی روشنی ڈالتا ہے۔

سنو بیان ایک میرا یارو   منصف ہو تو سُن کر رو دو
ایک دن مجھ کو یہ سوچ آیا   یعنی زمانے نے ہے ستایا
اس دنیا میں آئے ہیں جب سے   چین نہیں مطلق ہے تب سے
دولت اپنے پاس نہیں ہے   کچھ آمد کی آس نہیں ہے
فکرِ معیشت نے مارا   کیجیے کس صورت سے گزارا
ہوا ہوں صاحب میں مضطر   تب یہ کہا دل نے گھبرا کر
کیوں اے دل کیا مرضی ہے تیری   فکر تجھے کچھ ہے بھی میری
چیز بڑی دنیا میں ہے دولت   بن اس کے ہوتی ہے ذلت
کھیتی کر تو یا کر تو تجارت   نوکری کر یا باندھ کے ہمت
سُن کر دل نے یوں کہا مجھ کو   خاص میں کہتا ہوں تجھ کو
ہو وے اگر امداد الٰہی   سب سے بہتر یاد الٰہی
صبر کی داد خدا ہی دے گا
دل کی مراد خدا ہی دے گا

یہ اشعار بتاتے ہیں کہ لوگ تلاشِ معاش میں سرگرداں رہتے تھے۔ اور ناکامی ہونے پر کھیتی، تجارت اور نوکری کا خیال چھوڑ کر یادِ الٰہی میں مصروف ہو جاتے تھے۔

یہ پریشانیاں تو نچلے طبقے کی تھیں۔ اوپر کا طبقہ اور زیادہ پریشان تھا۔ اسے اپنی معاش کے لیے ایک طرف تو عیاریوں، مکاریوں، سیاسی سازشوں اور قتل و غارت گری میں حصہ لینا پڑتا تھا۔ اور دوسری طرف افلاس کے مارے ہوئے بھوکے ننگے عوام کی آنکھوں سے نکلتے ہوئے بغاوت اور انتقام کے شعلوں سے لرزہ براندام تھا۔ ایک دو دفعہ نہیں بارہا ایسا ہوا ہے کہ مہینوں اور برسوں سے تنخواہ نہ پانے والے سپاہیوں نے امرا و رؤسا کے گھروں کو لوٹ لیا ہے۔ اس لیے یہ طبقہ خانقاہوں کی سرپرستی کرتا

تھا۔ ان کی مالی امداد کرتا تھا۔ تاکہ عوام کو مذہب اور تصوف کی دی ہوئی قناعت اور صبر کی افیون کے نشے میں رکھا جائے۔ ان خانقاہوں میں صبر وقناعت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ انھیں سمجھایا جاتا تھا کہ دنیا ایک قحبہ خانہ ہے۔ جس سے ہر انسان کو دامن بچا کر نکل جانا چاہیئے۔ خانقاہوں میں اس طبقہ کے افراد بھی عقیدتمندانہ حاضر ہوتے تھے۔ جس میں حکومت کے اہم عہدوں کو سنبھالنے کی صلاحیت تھی۔ لیکن درباری سازشوں، بدنظمی اور بادشاہ کی دوسری چیزوں میں دلچسپی کی وجہ سے انھیں موقع نہیں ملتا تھا۔ اس طبقہ کے بیشتر افراد اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے خانقاہ میں اہم مقام حاصل کر لیتے تھے۔ اور پھر اپنے طبقہ کی رہنمائی کرتے۔ تصوف کی مقبولیت اس درجہ بڑھی کہ یہ سماجی عزت اور وقار حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ بن گیا۔ اس طرح خانقاہی نظام نے عوام کے ذہن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

فرار کا دوسرا راستہ "عیش وعشرت" تھا جس میں اوپر کا طبقہ مبتلا تھا۔ اورنگ زیب کے کچھ ہی عرصہ بعد مغل بادشاہ عیش میں غرق ہو گئے۔ اُن میں حکومت سنبھالنے کی اہلیت، ہمت اور طاقت نہیں تھی۔ مغلوں کی وہ تلواریں جو کبھی بابر، اکبر اور ہمایوں جیسے دنیا کو فتح کرنے کا حوصلہ رکھنے والے جری بہادروں کے ہاتھوں میں رہی تھیں۔ اب برسوں بھی میان سے نہیں نکلتی تھیں۔ شاہی خزانے خالی تھے۔ لیکن بہادر شاہ اول کے لڑکے جہاندار شاہ کی تفریح اور عیاشی کے لیے مہینے میں تین دفعہ سارے شہر میں چراغاں ہوتا تھا۔ اس چراغاں کا نتیجہ یہ ہوا کہ روغن دو روپے سیر بکنے لگا۔ اور کچھ دن بعد بالکل نایاب ہو گیا۔ تو گھی کے چراغ جلائے جانے لگے۔ اور گھی کے ساتھ بھی وہی ہوا۔ یعنی غذا کے لیے بھی ملنا مشکل ہو گیا۔ جہاندار شاہ اور لال کنور کے تعلقات مغل زوال کی بہترین مثال ہیں۔ یہ ایک بازاری عورت تھی۔ جسے لال قلعہ اور اس کی سیاست میں پورا عمل دخل تھا۔ اسے امتیاز محل کا خطاب دیا گیا۔ اور اس کے قدموں پر مغل خزانہ نثار کر دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ اس ڈومنی کے اکثر رشتہ داروں کو وہ اہم عہدے دیے گئے جو صرف امراؤ روسا اور ان کی صلاحیتوں کے مالکوں کے لیے مخصوص تھے۔ لال کنور کے تین بھائی تھے اور تینوں کو نعمت خاں، نامدار خاں اور خانہ زاد خاں کے خطابات سے نوازا گیا۔ مغل بادشاہ حکومت کے اہم کاموں کو فراموش کر کے کس طرح عورت اور شراب میں ڈوب گئے تھے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہوتا ہے۔ ایک دفعہ لال کنور اور مغل شہنشاہ ایک رتھ میں بیٹھ کر سیر کرنے گئے۔ واپسی میں لال کنور اپنی ایک سہیلی کے ہاں اتری، جہاندار بھی ساتھ تھا۔ دونوں نے خوب شراب پی۔ اور نشہ میں دھت قلعہ واپس آئے۔ لال کنور کے ملازموں نے اسے اتار لیا، اور جہاندار شاہ رتھ ہی میں پڑا رہا۔ بہت دیر بعد جب اس تلاش کی گئی تو دو میل دور رتھ میں بیہوش پایا گیا[1]

درگاہ قلی خاں نے عہد محمد شاہ کی عیاشیوں کا ذکر کیا ہے۔ اس لیے محمد شاہ کے متعلق کچھ بتانا نامناسب نہیں ہے کہ عہد میں یہ عیاشیاں انتہا کو پہنچ گئی تھیں۔ اس دور کا ایک مورخ لکھتا ہے:۔

> "حضرت سجانی بادشاہی کاروبار سے بے خبر دارالخلافہ کے قلعہ کو ایک عظیم پناہ گاہ سمجھتے تھے۔ ثمن برج اور انگوری باغ کی سیر کو غنیمت جانتے تھے۔ ہمیشہ شراب خوری، بچہ بازی اور

---

[1] تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: IRWIN:- LATER MUGHALS VOL. I P: 190 -

زناں کاری میں مشغول رہتے ، اور تنگ لباس پہنا کر اپنے ساتھ رکھتے۔ شہر کے تمام لوگوں نے خدا کو فراموش کر دیا۔ اور عوام و خاص دونوں نے عورتوں کا لباس اختیار کر لیا نماز اور روزہ کی بجائے حرام کاری، شراب خواری اور اغلام میں مطلق العنان ہو گئے۔" سے

بادشاہ کے کردار کا اثر امراؤ رؤسا پر براہ راست پڑتا ہے۔ شاہ عالم ثانی کے عہد میں نجف خاں جیسا بہادر اور دانش مند جنرل بھی اس طلسم خانہ میں داخل ہوا۔ اور پھر مرکر ہی نجات پائی۔ میر اس کے بارے میں لکھتے ہیں: ۔

"..... لیکن وہ جوان تھا۔ اور شاہجہان آباد۔ دلی تو ایک طلسم خانہ ہے یار دوستوں نے عیش و عشرت کی جانب مائل کر دیا۔ مکروہات کے استعمال اور عورتوں کی ہم جلیسی میں اتنا منہمک ہوا کہ بدن سے طاقت زائل ہو گئی۔ آخر مرض سل میں گرفتار ہو گیا۔" سے

اب "مرقع دہلی" کی کچھ جھلکیاں دیکھئے۔ جن کا ایک ایک لفظ اوپر دیئے گئے اقتباسات کی تصدیق کرتا ہے۔ نواب صاحب چوک سعد اللہ خاں کی دکانوں کا ذکر کرتے ہوئے ان خود ساختہ حکیموں کا ذکر کرتے ہیں جنھیں حکمت کے علاوہ سب کچھ آتا ہے۔ یہ لوگ بازار میں اپنی دکان لگا کر اچھا خاصا مجمع اکٹھا کر لیتے ہیں اور بقول نواب صاحب

"دیہ حکیم، خاص طور پر چلبی، استحکام عضو تناسل، امساک، آتشک، خنازیر اور سوزاک کا ذکر کرتے ہیں۔"

نواب صاحب نے ان شریف زادوں کا بھی ذکر کیا ہے جنھوں نے "عیش و عشرت" کو بحیثیت فن کے ترقی دی تھی اور جن کے دن رات صرف شراب، امردوں اور عورتوں میں گزرتے تھے۔ خان جہاں بہادر عالمگیری کے بھائی فدوی خاں کے لڑکے اعظم خاں کے بارے میں نواب صاحب نے لکھا ہے۔

اعظم خاں...... امرائے عظیم الشان میں ہے۔ رنگینی مزاج اور مہارت راگ کے تعلق کی وجہ سے ہندوستان کے مطربوں کا ممدوح ہے۔ امردوں کو پسند کرتا ہے۔ اس کے مزاج میں سادہ رویوں کی محبت ہے۔ جو کچھ جاگیروں سے وصول ہوتا ہے اور جتنا کچھ کماتا ہے۔ اس فرقہ پر خرچ کر دیتا ہے۔ جب بھی کسی رنگین امرد کی خبر پاتا ہے تو دلی خواہش کی وجہ سے اس پر رفاقت کی کمند پھینکتا ہے...... جہاں کہیں بھی کوئی سبزہ رنگ نظر آئے وہ اعظم خاں سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور جہاں کہیں کوئی

سلہ قلمی و قدیم بیاض۔ انجمن ترقی اردو۔ علیگڑھ۔ بحوالہ "دلی ایک تاریخی مہلک شاعری کے آئینے میں" دلی نمبر۔ دلی کالج میگزین ص/ ۲۹۵

سلہ میر کی آپ بیتی ص/ ۱۷۸

خوشنما جلوہ دکھائے وہ بھی اسی عظیم الشان سے منسوب ہوتا ہے۔

نواب صاحب ایک اور امیر زادے میر خو کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

اپنے زمانے کے امیروں میں ہیں۔ اس فن میں جادو جانتے ہیں۔ اکثر امیر زادے اس فن میں انہیں سے داؤ پیچ سیکھتے ہیں۔ اور ان کی شاگردی پر فخر کرتے ہیں...... ان کا گھر شداد کی جنت ہے۔ وہاں حسینوں کا جمگھٹا رہتا ہے۔ ہر وہ نوخط حسین جس کا اس محفل سے تعلق نہیں "فرد باطل" ہے۔ جو کوئی ان محفلوں میں شریک نہیں وہ اعتبار سے ساقط ہے۔ یہ مجلس حسینوں کی آزمائش گاہ۔ یہ بزم گل رخوں کے لیے امتحان گاہ ہے.... ..... جو حسین ان کی محفل کے دار الضرب سے نہیں گزرتا.... وہ "کامل عیار" نہیں۔

نواب صاحب کسی امیر زادے لطیف خاں کی محفلوں کو بہت سراہتے ہیں۔ لطیف خاں کے آداب، محفل شعر خوانی، دوست نوازی، انداز خاطر و تواضع کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"اس کی محفل میں نور بائی اور دوسری طوائفیں سازندے اور رقاص ہوتے ہیں۔"

دلی میں بسنت کا میلہ پورے ایک ہفتہ منایا جاتا تھا۔ ہر روز نیا پروگرام ہوتا تھا۔ اس میلے کی پوری تفصیل بیان کر کے آخری دن کے پروگرام کے متعلق نواب صاحب لکھتے ہیں:-

"اس مہینے کی ساتویں رات کو تمام ارباب رقص "عزیزی" کی قبر پر حاضر ہوتے ہیں جو احدی پورہ میں ہے۔ ان کی قبر کو شراب سے دھوتے ہیں۔ اور تمام رات اپنے اپنے مرتبے کے مطابق رقص و سرود کرتے ہیں۔ اور ان حرکتوں کو مرحوم کی روح کے ترویح کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ قوال بھی جستہ جستہ وہاں آتے ہیں۔ اور رنگین مجلس ہوتی ہے۔ حسین لوگ بھی وارد ہوتے ہیں۔ اور انہیں عجیب خلوت دی جاتی ہے۔ عجیب صحبت میسر آتی ہے۔ غرض اس تقریب سے چھ دن تک عشرت پرست تماشائی اور سیاہ سیر اور چابک دست نظارہ کرنے والے خوب داد عیش و عشرت دیتے ہیں اور ایک ہفتہ میں سال بھر کے لیے لذتوں کا ذخیرہ جمع کر لیتے ہیں۔"

نواب صاحب نے ان مطربوں، سازندوں، رقاصاؤں، طوائفوں اور امردوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جو اپنے ا- یکتائے روزگار تھے۔ ان فنکاروں کی مقبولیت دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس سماج میں صرف "طاؤس و رباب" کے سہارے ز- جا رہی تھی۔ اور "شمشیر و سناں" ایک حسین خواب سے زیادہ کچھ نہیں تھے۔ نعمت خاں بین نواز کے بارے میں نواب صاح- ہے۔ فن موسیقی کے ایجاد کرنے میں یگانہ روزگار ہے۔ موسیقی میں ایسی مہارت ہے کہ دہلی کے تمام مغنیوں کا سردار ہے۔ وقت کے کسی کی فرمائش قبول نہیں کرتا۔ ہر مہینے کی بارہ تاریخ کو خود ایک مجلس کرتا ہے۔ جس میں دہلی کے امراء و رئیس ہیں۔ ان مجلسوں کی مقبولیت اس درجہ ہے کہ لوگ صبح ہی سے آنے لگتے ہیں۔ اور شام تک تل دھرنے کی جگہ نہیں رہتی

بین بجاتا ہے تو لوگ ماہیِ بے آب کی طرح تڑپنے لگتے ہیں۔ اور بے حال ہو جاتے ہیں۔ نعمت خاں کا ایک بھائی ہے۔ اس کی خوبی یہ ہے کہ گھنٹوں ایک ہی ساز کو مختلف طریقوں سے بجاتا ہے۔ نئی نئی راگنیاں ایجاد کرتا ہے۔ اس کے پاس تین تاروں کا ایک ساز ہے۔ جس کا شمار عجائباتِ موسیقی میں ہے۔ تاج خاں ایک قوال ہے۔ اس کی قوالی میں روح کے لیے ٹھنڈک، دل کے لیے اطمینان اور طبیعت کے لیے سرور اور سکون ہے۔ یہ صوفی منش آدمی ہے۔ ساتویں تاریخ کو اپنے گھر پہ مجلس کرتا ہے۔

جانی اور غلام رسول دونوں تاج خاں کے لڑکے ہیں۔ ان دونوں کو بھی قوالی پہ مہارت حاصل ہے۔ باقر طنبورچی اپنے وقت کا استاد ہے۔ جب طنبورے کے تاروں پر باقر کی انگلیاں چلتی ہیں اور اس میں سے میٹھے میٹھے سُر پیدا ہوتے ہیں۔ تو تمام سننے والوں کا دل بے قابو ہو جاتا ہے، بادشاہِ وقت باقر کی بہت قدر کرتے ہیں۔ اور عوام و رؤسا تو اس کے عاشق ہیں۔

حسن خاں ربابی کو رباب پر اور غلام محمد سارنگی نواز کو سارنگی پہ پوری قدرت حاصل ہے۔ تان سین کی اولاد میں رحیم اور زمان سین دو بھائی ہیں۔ سب اہلِ فن اور اربابِ نشاط ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ گانے میں دونوں کو کمال حاصل ہے۔ ان کے نغمات جادو کا سا اثر رکھتے ہیں۔ یہ دونوں کبت کے راگ میں عجوبہ روزگار اور دھرپد کے میدان میں سپہ سالار ہیں۔ حسین خاں ڈھولک نواز کو اپنے فن میں اتنی مہارت ہے کہ دنیا میں کوئی اس کا حریف نہیں۔ اس کی مہارت کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی مجلس میں یہ چھ مہینے تک بیٹھے تو ہر رات نئی نئی طرز سے مسلسل ڈھولک بجاتا رہے گا۔ ڈھولک پر اس کی انگلیاں اس خوبصورتی اور تیزی سے چمکتی ہیں جیسے اندھیری رات میں جواہرات اور ستارے جگمگا رہے ہوں۔ قطبا بھی ڈھولک نواز ہے۔ اور حسین خاں کا شاگرد ہے۔ اس فن میں استاد کے بعد اس کا درجہ ہے۔ شہباز دمدمی نواز کا باپ سرکار اعظم شاہ میں ملازم تھا۔ شہباز دمدمی بجانے میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ شاہ درویش سبوچہ نواز مادر زاد اندھے ہیں۔ مٹکا بجانے میں مجتہد وقت ہیں، ان کی سبوچہ نوازی کے سامنے بڑے بڑے ڈھولک نواز شرما جاتے ہیں۔ انھوں نے ایک خاص ساز ایجاد کیا ہے۔ جس میں ڈھولک، پکھاوج اور طنبورے کی ملی ہوئی آوازیں ایک ساتھ نکلتی ہیں۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے جیسے تینوں چیزیں ایک ساتھ بجائی جا رہی ہیں۔ ایک فنکار نابینا شکم نواز ہیں۔ انھیں پیٹ بجانے پر ایسی مہارت ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ ڈھولک اور پکھاوج کے تمام قوانین اور باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ طوائفیں ان کے پیٹ کے ساز پر خوب ناچتی ہیں۔ عجیب باکمال نابینا ہیں۔ تقی کو بھگت بجانے میں وہ مہارت ہے کہ بھگت بجانے والوں کی جماعت کا سردار ہے، بادشاہ کا منظورِ نظر ہے، اس کے پاس بھگت بجانے کا ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ اس کا تمام وقت بھگت بجانے میں صرف ہوتا ہے یا امردوں، نازنینوں، سیاہ چشموں، منتخب روزگار حسینوں اور مشہورِ عالم معشوقوں کے ساتھ خوش گپیاں کرنے اور تفریح کرنے میں۔ نواب صاحب نے اور بہت سے فنکاروں اور کافرادؤں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں ہینگا امرد، نور بائی، امر بیگم، پنا اور تنو قابلِ ذکر ہیں، ہینگا امرد کے بارے میں نواب صاحب لکھتے ہیں۔ وہ بادامی لباس پہنتا ہے۔ گورا رنگ ہے۔ قلعہ کے سامنے چوک پر روز شام کو رقص کرتا ہے۔ تماشائیوں نے اسے ہینگا مرہیرا کا خطاب دیا ہے۔ چونکہ لاکھوں میں انتخاب ہے۔ اس لیے ہزاروں اس کے حسن کے خریدار ہیں۔ بے انتہا خوبصورت اور جاذبِ نظر ہے۔ حسن فروشی سے دولت کماتا ہے۔ لیکن کبھی کسی کے گھر نہیں جاتا۔ اس کے عاشق اور خریدار خود اس کے مکان پر جا کر وصل اور رقص کی لذتیں اٹھاتے ہیں۔ . . . . . .

نور بائی[1] دہلی کی مشہور ڈومنی ہے۔ بڑے بڑے امراء اس کے دیدار کی تمنا رکھتے ہیں۔ ہاتھی پر سوار ہو کر بڑے اہتمام سے نکلتی ہے۔ جہاں جاتی ہے۔ جواہ ان سے خاطر ہوتی ہے۔ اس نے بے شمار دولت جمع کر لی ہے۔ یہی دیکھا گیا ہے کہ جو بھی نور بائی کا دوست ہوا۔ تباہ ہو گیا ہے۔ بہت سے رئیس فقیر ہو گئے۔ ہزاروں کی جائدادیں ختم ہو گئیں۔ کم بخت آدمی سے نہیں روپے سے محبت کرتی ہے۔ تمام بلا کی حسین، شوخ اور رجاد و گفتار ہے۔ آداب مجلس سے پوری طرح واقف ہے۔ بڑی ذہین، سمجھدار، نکتہ رس، اور خوش تقریر ہے۔ لوگ جانتے ہیں۔ سمجھتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ نور بائی کے حسین پردوں میں دولت اور عزت کو ڈسنے والی ناگن چھپی ہوئی ہے۔ مگر جب وہ دلکش اور دلفریب مسکراہٹ ہونٹوں پر لیے سامنے آتی ہے، تو سب مسحور ہو جاتے ہیں۔ اور اپنا سب کچھ اس کے قدموں پر لٹا دیتے ہیں۔ وہ موسیقی میں ماہر ہے اور خصوصاً گانے میں بڑی مشتاق ہے۔ امر بیگم ایک عجیب طوائف ہے۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اکثر برہنہ رہتی ہے۔ اور مجلسوں میں اسی طرح آتی ہے۔ کہ بدن اسفل کے حصہ پر پاجامے کے نقوش کندہ کروائی ہے۔ کم خواب اور بوٹے دار کپڑے کی طرح اس کے جسم پر پاجامے کی نقاشی اس طرح ہوتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے جیسے پاجامہ پہنے ہو۔ اور بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ بالکل برہنہ ہے۔ بینا اور تتو بھی مشہور زمانہ طوائفیں ہیں۔ بادشاہ کی منظور نظر اور منہ چڑھی ہوئی ہیں۔ رقص میں انھیں واقعی اجتہاد کی حد تک مشق ہے۔ لوگ اُن کے عاشق ہیں۔ ناچ شروع ہونے سے پہلے تحسین و مرحبا کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ بچو خانم طوائف بڑی چنچل اور کافر ادا ہے۔ اس کی آنکھوں میں مار ڈالنے والا زہر اور لبوں میں زندہ کرنے والا افسوں ہے۔ غرض حسینوں میں انتخاب، ناچنے والیوں میں شہرہ آفاق اور موسیقی دانوں میں باکمال ہے۔

اہل دہلی کی عیاشیوں اور جنسی بے راہ رویوں کے سلسلے میں نواب صاحب کے بیان کئے ہوئے کسل پورہ کے حالات بھی بہت اہم ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: —

> کسل سنگھ بادشاہ کے ہزاری منصب داروں میں ہے۔ ثروت و دولت کے اعتبار سے اپنے ہمعصروں میں فخر و امتیاز رکھتا ہے ۔۔۔۔ کسل پورے کو نہایت اہتمام و تکلف

---

[1] حکیم سید مظفر حسین مراۃ آفتاب نما (قلمی) کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ یہ وہی نور بائی ہے کہ نادر شاہ اس کی حاضر جوابی و لطیفہ گوئی بذلہ سنجی سے بہت خوش ہوا تھا۔ اور یہ غزل جس کا مطلع ہے ؎

دلبر ما بہ دگر سرناز آمدہ
از دل ماچہ بجا ماند کہ باز آمدہ

سن کر چار ہزار روپیہ انعام سرفراز کر کے کہا تھا ؎

روئے ہند را سیاہ کن بیا کہ با یرانت بریم

مگر ایک غزل جس کا مطلع تھا ؎

من شمع جانگدازم تو صبح دلکشائی ‌ ‌ ‌ سوزم گرت بہ بینم میرم چو رخ نمائی

سنا کر بہ حیلۂ بیماری نجات حاصل کی۔ ("مرقع دہلی" (مقدمہ) ص ۳۹)

> سے آباد کیا ہے اور ہر قسم کی طوائفوں اور ایسی بازاری عورتوں کو جو مالزادیاں ہیں وہاں رکھا ہے۔ ارباب مناہی و مسکرات کو خود اس نے وہاں جگہ دی ہے۔ کثرت جمعیت کے باوجود محتسب کو اس علاقہ میں دخل نہیں۔ اور محتسب خود میں احتساب کرنے کی طاقت نہیں پاتا..... وہاں کی ہوا شہوت انگیز ہے.....

اس طرح اہلِ دہلی نے مزارات، غیر مذہبی رسوم اور شراب و عورت کا سہارا لے کر خود کو فراموش کر دیا۔ مزارات سے عقیدت ہو یا شراب نوشی دونوں فرار کے دو مختلف راستے تھے۔ اور دونوں سے مراد ایک گونہ بے خودی تھی۔ لیکن سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ فرار کے یہ دونوں راستے ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ حرم اور میکدہ کے درمیان کوئی سرحد نہیں رہی۔ لوگ خدا اور شیطان دونوں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ صوفیوں اور فقیروں کی خدمت محض اس لیے کی جاتی تھی کہ اُن کے مطابق آخرت میں نجات کا یہی راستہ تھا۔ بادشاہ اور امراء دنیا بھر کی عیاشی کرتے صوفیوں کی بہت زیادہ عزت کرتے "دعاگوئی" کے صلے میں مدد معاش کے طور پر جاگیریں اور املاک عنایت کرتے۔ محمد شاہ کو درویشوں سے اتنی ارادت تھی کہ اس نے شاہ مبارک کو برہان الطریقت، شاہ بدر کو برہان الحقیقت اور شاہ رمز کو فصیح البیان کے خطابات دیئے تھے۔[1]

محمد شاہ نے ایک دفعہ قمر الدین وزیر کی معرفت مرزا مظہر جانِ جاناں سے کہلوایا تھا کہ "خدا نے ہم کو ملک عطا کیا ہے۔ جو (علاقہ) خاطر میں آئے بطور ہدیہ قبول فرمایئے۔ مگر مرزا نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

چونکہ سماج میں تصوف کو بہت زیادہ مقبولیت تھی۔ اس لیے "المجاز قنطرۃ الحقیقت" کے فلسفہ کا ناجائز فائدہ اٹھا کر امرد پرستی جیسے غیر فطری فعل کو جنسی آسودگی کا ذریعہ بنا لیا گیا۔ ان جھوٹے صوفیوں، امراء، رؤسا اور عوام کو نہ حرم سے خلوص تھا نہ میکدے سے۔ ان کی راتیں میخانوں میں اور دن خانقاہوں میں گزرتے تھے۔ شاید آج بھی پیرس کے نائٹ کلبوں میں وہ شرمناک جنسی مناظر نظر نہ آتے ہوں گے۔ جو اس دور کے عرسوں اور میلوں میں عام تھے۔ نواب صاحب نے ایسے بہت سے عرسوں کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کی دلفریب تصویریں بنائی ہیں۔ دہلی میں سرائے خواجہ بسنت اسد خانی کے قریب کسی ناگل نامی بزرگ کا مزار تھا۔ اس پر ہر مہینہ عرس ہوتا تھا۔ نواب صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں:-

> ہر مہینے کی ساتویں تاریخ کو عاشق مزاج عورتیں خوب بن ٹھن کر جوق در جوق اس مزار کی زیارت کو آتی ہیں۔ حقیقت میں آنے کا مقصد دوسرا ہوتا ہے۔ وہاں سیر و تفریح کرتی ہیں۔ اور اپنے عاشقوں سے مل کر دادِ عیش دیتی ہیں۔ اکثر اہلِ تجرید اور غریب پیشگان وہاں طرح طرح کے خوبصورت لباس پہن کر آتے ہیں۔ تاکہ کوئی عورت انھیں قبول کرے...... اگر کوئی اجنبی اس نزہت کدے میں وارد ہو تو اسے فوراً اپنا جوڑا مل جاتا ہے۔ یہاں اتنے تماشائی ہوتے ہیں کہ اس آبادی کی وسعت چیونٹی کی آنکھ سے بھی تنگ ہو جاتی ہے۔

---

[1] مغل حکومت کا زوال جلد اوّل ص ۸

دہلی کے ایک امیرزادے اپنے والد کا عرس کرتے تھے۔ عرس تو بہانہ تھا۔ حقیقت میں دادِ عیش و انبساط دینا مقصود تھا۔ نواب صاحب اس عرس کے متعلق لکھتے ہیں۔

"میر مشرف کا لڑکا میر کلو بڑے طمطراق اور عجیب شان سے اپنے والد کا عرس کرتا ہے ...... بادشاہ کے دربار کے تمام امرا اور اربابِ نشاط کو دعوت دیتا ہے۔ جلسۂ عام ہوتی ہے۔ چونکہ خود جوان ہے۔ اور تمام رنگین طبیعت والے امیرزادے اس سے آشنا ہیں۔ اس لیے سب اس کی خاطر با یدو نشاط اور سامانِ انبساط کے ساتھ آتے ہیں، اور اپنی معشوقاؤں کو ساتھ لاتے ہیں۔ ہر باغ میں، ہر درخت اور ہر پودے کے سائے میں اور چمن کے ہر گوشہ میں رعنا کے پھولوں کی طرح رنگا رنگ خیمے استادہ کرتے ہیں۔ شراب شروع ہو جاتی ہے۔ تمام رات ہر طرف رقص اور ہر طرف سرود ہوتا ہے۔ طرح طرح کے کھانے مہمانوں کے رتبہ کے مطابق اُن کی جگہوں پر پہنچتے ہیں۔ رات شب برات مطلع الانوار کی طرح اور صبح عید ہزار رنگ کی طرح ہوتی ہے ...... مشتہیات اور مرغوباتِ نفسانی میں جس چیز کی خواہش کرو وہاں موجود ہے۔"

مذہب اور عقیدے نے راہ روی کو کس طرح ایک دوسرے میں ضم کر دیا گیا تھا۔ اس کی مکمل تصویر خلد منزل کے عرس میں ملتی ہے۔ نواب لکھتے ہیں: —

"۲۴ محرم الحرام کو عرس مذکور (خلد منزل) ترتیب دیا جاتا ہے۔ خلد منزل کی قبر قطب الاقطاب کے جوار میں ہے۔ مہر پرور جو خلد منزل کی زوجہ ہیں حیات خاں خاطر کے اہتمام سے ایک ماہ پہلے چراغاں بندی کی تزئین و ترتیب کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ چراغوں سے طرح طرح کی شکلیں بنائی جاتی ہیں۔ معمار اور بادشاہ کے ملازم صنعت پیشہ عجیب و غریب تعمیریں کرتے ہیں۔ اور طرح طرح کے ہنر دکھاتے ہیں۔ سرو چراغاں کو اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ چنار کے درخت کی طرح سرو و شمشاد بھی شرم سے جلنے لگتے ہیں۔ اور درختوں کو روشنی سے اس طرح سجاتے ہیں کہ درخت آفتاب کے چراغ کو گل کر دیتا ہے، جو رات کو دو گھڑی تک مطلع کے دریچے سے اپنا سر باہر نہیں نکالتا...... ہر گوشہ اور ہر کنار میں روشنیوں سے بھرے ہوئے جنگلے وادیٔ ایمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ہر گوشہ اور ہر کنار میں لوگ اپنے محبوبوں کی بغل میں ہاتھ ڈالے اور ہر کوچہ و بازار میں عیاش لوگ نفسانی خواہشات سے لبریز برہنہ رقص کرتے پھرتے ہیں۔ مے خوار محتسب سے بے خوف

ہوکر سبزہ ستون کی تلاش میں گھومتے ہیں۔ شہوت پرست کسی بھی مزاحمت سے بے خوف
شاہد پرستی میں سرگرم نظر آتے ہیں۔ نوخط امرد ایسے کہ زاہدوں کی توبہ ٹوٹ جائے۔
عشق بے مثال کے ساتھ ایسا آ ہو کہ صلاح اور نیکی کی بنیادیں ہل جائیں۔۔۔۔ کوچہ
اور بازار نوابوں، شریفوں اور امیروں سے اور گوشہ وکنار شور انگیز امیروں اور
فقیروں سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہاں مطرب و نوالی لکھیوں سے زیادہ اور
محتاج و فقیر مچھروں سے افزوں ہیں۔ القصہ مختصر اس ترتیب وضع وشریعت کے
ساتھ یہ نفسانی خواہشات کا دربار سجایا جاتا ہے۔ اور جسمانی لذتیں حاصل کی جاتی
ہیں۔۔۔۔۔۔

دہلی کے تمام حالات پڑھتے ہوئے یہ نہ بھول جائیے کہ نواب صاحب نے جس دہلی کا مرقع پیش کیا ہے وہ اس دہلی کا ہے جو نادر شاہ جیسے جابر اور ظالم کے ہاتھوں لٹ چکی تھی۔ جس میں ہزاروں بے گناہ انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی تھی۔ قلعہ امیروں اور رئیسوں کے خزانوں سے بے شمار دولت ایران گئی تھی۔ مرقع دہلی میں نادر شاہ کی آمد کے بعد تین سال تک واقعات لکھے گئے ہیں۔ پوری کتاب میں دہلی والوں کی رنگ رلیاں اور ہوس کاریاں دیکھ کر کوئی شخص تصور ہی نہیں کر سکتا کہ دہلی پر اتنا بڑا عذاب بھی آیا تھا۔ نواب صاحب نے صرف دو جگہ نادر شاہ کا ذکر کیا ہے۔ لطیف خاں کے ترجمے میں لکھتے ہیں:۔

(لطیف خاں) کی دولت بادشاہی جھگڑوں کی نذر ہوگئی۔ اس لیے پہلے جیسا ہجوم نہیں
ہے۔ لیکن مخصوص لوگ اب بھی جمع ہوتے ہیں۔ اور رات کا ایک حصہ عیش و عشرت
میں گزارتے ہیں۔ یہ شعر اکثر لطیف خاں کی زبان پر ہوتا ہے۔۔۔۔۔۔

در حریم بزم مستاں دور صبح و شام نیست
گردش جام است اینجا گردش ایام نیست

نواب صاحب نے ایک اور جگہ نادر شاہ کا ذکر کیا ہے۔ کمال بائی نامی ایک طوائف محمد شاہ کے دربار میں ملازم تھی۔ لیکن نادر شاہی حملے کے بعد اسے برطرف کر دیا گیا۔ نواب صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"نادر شاہی حالات کی وجہ سے بادشاہ دین پناہ کا مزاج ساز و نوا سے منحرف ہو گیا
ہے۔ اور ارباب نغمہ کے نغموں کو یک قلم متروک و موقوف کر دیا گیا ہے۔"

اس واقعہ کی تصدیق کسی اور تاریخ سے نہیں ہوتی۔ ممکن ہے محمد شاہ ایسے خونیں حالات کی وجہ سے تائب ہو گیا ہو۔ لیکن اس کے درباری امرا اب بھی باز نہ آئے۔ بقول نواب صاحب اعتماد الدولہ نے بھینسے فیل سوار نامی ایک طوائف کو شراب کے پینے کے جو آلات پیش کیے تھے ان کی قیمت ستر ہزار روپے تھی۔

یہ مزارات، عرس، میلے ٹھیلے، ہوس کاریاں وہ شیش محل تھے، جس پر ایک نہ ایک دن پتھراؤ ہونا تھا۔ جو دہلی میں انگریزی حکومت قائم ہونے پر ہوا۔ وہ دورِ صبح و شام کی تاب نہ لانے والے گردشِ جام سے گردشِ ایام کو رد کرنا چاہتے تھے۔ لیکن

صبح و شام کے تندر کو نہ روک سکے اور گردش ایام کو اپنے قابو میں نہ لا سکے۔ وہ صرف ایک عظیم حکومت کی تاریخ کا آخری باب بن سکتے تھے۔ اور وہ بنے۔ اُن پر مغل تاریخ کا اختتام ہو گیا۔ خود فراموشی کی کوشش میں انھوں نے مذہب کی صورت بھی مسخ کر دی تھی۔ لیکن فسق و فجور کے ان طوفانی تھپیڑوں میں اور اخلاقی زوال کی تاریکیوں میں بھی کچھ انسان ایسے تھے جن کا زندگی کی اعلیٰ قدروں پر ایمان تھا۔ جو صداقت اور سچائی کے خواہاں تھے۔ جن کے پاس ان طوفانوں اور اندھیروں کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن اور سنت تھے۔ خواجہ میر درد، مرزا مظہر جانِ جاناں، مولانا فخر الدین اور اپنی انتہا پسندی کے باوجود شاہ ولی اللہ وہ مصلحین قوم تھے جنھوں نے ہندوستان میں اسلامی سماج کا شیرازہ بکھرنے نہیں دیا۔

محفوظ علی بدایونی

تمکین کاظمی

بدایوں ہندوستان کا وہ خطۂ مردم خیز ہے جہاں سے حضرت نظام الدین اولیا اور ملا عبد القادر عہدِ اکبری کے مشہور مورخ کو نسبت تھی۔ مگر ان دو ہی ہستیوں پر بدایوں کی مردم خیزی ختم نہیں ہوئی۔ اس کا سلسلہ جاری رہا اور اب تک جاری ہے، عبد القدیر، عبد المقتدر، محفوظ علی، فانی، ماہر القادری، پروفیسر ضیا احمد، مولوی قمر الدین احمد، پروفیسر ظہیر احمد جیسے عالم فاضل ادیب پیدا ہوئے اور اب بھی پیدا ہو رہے ہیں۔

میر محفوظ علی بدایوں کے ایک مایۂ ناز فرزند تھے، بدایوں کے زمیندار بڑے پرانے اور شریف النسب ہیں ان میں میر کاظم علی ایک زمیندار تھے جو اپنی آبائی ثروت کے علاوہ اپنی جُز رسی کی وجہ سے بھی خاصے متمول تھے ان کے گھر محفوظ علی نے جنم لیا۔ ابتدائی تعلیم وقت کے قدیم طریقے پر گھر ہی پر ہوئی پھر علیگڈھ کالج میں شریک ہو کر ۱۸۹۰ء میں بی۔ اے کیا، مولوی ظفر علی خاں، مولوی عزیز مرزا، مولوی عبد الحق کا ساتھ رہا، تعلیم سے فارغ ہو کر گھر پہنچے تو نواب خیرپور (سندھ) نے پرائیویٹ سکریٹری بنانا چاہا اور انھوں نے یہ خدمت منظور بھی کر لی اور چند سال تک مصاحبت بھی کی مگر سندھ جیسے خشک مقام اور نواب صاحب کے روکھے پھیکے دربار میں محفوظ علی کی زعفران زار طبیعت کیا لگتی اسی لیے جلد ہی نوکری چھوڑ کر گھر آ گئے مگر گھر آ کر زیادہ بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ حکومت ہند نے برٹش شمالی لینڈ (افریقہ) میں جج بنا کر بھجوا دیا اور ۱۶ نومبر ۱۹۰۲ء کو جہاز منگو لیا سے میر صاحب روانہ ہوئے اسی سفر کا حال میر صاحب نے اپنے ایک مضمون افریقہ کے مسافر میں بڑے دلچسپ پیرائے میں لکھا ہے مگر افریقہ جیسے خشک اور گرم مقام پر میر صاحب کیا بسر کر سکتے تھے چند ہی روز کے بعد بھاگ کھڑے ہوئے اور بمبئی پہنچ کر مولوی ظفر علی خاں کے مہمان ہوئے کیونکہ ظفر علی خاں بھی حیدرآباد کی نوکری سے پریشان ہو کر بمبئی پہنچ کر وہاں سے اپنا رسالہ دکن ریویو نکالنے کی فکر میں تھے، جب میر صاحب بمبئی پہنچ گئے تو شیخ صاحب (ظفر علی خاں) اور میر صاحب نے مل کر تجارت کرنے کا منصوبہ بنایا، اور بڑی کوشش اور وقت سے سوچ بچار کے بعد "اورینٹل کمرشل ایجنسی" کے نام سے ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار شروع کر دیا، جاپان سے ریشم، چین سے برتن، تصویریں، پردے اور افریقہ سے ہاتھی دانت کا سامان، فرانس سے عطریات اور آرائش و زیبائش کی چیزیں غرض جس ملک میں جو اچھی چیزیں تھیں منگوائی گئیں، محفوظ علی کے والد نے اپنی بخالت سے جو دولت جمع کی تھی وہ اس وقت کام آئی اور ایک نوادر خانہ بن گیا، مگر لطف یہ ہے کہ تمام چیزیں دھری کی دھری رہیں فروخت ہونے کا نام ہی نہیں اور خرچہ بدستور ہوتا گیا بالآخر مجبور ہو کر دکان بڑھا دی اور شیخ و سید دونوں مل کر حیدرآباد پہنچے، ظفر علی خاں تو اپنے دفتر ہوم سکریٹریٹ میں جہاں سے رخصت

لے کر گئے تھے پھر جا رہا ہے اور محفوظ علی کو ناظم کوتوالی اضلاع مسٹر ہنکن کے دفتر میں مترجم بننا پڑا۔

ہنکن ایک یورپین عہدہ دار تھے جو پولس کا بڑا تجربہ رکھتے تھے۔ اردو فارسی، اچھی طرح جانتے لکھنے پڑھتے اور بولتے تھے۔ مقامی زبانوں سے بھی واقف تھے اور اردو ادب سے بھی لگاؤ تھا اس لیے انھوں نے محفوظ علی کو اپنی پیشی میں رکھا اور خوب آؤ بھگت کرنے لگے۔

حیدرآباد میں ایک قاعدہ یہ مقرر تھا کہ جو کوئی تقرر حضور نظام کے فرمان کے ذریعہ ہوتا اس کے لیے کسی صداقت نامے کی ضرورت نہ تھی ورنہ جس شخص کا تقرر ہوتا اس کے لیے یہ لازمی تھا کہ ملکی ہو اور تیس سال سے کم عمر کا ہو، صحتِ جسمانی بھی اچھی ہو، چونکہ محفوظ علی کا تقرر ہنکن نے کیا تھا اس لیے صداقت نامۂ عمر اور ملکی کی ضرورت تھی دوسرے صداقت نامے تو میر صاحب نے لا دیئے مگر ملکی صداقت نامہ انھوں نے نہیں دیا کیونکہ اس کے لیے ضروری تھا کہ اپنے آپ کو حیدرآباد میں پیدا ہونے والا بتائیں یا یہ بتائیں کہ بارہ برس سے حیدرآباد میں ہیں، اس قسم کا جھوٹا صداقت نامہ (جسے تکمیل حجت کے لیے مولوی عبدالحق ظفر علی خاں وغیرہ بھی دے چکے تھے) محفوظ علی نے پیش کرنا گوارا نہیں کیا جس کی وجہ سے ان کی تنخواہ کھٹائی میں پڑ گئی اور پھر ہنکن نے سفارش کرکے ان کو اس قاعدہ سے مستثنیٰ کرا کر تنخواہ دلوائی، اسی زمانے میں جبکہ میر صاحب تنخواہ نہ ملنے سے پریشان تھے اور ان کے والد ماجد نے بھی ہزاروں روپیہ بمبئی میں برباد ہونے کی وجہ سے ہاتھ روک لیا تھا، ایک لطیفہ ہوا۔

ان دنوں اکبر الملک کوتوال بلدہ یعنی حیدرآباد کے پولس کمشنر تھے، ان کا تعلق صرف حیدرآباد کی پولس سے تھا اور یہ حضور نظام کے خاص آدمی تھے، ان سے ہنکن صاحب کمشنر پولس اضلاع سے بنتی نہ تھی یہ ایک ہی عہدہ دار تھے جو یورپین آفیسر سے ٹکر لے رہے تھے کیونکہ رزیڈنٹ بھی ان کا دوست تھا، ایک رات، اکبر الملک کی طرف سے ایک عہدہ دار پولس سواری لے کر محفوظ علی کے پاس پہنچا کہ کوتوال صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ بڑے حیران ہوئے کیونکہ ان سے کوتوال صاحب کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ ٹالنا چاہا تو یہ عہدہ دار جبر کرنے لگا اس لیے مجبوراً سواری میں بیٹھ گئے اور اکبر الملک کے پاس پہنچے، اکبر الملک نے انھیں دیکھتے ہی کہا۔

"محفوظ علی صاحب آپ اتنی مدت سے حیدرآباد میں ہیں اور اب تک آپ کو تنخواہ نہیں ملی، ہم ایک اخبار نکالنے والے ہیں۔ اس اخبار کی ایڈیٹری کے لیے ایک آپ جیسے شخص کی ضرورت ہے اگر آپ تیار رہیں تو آپ کو تین سو روپیہ ماہوار تنخواہ دی جائے گی صرف اتنی پابندی کرنی ہوگی کہ میری مقررہ پالیسی پر اخبار نکالنا پڑے گا اگر آپ پیشگی تنخواہ چاہیں تو کل ہی مل سکتی ہے۔

میر محفوظ علی صاحب یہ سُن کر حواس باختہ ہو گئے اور انھوں نے بڑی ہی لجاجت سے عرض کیا" میں ہنکن صاحب کے دفتر میں ملازم ہوں پھر میں بغیر ان کی اجازت کے کس طرح آپ کے اخبار کا کام کر سکتا ہوں" اکبر الملک نے بگڑ کر کہا " ہمیں معلوم ہے کہ آپ ہنکن صاحب کے دفتر میں ملازم ہیں کام کر رہے ہیں مگر تنخواہ آج تک آپ کو نہیں ملی۔ ہنکن صاحب نے کچھ روپیہ آپ کو دینا چاہا تو آپ نے نہیں لیا گھر سے منگوایا تو آپ کے والد نے نہیں بھجوایا آپ خواہ مخواہ نوکر ہیں اور تنخواہ ندارد، کل سے آپ میرے پاس آجائیے تین سو روپیہ کل ہی مل جائے گا اور یہ تنخواہ ہر مہینے ملتی رہے گی" اس کا جواب میر صاحب نے دیا کہ "جناب عالی اگر پسند کریں تو میں ہنکن صاحب سے اجازت لے کر آتا ہوں" یہ سُن کر اکبر الملک گرم ہو گئے کہنے لگے "محفوظ علی! تم ہنکن کو بڑا آدمی سمجھتے ہو میرے نزدیک وہ بڑا آدمی نہیں ہے اور اگر تم اس سے اجازت لے کر آؤ تو میرے لیے کارآمد نہیں رہو گے، تم سمجھتے ہو کہ میں تم سے

ناواقف ہوں تم تو میں خوب جانتا ہوں تمہاری پیدائش کے بعد سے اب تک کے حالات مجھے معلوم ہیں تمہارے وطن اور تمہارے والد کو جانتا ہوں بخوبی واقف ہوں اگر تمہیں شک ہو تو سنا دوں" اب تو میر صاحب کو واقعی چکر آ گیا اور انھوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر کہا۔

"جناب عالی اخفا نہ ہوں میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ عالی جناب ہنکن صاحب کو ایک چٹھی لکھ کر مجھے وہاں سے اجازت دلوا دیں"۔ اکبر الملک نے خفگی سے کہ "چاہیے مجھے آپ کی ضرورت ہے نہ ہنکن کو لکھ کر آپ کو بلوانے کی حاجت ہے" یہ کہہ کر کوتوال صاحب نے تو اجلاس برخاست فرما دیا اور محفوظ علی صاحب بغیر سواری کے سڑک ناپتے ہوئے اندھیری گلیوں میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے گھر پہنچ کر رات بھر پریشان رہے صبح نماز فجر پڑھ کر اٹھے بھی نہ تھے کہ ہنکن صاحب کے پاس کا آدمی آیا کہ صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔ یہ پہنچے تو ہنکن صاحب نے صورت دیکھتے ہی شاباش دی کہ رات تم نے بڑی مردانگی کا کام کیا، میری بات رکھ لی، شاباش۔ محفوظ علی حیران رہ گئے کہ حیدرآباد میں کیسے کیسے جنات ہیں کہ کوئی بات ان سے چھپ نہیں سکتی، غرض چند ہی روز کے بعد منظوری آ گئی اور چڑھی ہوئی تنخواہ بھی مل گئی مگر محفوظ علی کو اس ماحول سے ایک دہشت سی ہو گئی اور چند ہی روز کے بعد وہ مستعفی ہو کر وطن چلے گئے۔

غرض کئی سال محفوظ علی نے حیدرآباد میں بسر کئے اور پولیس میں ملازمت کی، ان کو پولیس کی ملازمت سے سخت نفرت ہو گئی تھی مگر ان کے فرزند ابن علی کو پولیس سے بڑی دلچسپی تھی چنانچہ انھوں نے پولیس میں ملازمت کی اور بہت جلد ترقی کر کے مددگار کوتوال بلدہ ہو گئے تھے اگر اور چند سال رہتے تو ڈی، ایس، پی ہو جاتے مگر ۱۹۴۸ء میں پولیس ایکشن کے بعد ہی انھیں خدمت سے ہٹا دیا گیا اور بے چارے چند سال تک پریشان رہ کر یہاں سے چلے گئے۔

محفوظ علی کے وطن پہنچنے کے بعد ہی ہندوستان کی راجدھانی کلکتہ سے دہلی منتقل ہوئی اور مولانا محمد علی بھی کلکتہ چھوڑ کر دہلی آ گئے اور دہلی سے اردو روزنامہ ہمدرد جاری کیا اس کے لیے محفوظ علی پکڑے گئے مگر یہ مارے باندھے کا سودا تھا۔ جب موقع ملتا یہ وطن بھاگ جاتے۔ اور پھر محمد علی انھیں گرفتار کروا لیتے غرض مدتوں یہی لیل و نہار رہے مولانا محمد علی کے انتقال تک میر صاحب نے ہمدرد سے تعلقات برقرار رکھے اور برابر لکھتے رہے ان تحریرات کا ایک مجموعہ بھی دہلی میں طبع ہو گیا تھا جو میرے پاس محفوظ ہے۔

افسوس ہے کہ میر محفوظ علی کے متعلق کسی نے بھی کچھ نہیں لکھا مشہور ہے کہ قاضی حفیظ الاسلام ہاشمی نے کوئی مقالہ "میر محفوظ علی" نام سے لکھا تھا اور اسے انھوں نے محفوظ علی کے بیٹوں کے ہاتھ بیچنا چاہا مگر ان لوگوں نے خریدا نہیں معلوم نہیں یہ معاملہ کیا ہوا، البتہ میر صاحب کے انیس مضامین کتابی صورت میں "مضامین محفوظ علی" کے نام سے مولوی عبدالحق نے اپنے ایک نفیس مقدمے کے ساتھ انجمن ترقی اردو پاکستان سے شائع کر دیے ہیں جو بڑی کار آمد چیز ہے۔

محفوظ علی کے سنجیدہ مضامین حیدرآباد کے لنگر، ماہوار رسائل پر ریویو، اردو و ہندی، تلون، بدایون کی نمائشیں ہیں۔ افریقہ کا مسافر، انجمن ناظرین زوائج، بلبلان اسیر، مسٹر دین نیم سنجیدہ و نصف مزاحیہ مضامین ہیں میاں ایک تحقیقی مضمون اور تلون ایک نفسیاتی افسانہ ہے، شوہر کا حکارہ اور شیخ سماء اللہ کی صاحبزادیاں بھی نیم مزاحیہ چیزیں ہیں، جو مختلف ماہناموں میں طبع ہوئیں اور بقیہ مضامین وہی ہیں جو ہمدرد دہلی میں مختلف اوقات میں طبع ہوئے۔ غرض یہ مجموعہ لاجواب اور بہت اہم ہے۔

۱۹۲۵ء میں پوپیا سائز کے ۱۹۲ صفحات پر "انتخاب تجاہل عامیانہ" کے نام سے ہمدرد کے ان مضامین کا مجموعہ چھپا ہے جو میر محفوظ علی نے لکھے تھے اور عام طور پر پسند کیے جاتے تھے۔ معلوم نہیں یہ مجموعہ عبدالحق صاحب کو نہیں ملا یا انھوں نے اس انتخاب میں سے بھی انتخاب کیا ہے کہ چند مضامین مجموعۂ مضامین محفوظ علی میں جگہ پانے سے رہ گئے۔ ان کی صراحت اس لیے کر دیتا ہوں کہ آئندہ کبھی اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن طبع ہونے لگے تو انھیں شریک کر دیا جائے ورنہ یہ نایاب تو ہیں ہی ضائع ہو جائیں گے۔

"انتخاب تجاہل عامیانہ" میں مقدمہ یا دیباچہ "حاجی صاحب کی پہلی تحریک" کے عنوان سے اس طرح شروع ہوا ہے۔

"تجاہل، جہالت، بے وقوفی، بے خبری، بیہوشی یا محض سادہ لوحی جو کچھ انسان کی بہترین فطرت اور بہترین تقاضائے انسانیت ہے، کیا معنی کہ سب سے پہلا خطاب جو خلعت انسانی کے ساتھ اسے عطا ہوا وہ "ظلوم" اور "جہول" کا تھا لہٰذا اگر یہ صفتِ ضروری کسی وقت بھی اس سے منفک ہو جائے تو درجۂ انسانیت سے وہ بے تکان گر پڑتا ہے اور تاوقتیکہ اپنی جہالت کا صدق دل سے اقرار نہ کرے دوبارہ جسم نامی، متحرک بالارادہ، مستقیم القامت، ماشی علی قدمیہ، ضاحک بالنخامتہ، کاتب بالقوے کا اطلاق اس پر صادق نہیں آسکتا۔ بنا بریں خیالات ہم بلا خوف تردید مدعی ہیں اور تمام دنیا کو مدعا علیہ نمبر ۱ گردانتے ہیں۔ مدعا علیہ نمبر ۲ ابھی تک کوئی قرار نہیں پایا ہے کہ ہماری "انجمن تجاہل عامیانہ" اس وقت سے قائم ہے جب کہ عالم علوی و سفلی کے درمیان کوئی حجاب حائل نہ تھا اور اس خاکدانِ عنصری نے اول اول شکل ہیولائی اختیار کی تھی، یہ انجمن اس وقت بھی موجود تھی جب حضرت آدم نے شیطان کے چکمے میں آکر شجر ممنوع کا پھل کھا لیا تھا اور جہالت کے صلہ میں چھ کروڑ ستر لاکھ مربع میل زمین بلا شرکت غیرے دے بیٹے اور اخلاف اعقاب پشتہا پشت کے لیے دائمی معافی پائی تھی، اس انجمن کا وجود اس وقت بھی تھا جبکہ حکمائے یونان نے ثابت کیا تھا کہ آسمان نو ہیں اور باوجود اس کے آٹھ آسمان مغرب سے مشرق کو گردش کرتے ہیں اور فلک اطلس سب کو گھسیٹ کر لے کے گھما دیتا ہے اور ناک پکڑ کر پورب سے پچھم کو چکر دے دیتا ہے اور اس وقت بھی تھا جب نیوٹن زمین پر سیب کے گرنے سے گھبرا گیا اور ڈارون نے کہا کہ انسان بوزنہ ہے، غرض کہ ہماری انجمن روز ازل سے بجنسہٖ قائم ہے اور جب تک انسانی مسکن، یعنی مٹی کا ڈھیلا جس کا سیدھا سادہ عام فہم مختصر سا نام "تودۂ غبرائے غاسق" ہے اور جسے علمی اصطلاح میں زمین کہتے ہیں، سورج کے گرد مشق رقص کرتا رہے گا یا آفتاب اپنے مستقر کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں کبھی "عقد پروین" کبھی "نسر واقع" کی طرف دوڑتا پھرے گا اور خواہ اپنی منزل گاہ کے پانے میں وہ کامیاب ہو یا نہ ہو، انسانی جہالت میں کوئی فرق نہیں آئے گا ان شاء اللہ تعالیٰ اور ہماری انجمن بھی قائم رہے گی"

"یوں تو ہم صفیر انجمنیں مثلاً جہل مرکب علیگڈھ اور "گپ" "کامریڈ" میں غرض کہ اطراف و اکناف عالم میں پھیلی ہوئی تھیں، لیکن خاص وجوہ سے اس کی کارروائیاں اصول تدبر کے مطابق اب تک صیغہ راز میں رکھی جاتی تھیں اور عوام الناس کو اس کے اغراض مقاصد کا علم نہ تھا، اب چونکہ حماقت گاہ دنیا بڑے بڑے لوگوں سے خالی ہونے لگی ہے اور عام لوگوں نے کارخانۂ عالم کے مخفی نکات کو نظر تعمق سے دیکھنا کم کر دیا ہے لہٰذا بہ اتفاق جمہوریہ طے کر لیا گیا کہ انجمن اپنے خیالات اور آرا سے جو سرتاسر "جذبات عقلیہ" پر مبنی ہیں لوگوں کو آگاہ کرے، خدا کی مخلوق کو سیدھے راستے پر چلنا سکھلائے اور بھٹکی ہوئی بھیڑوں کو بلا تامل پکڑ پکڑ کر گلے میں داخل کرنا شروع کر دے، کیا معنی کہ ہر چھوٹے بڑے، بچے بوڑھے، پیر فرتوت، جوان صالح اور جملہ اقوام عالم مثلاً ہندو، مسلمان، عیسائی، انگریز، دھوبی، خانساماں، بیرا، بھنگی، بہشتی اور ان لوگوں کو جو بڑے بڑے عہدوں پر ہوں مثلاً کلکٹر کمشنر لاٹ گورنر بلکہ تحصیل کے

چپراسی تک کو بلا فیس معقول مشورے دے اور لوگوں کو صنعت و حرفت کا شوق بھی دلائے اور تجارت و زراعت کی ترقی پر خوب غور کرے۔ اور بتائے کہ لوگ خان بہادر کیسے بنتے ہیں اور شملہ پر ڈیپوٹیشن کیسے لے جاتا ہے اور جو کوئی پیش یا افتادہ مسئلہ پیش آئے اس پر بلا تکلف صلاح دے۔ اور تمام معاملات ملکی و عالی و اندرونی و بیرونی و اقتصادی و سیاسی و افواہ سر ایڈورڈ گرے و مسٹر اسکوتھ و لارڈ ہارڈنگ و گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل و سر جیمس مسٹن و سر ٹاگر صاحبان بہادر اور جتنے ملک کے حاکم ہیں سب کے متعلق اپنی جداگانہ رائے محفوظ رکھے بلکہ ضرورت ہو تو قبل از وقت شائع کر دے۔"

پس اس حالت میں ہم کو یقین ہے کہ ملک اور قوم ہماری نیک دل گورنمنٹ و لیجسلیٹو کونسل آف انڈیا اور سیکرٹری آف اسٹیٹ اور سر تھیوڈور ماریسن جو سابق میں علیگڈھ کالج کے پرنسپل تھے اور انڈین نیشنل کانگریس اور لندن مسلم لیگ اور ناگری پرچارنی سبھا اور تمام لیڈران قوم اور وہ لوگ جن کو لاٹ صاحب نے منع کیا ہے کہ دور بیٹھ کر ملک میں شورش نہ پھیلائیں ہر ملک، اور ہر طبقہ کے ہماری دلیلوں پر غور کریں گے اور ممکن ہو تو عمل بھی کریں گے ورنہ دہ جائیں ان کا کام جانے کسی شاعر نے کہا ہے ؎

زسعدی ہمیں یک سخن یاد دار ۔۔۔ کہ دنیا بود دیر نا پائدار

عاصی بلغ العلیٰ المکنیٰ بہ ابی الغول والشہیر بہ حاجی بغلول (بواو معروف)
حجازی الہندی ثم الکہنہ، واردحال دہلی کوچہ چیلان جہاں مومن خاں مرحوم
آب حیات میں رہتے تھے۔

اس کے بعد کے مضمون کا عنوان ہے "دہلی میں پہلا جلسہ" جو نقل کیا جاتا ہے۔

"آج بتاریخ ۷ ماہ ستمبر ۱۹۱۳ء بروز شنبہ بوقت ۸ بجے دن بہ ساعت مریخ اندر مکان واقعہ کوچہ چیلان من مضافات شاہجہان آباد (جب نیا شہر آباد ہو جائے گا تو خارج آباد کہیں گے بالفعل پرانے ہی نام سے یاد کیا جاتا ہے) بکصد و دوازدہ درجہ و بیست دہ دقیقہ عرض البلد و بست و ہشت درجہ و یازدہ دقیقہ طول البلد (ماخوذ از غیاث اللغات مصنفہ ملا غیاث الدین صاحب رامپوری جہاں شوکت علی صاحب وغیرہ رہتے ہیں) ملک ہندوستان اقلیم سوم بر اعظم ایشیا نصف کرہ شرقی تودۂ غبرائے غاسق سیارۂ سوم منجملہ نظام شمسی (امید ہے کہ ناظرین کو مکان کا صحیح پتہ معلوم ہو گیا ہوگا) غیر معمولی جلسہ انجمن مذکور زیر صدارت جناب صدر انجمن صاحب یعنی حاجی بلغ العلیٰ صاحب المکنیٰ بابی الغول والشہیر بہ حاجی بغلول بعد دوپہر منعقد ہوا (اس لیے کہ دو گھنٹے ممبروں کے انتظار میں گزر گئے) جناب حاجی صاحب قبلہ موصوف الصدر نے مضمون نوشتۂ خاص بعنوان ضرورت اجرائے اخبار پڑھ کر سنایا، جو بجنسہٖ برائے ملاحظہ جناب صدر برائے تشہیر و اشتہار بذریعہ اخبار ہذا رد و عرف کا مریڈ وغیرہ بھیجا جاتا ہے۔ جناب ایڈیٹر صاحب ضرور چھاپئے گا ورنہ شکایت رہے گی۔"

وھوھذا

کیا نام کہ سب لوگوں کا اخبار ضبط ہو گیا، ملک میں کھلبلی مچی ہوئی ہے لوگوں کو اخبار پڑھنے کو نہیں ملتا، لہٰذا ہم خود اپنا ایک اخبار نکالیں گے جس میں تمام معاملات ماضی و مستقبل بیان کئے جائیں گے اور لوگوں کو بارہ بارہ چوبیس سال ماقبل و مابعد کے تمام واقعات روزانہ بتائے جائیں گے بلکہ ممکن ہوا تو ایک روز قبل چھاپ دیئے جائیں گے، جس طرح کیا نام کہ بڑے بڑے اخبار

ولایت یورپ و لندن، لاہور، جرمنی، پیرس و دہلی امریکہ و جاپان و قسطنطنیہ وغیرہ میں پہنچتے ہیں اور روز روز کی خبریں چھاپی جائیں گی اس لیے تمام حکام ضلع و ممبران پارلیمنٹ و چوکیداران پولس و محرران دفتر رجسٹری و صیغۂ مال و بورڈ آف ریونیو و محکمہ جات نہر و آب پاشی و ڈاکخانہ و ریلوے و کنٹونمنٹ و عملہ قانون گویان حلقہ و پٹواریان و یہ حتیٰ کہ الہ آباد کے لاٹ صاحب جو اب جہاز پر ولایت چلے جا رہے ہیں سنتے ہوں گے کہ اس سے ملک میں شورش پہنچتی ہے پھر ہمارا بھی اخبار ضبط ہو جائے گا تو کوئی کیا کر لیگا۔ اور اس اخبار کے ذریعہ دور بیٹھ کر شورش نہیں مچائی جائے گی بلکہ ممکن ہو گا تو گورنمنٹ سے تمام حقوق بذریعہ خانساماؤں اور بیروں کے بطور خود مانگ لیے جایا کریں گے، وہ آپ دے دے گی، پھر اخبار میں لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور اگر نہ دے گی تو ہم لوگ صبر کر لیں گے، اس لیے کہ صبر کے بڑے درجے ہیں جس کے معاوضے میں میٹھے میٹھے پھل از قسم انگور وغیرہ بعد کو دستیاب ہوتے ہیں بقول شاعر ۔

صبر تلخ است ولیکن بر شیریں دارد!

اور ممکن ہوا تو تمام حقوق اسٹیٹ خطابات کی صورت میں لے لیں گے، اس لیے کہ اس میں سرکار کا کوئی نقصان نہیں اور نہ ہمارا ہی کوئی فائدہ ہے، بلکہ ایک طرح سے فریقین کے مفید مطلب بھی ہے لیکن اس میں پبلک کو ہم سے بدگمان ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے، اس لیے کہ خطاب سے کہ ہم کچھ اپنے گھر میں تھوڑا ہی رکھ لیتے ہیں، خطاب تو لوگوں ہی کی زبان پر ہوتا ہے پھر اس میں خطاب پانے والے کا کیا قصور، جو لوگ اس کو برا کہتے ہیں، اس مسئلہ پر تحقیقی بحث جب ہمارا اخبار جاری ہو گا تو خوب دل کھول کر کریں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ خان بہادروں کو برا نہ کہیں بلکہ ممکن ہو تو تعریف کریں اس لیے کہ صاحب لوگ ان سے خوش رہتے ہیں اور اپنے ساتھ میز کرسی وغیرہ پر بٹھاتے ہیں اور کھانا بھی کھلاتے ہیں جس کو انگریزی میں ڈنر کہتے ہیں بس ثابت ہو گیا کہ وفاداری بہت عمدہ چیز ہے، چنانچہ اکثر بزرگوں نے اپنی اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ ۔

بود بے وفائی سرشت زناں

میاموز کردار زشت زناں

لہٰذا ہر ایک کو چاہیئے کہ وفادار بننے کی کوشش کرے اور نہ بن سکے تو لائل مسلم ایسوسی ایشن بمبئی کا ممبر ہی بن جائے اس لیے کہ وفاداری کو انگریزی میں کہتے ہیں لائلٹی جس سے لفظ لائل نکلا ہے اور لالٹین بھی بہ قاعدہ فارسی صرف و نحو اسی سے مشتق ہے، اس لیے کہ روشنی بہت صاف ہوتی ہے اور آندھی سے گل بھی نہیں ہوتی پھر پانیر بھی اس کی تعریف کر دے گا اور سرکار بھی نہیں پوچھے گی کہ تم کیوں وفادار نہیں بنتا"

ایک اور بات ہم اپنے اخبار میں بیان کریں گے یعنی ہندو مسلمانوں کو مل جانا چاہیئے اور لوگوں کو ولایت دوڑ دوڑ کر نہیں جانا چاہیئے، اس لیے کہ جو صاحب لوگ ان کے بعد ولایت جانے والے ہوتے ہیں وہ برا مانتے ہیں بلکہ گھبرا جاتے ہیں اور لوگوں کا اخبار ضبط کر لیتے ہیں لیکن اس میں اخبار والوں کی کوئی خطا نہیں ہے بلکہ حاکم لوگوں کی سمجھ کا پھیر ہے۔ تھوڑے دنوں میں آپ سمجھ جائیں گے پھر کسی کا مضمون نہیں پوچھیں گے اور نہ "کہو اللہ اکبر" وغیرہ کو ضبط کریں گے، اس وقت ہم بھی اپنا اخبار نکالیں گے۔ پھر خوب لطف ہو گا۔"

"راقم حاجی بغلول جن کو لوگ بلغ العلیٰ بھی کہتے ہیں مقام کوچۂ چیلان سے ہمدرد پریس کے لیے لکھا بقلم خاص۔
اگر کسے دعویٰ کند باطل گردد،

مکرر آنکہ اخبار مذکور جو ہم نکالنے والے ہیں اس کے مدیر مسئول اور محرر خصوصی بھی ہم ہی ہوں گے بلکہ اگر ممکن ہوا تو مراسلات وغیرہ بھی کبھی کبھی لکھیں گے اور شائع بھی ہم ہی کریں گے کیا معنی کہ ایڈیٹری وغیرہ کے تمام فرائض اور ذمہ داریاں لینے کو تیار ہیں۔ لوگ ہمارا اخبار ضرور دیکھیں فقط حاجی بغلول حجازی ثم الکھنوی وارد حال دہلی ' والسلام"

ایک اور مضمون "خفیہ جلسہ کا اعلان" بھی اسی مجموعہ میں ہے جو مضامین محفوظ علی مرتبہ انجمن ترقی اردو میں شریک نہیں ہے۔

خفیہ جلسہ کا اعلان

"کیا نام کہ کانپور میں واقعہ ہائلہ ہو گیا جس کی وجہ سے حاکم لوگ مسلمانوں سے بہت خفا ہیں پس اس لیے ہم ایک خفیہ جلسہ کرنے والے ہیں جس میں بڑے بڑے والیان ملک واسسٹنٹ ایڈیٹران بعضے اخبارات..... وچند تعلقداران اودھ وخطاب یافتگان سرکار کمپنی بہادر چودھریاں محلہ وحاجیان ونوابان صوبجات متحدہ آگرہ واودھ وممبران کونسل حضور لاٹ صاحب بہادر جو کیا نام کہ ان جانب سے منتخب ہیں مدعو کئے جائیں گے اور مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ از سر نو کیا جائے گا اور ممکن ہوا تو جو لوگ ولایت جایا کرتے ہیں ان کی مخالفت بھی کی جائے گی اور کانپور کی مسجد کا حصہ منہدمہ یعنی وہ حصہ جو سرکار نے گرا دیا ہے اور جس کے بیے لوگ ایجی ٹیشن کرتے ہیں جس کو ہماری زبان میں شورش کہتے ہیں سرکار سے واپس لے کر پھر اس کو دے دیں گے اور کیا نام کہ اس کے معاوضے میں ہر چہار طرف ایک وسیع حصہ زمین کا مع چند خطابات کے حاصل کیا جائے گا اور ایک خوشنما اور عالیشان مسجد کیا نام کہ سینٹ پال کے گرجا کے نمونے کی تعمیر کی جائے گی جس کے نیچے لوگ راستہ چلیں گے اور بیچ کے حصہ میں مسلمان نماز پڑھیں گے اور چھت پر سے اگر ممکن ہوا تو ٹرام گاڑی کی سڑک بھی نکالی جائے گی جس کو دیکھ کر لوگ تعجب کریں گے اور کیا عجب کہ اللہ میاں بھی خوش ہو جائیں لیکن کیا نام کہ یہ تمام کارروائی خفیہ کی جائے گی اور کسی ادب ناشناس، زبان کے ٹرسے، آزادی پسند ملک میں شورش پھیلانے والے یا ان لوگوں کو جنھوں نے کانپور کے لیے چندہ جمع کیا ہے یا وہاں کے ملزموں کی پیروی کی ہے یا اخبار ہمدرد وغیرہ میں مضامین لکھے ہیں مجاز نہیں ہوگا کہ ہمارے درمیان میں دخل دے یا کسی قسم کا اعتراض معقول یا نامعقول از قسم دلائل قانونی وحجت بنگالہ وبرہان مسلم یا ثبوت دعویٰ یا ابطال نقیض یا اور کوئی دلیل عقلی یا نقلی جلیّۃً صراحتاً اشارتاً کنایتاً استعارتاً، تلمیحاً، تقدیراً یا کسی اور الف دو زبر اً طریقہ پر پیش کرے ورنہ کیا نام کہ ہم بندہ حاجی بغلول بشرط امکان مع جناب صدر انجمن کے جلسہ چھوڑ کر جدھر سینگ سمائیں گے چلے جائیں گے اور شملہ ونینی تال وکوہ ہمالیہ وبند ہیاچل ودارجلنگ وماؤنٹ آبو ومغربی ومشرقی گھاٹ وکوہ آدم وست پڑا وغیرہ پر جہاں جہاں صاحب لوگ گرمیوں کے موسم میں ہوا کھانے جاتے یا ہوٹل وغیرہ کرایہ پر لے کر رہتے ہیں جا کر مسلمانوں کی شکایت کر دیں گے پھر ہمارے اوپر کسی قسم کا الزام نہیں اس لیے کہ کیا نام کہ ہم حاجی ہیں اور تمام مقدس مقامات کی زیارت کر آئے ہیں، اور باوجود کوٹ وپتلون وہیٹ وغیرہ کے اس کے اندر ایک حج کیا ہوا جسم رکھتے ہیں، پس ہم کو مسجد کے معاملہ میں ہر قسم کی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے اور ہم دلویوں کے فتویٰ کے خلاف بھی کر سکتے ہیں۔ بلکہ

کیا نام کہ ہمارے پاس ایسے ایسے مولوی بھی موجود ہیں جن کی معرفت مسجد گروا بھی سکتے ہیں، ضروری بیان کر گزارش کیا واللہ اعلم بالصواب

راقم آثم بندہ حاجی بغلول محرک جلسہ خفیہ واقع شہر دہلی

مکرر آنکہ اگر کسی خفیہ نامہ نگار نے ہمارے خلاف کچھ لکھا تو ہم اسے اپنے اخبار وغیرہ کی معرفت ڈٹوائیں گے اور جھوٹا ثابت کرنے کی کوشش کریں گے پھر ہم ذمہ دار نہیں ہوں گے،

بندہ حاجی بغلول، از مقام دہلی کوچہ چیلاں جہاں کا مربٹ وغیرہ چھپتا ہے

حاجی صاحب کی ایک لطیف تقریر بھی اس مجموعہ میں موجود ہے جو مضامین محفوظ علی میں شریک نہ ہو سکی اس میں حاجی صاحب کی نظم کا نمونہ بھی ہے۔

حاجی صاحب کی تقریر

تجاہل عامیانہ کانفرنس میں

"حضرات! کیا نام کہ سب سے پہلے میں آپ حضرات کو ایک نظم سناؤں گا جس کے مصنف ہم آپ خود بلا شرکت غیرے ہیں اور جو شکر ہے کہ دماغ سے چوری نہیں گئی

نظم

کچھ عقل کا حث انے عجب مول کر دیا ۔۔۔ اوروں کو ڈھیر ہوں تو مجھے تول کر دیا

پہلے تو لوگ کہتے تھے چپٹی ہے یہ زمیں ۔۔۔ سنتے ہیں آج کل کہ اسے گول کر دیا

تعلیم مکتبوں میں ہمیں مفت ملتی تھی ۔۔۔ یونیورسٹی نے اس کو بھی انمول کر دیا

بائغ الکھنے تھا نام مرا اس کو دیکھئے ۔۔۔ اتنا مروڑا یاروں نے بغلول کر دیا

اما بعدہ، کہتا ہے یہ حقیر فقیر پُر تقصیر کیا نام کہ شیخ فردوسی اپنی کتاب گلستان میں لکھ گئے ہیں ؎

چو شمع از پئے علم باید گداخت

کہ بے علم نتواں خدارا شناخت

کیا معنی کہ مسلمانوں کو آج کل علم کی بڑی ضرورت ہے، پس اس لیے ہر ایک کو چاہئے کہ علم سیکھے مثلاً علم انگریزی، علم عربی و فارسی و علم اردو و بنگالی، و مرہٹی و گجراتی اخبارات کا ترجمہ و علم پنجابی و پشتو جس کو سرحد پر بولتے ہیں و فرانسیسی و جاپانی و روسی و ترکی وغیرہ۔ مجھ سے کہو تو سارا دن علم گنواتا رہوں۔ نہیں کہتے کہ "علم دریاؤ" ہے پس غنا چاہو اس دریا میں غوطہ لگاؤ مگر ممکن نہیں کہ تاہ پاؤ مثل مشہور ہے کہ حاصل کرو علم کو اگرچہ ہو ملک چین میں اور نہ صرف ملک چین میں بلکہ جن جن ممالک میں ہو مثلاً ممالک لندن و پیرس و فرانس و اسپین و ممالک کیپ و شمال و جنوبی افریقہ جہاں ہندوستانی شادی نہیں کرنے پاتے و گلاسکو و ڈونڈی و لیورپول و مانچسٹر کار جین و جاوا سماٹرا و کمپس کٹکا و کوریا و مجورِیا و جزائر خشکی و تری و عبور دریائے شور جس کو کیا نام کہ کالا پانی کہتے ہیں و سیلون عرف لنکا و سراندیپ و رنگون و برہما و قسطنطنیہ و کربلائے معلیٰ و ملک عرب جہاں حج کیا جاتا ہے اور لاہور جہاں حکیم لوگ اشتہار چھاپا کرتے ہیں و لکھنؤ و کانپور جہاں واقعۂ ہائلہ ہو گیا تھا و شمال مشرقی سرحد و چین و جاپان و علی گڑھ کالج جہاں صیغۂ راز واقع ہے پس لوگوں کو چاہئے کہ

خوب علم حاصل کریں اور اگر ممکن ہو تو یورپ سے بحساب سود در سود مع متی کامل و قواعد اربعہ متناسبہ جو حساب اقلیدس میں درج ہوں۔ وصول کریں اور اگر نہ وصول ہو تو بذریعۂ قرقی و سرسری و دیوانی و عدالت مال و فوجداری وغیرہ کی کوشش کرنا چاہیے، اس لیے کہ علم بڑی چیز ہے اگر روئے زمین پر کہیں نہ مل سکے تو اس کے لیے آسمان پر بھی جانے میں کوئی ہرج نہیں بلکہ گونہ فائدہ ہے جیسے کہتے ہیں کہ ؎

تو کار زمیں را نکو ساختی
کہ بر آسماں نیز پرداختی

بس دیکھ لیا سرکاری یونیورسٹی کو بالکل ناکارہ ہیں، دینیات کا کوئی انتظام نہیں، روزہ نماز سے کچھ کام نہیں، ابھی طالب علموں سے پوچھو کہ حج کس طرح کیا جاتا ہے تو بس ناحال کہلا جاتا ہے، بڑے بڑے پڑھے انگریزی کے پروفیسر کو وضو کرنا تک نہیں آتا ہے، میں کہتا ہوں کہ اپنی علیحدہ یونیورسٹی بناؤ اور اس میں پڑھاؤ دینیات اور نہ صرف دینیات بلکہ الٰہیات و طبیعیات و ارضیات و سماویات و معدنیات و اقتصادیات و واہیات و خرافات و تجارت و زراعت، و لارپورٹ و شاعری و نثاری و ضلع جگت و رعایت لفظی و معنوی و قواعد ڈاک خانہ و شرح برآورد تخواہ جسے کہ منشی رحمت اللہ رعد اپنی جنتری میں ہر سال تصنیف کیا کرتے ہیں، قواعد صرف و نحو و رسالہ اصول حساب و عروض و قافیہ و پند نامہ حکیم لقمان و فردوس نامہ رنگین و دستور الصبیان لانہ نوز را ئے، ان تمام علوم و فنون کا پڑھنا نہایت ضروری و لابدی ہے"

"پس بھائی مسلمانوں کیوں سست پڑے ہو، کمر ہمت باندھ کر کھڑے ہو خدا کے فضل سے تم میں کسی بات کی کمی نہیں بڑے بڑے لوگ موجود ہیں، مثلاً نواب وقار الملک، مسٹر مظہر الحق و مسٹر علی امام میاں محمد شفیع جن کے گھر میں مسلم لیگ بھی ہے و لائل مسلم ایسوسی ایشن صاحب جو پائیر میں تار چھپا کرتے ہیں و محمد علی و شوکت علی و خدام کعبہ و کامریڈ و ہمدرد و وکیل و وطن و زمیندار و مسلم گزٹ مرحوم جس کا جنازہ نکلا تھا و الہلال و پیسہ اخبار اور نواب اسحاق خاں جو حاجی بھی ہیں اور انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں مبارکباد کے تار چھپواتے ہیں و تہذیب النسوان و خاتون و شیخ عبداللہ و صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو کانفرنس میں لکچر دیتے ہیں و نواب نزل اللہ خاں و نواب سربلند جنگ و مسٹر رضا علی جو خفیہ جلسوں میں لڑا کرتے ہیں اور راجہ صاحب محمود آباد و نظام حیدر آباد و نواب عبدالمجید و امام صاحب جامع مسجد جو نیکی کر کے دریا میں ڈالتے ہیں کیا معنی کہ مسلمانوں کی مدد کر کے چھپا ڈالتے ہیں و علماء دیوبند و فرنگی محل و ندوۃ العلماء، مولانا شبلی، مولانا حالی وغیرہ غرضکہ کن کن کا نام گنواؤں تمام ملک لیڈروں سے بھرا پڑا ہے جیسا کہ یہ ناچیز آپ لوگوں کے سامنے کھڑا ہے۔"

"پس ثابت ہو گیا کہ یونیورسٹی بہت ضروری ہے اور بغیر اس کے ہماری تعلیم ادھوری ہے ہر ایک کو چاہیئے کہ اس میں دل کھول کر چندہ دے اس لیے کیا نام کہ اگر دنیا میں یونیورسٹی نہ بھی ملی تو عاقبت میں ستر یونیورسٹیوں کا ثواب ہو گا، زیادہ حد ادب۔ فقط
والسلام علیٰ من اتبع الہدیٰ"

"مکرر آنکہ مذکورہ بالا اسپیچ ہم نے اپنے پرائیویٹ سیکرٹری شیخ چلی کی معرفت لکھوائی ہے اگر کچھ غلطی رہ گئی ہو تو ان سے بازپرس کی جائے ہم کو اس سے کچھ سروکار نہیں وہ جانیں ان کا کام جانے لہٰذا یہ دست برداری لکھ دی کہ وقت پر کام آوے"

راقم آثم بندہ حاجی بلغ العلیٰ صاحب جن کو لوگ کیا نام کہ بغلول بھی کہتے ہیں، از مقام کوچۂ چیلان
جہاں سید صاحب کے مکان میں خدام کعبہ صاحب رہتے ہیں۔

محفوظ علی نے ہمدرد میں حاجی صاحب، حاجی بلغ العلیٰ بغلول اور ملا علی بو، جاموٹی کئی ناموں سے لکھا ہے، بعض دفعہ تو حاجی بغلول

کے نام سے ملا علی بودھاموی کو مخاطب کیا ہے اس کی وجہ دہ خود جانتے ہوں گے ہماری سمجھ میں تو نہیں آئی بلکہ اکثر لوگوں نے حاجی بغلول کو الگ اور ملا علی کو جدا سمجھا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں محفوظ علی ہی کے دو روپ تھے چنانچہ ایک ایسا ہی خط مجموعہ سے نقل کرتا ہوں۔

(حاجی صاحب کا ایک خط)

جناب ملا علی بودھاموی صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ چونکہ آج کل مسلمانوں کو لیڈری کی ضرورت ہے فلہذا تم کو بذریعہ تحریر ہذا مطلع کرتے ہیں کہ مسودہ قانون ایکٹ لیڈری مثل قانون ہائے برٹش انڈیا یعنی تعزیرات ہند جس کے ذریعے سے چور پکڑے جاتے ہیں اور پھانسی ملتی ہے و شرح ایکٹ لگان و ضابطہ دیوانی و ضابطہ فوجداری و قوانین نافذہ وغیرہ نافذ ایکٹ ہائے منسوخ شدہ و غیر منسوخ شدہ دیجر یہ ۱۸۶۰ء و قانون مطابع ہند جس کی رو سے کتاب ضبط ہوتی ہے اور اخباروں سے ضمانت طلب ہوتی ہے وغیرہ مرتب ہوئے تجاویز عامیانہ کی گورنمنٹ میں پیش کرو تاکہ آئندہ موسم بہار میں ہم لوگ لیڈر کہلانے کے مستحق ہو جائیں اور دوسروں کو منع کر دیں کہ ایسا نہ کریں یا جیسا تم مناسب سمجھو اس لیے کہ اخبارات آج کل لڑتے ہیں کہ لیڈر کون ہیں کیا معنی کہ ایک صاحب جو ولایت گئے ہوئے ہیں وہ سرا ہیڈ ور ڈ گرے سے ملے تھے مگر لوگ ان کو لیڈر نہیں کہتے۔ اس لیے اخبار "بول بیاہ" جو تم لوگوں کا خیر خواہ ہے رہ بیٹھ گیا ہے پس ہمارا فرض ہے کہ قانون ایکٹ لیڈری کے ذریعہ سے اس کی اشک شوئی کر دیں اور فریقین میں صلح مصالحت کرا کے راضی نامہ لکھوا دیں تاکہ آئندہ خطرہ نقض امن کا باقی نہ رہے والسلام فقط

حاجی بغلول

"جلد جواب آنا چاہیے ورنہ شکایت۔ رہے گی اور کیا عجب کہ ہم قیامت میں دامنگیر ہوں"

میرے مجموعہ میں "تازہ واردات" کے عنوان سے لالہ خوش وقت رائے کا ایک خط اور ایک نظم بھی ہے جسے نقل کرتا ہوں۔

جناب حاجی صاحب قدردان دوستان سلامت!

بعد آداب مخلصانہ و کورنشات نیازمندانہ کے گزارش خدمت شفیق ورحمت میں یہ ہے کہ اعلان و اشتہار بابت اجرا اخبار مسمّے "البعیر" بروزن البشیر نیازمند کی نظر سے گذرا از حد خوشی و مسرت حاصل شد، اگر برائے یک شب آں جناب فیض انتساب مشاغل روزمرہ سے سبکدوشی حاصل کر کے رونق فزائے غریب خانہ ہوں تو عین ذرہ نوازی ہے۔ فدوی لالہ خوش وقت رائے از مقام دریا باد ضلع بارہ بنکی از لالہ خوش وقت رائے صاحب المتخلص بہ لا آنہ سابق خوشنویس نولکشور پریس حال مقیم دریا باد ضلع بارہ بنکی ملک اودھ۔

نظم

بھی ہے فارسی ناپید اس انگریزی فوان ماں ۔۔۔ کر دیا مامقیما کے۔۔۔ نہیں بکتے دکانن ماں
یہ پاپوٹے، یہ بر کوٹے، یہ بر سر سرخ سرپوشے ۔۔۔ یہی پوشاک رائج ہو گئی ہے نوجوانن ماں
غضب ایشور کا دیکھو ہو گئیں پردہ سے آزردہ ۔۔۔ للائن یوں کہت ہیں ہم نہیں ٹھہرت مکانن ماں
حکیمن کے یہاں اب ریگ ماہی ہو گئی معدوم ۔۔۔ بکرڈ پوشیدہ غیچن کا بھرن ہیں مرتبانن ماں
نہ پوچھو حال کچھ یونیورسٹی کی زشت خوئی کا ۔۔۔ پسر کو چک ہمارہ فیل ہوئے گا امتحانن ماں
جو ہو دنیا مخالف تو نہیں غم ہم کا کچھ لا آنہ ۔۔۔ کہ ہیں بغلول حاجی جی ہمارے مہربانن ماں

روزمرہ لایق ملاحظہ و قابل غور ہے (بخط لالہ صاحب)

جہاں تک مجھے معلوم ہے حاجی بغلول اور ملا علی دونوں ناموں سے محفوظ علی ہی لکھا کرتے تھے اس لیے بغلول والے مضامین بھی مضامین محفوظ علی میں جگہ پانے کے قابل تھے جس وقت یہ مجموعہ طبع ہو رہا تھا اس کے سرورق کے چوتھے صفحہ پر ایک قطعہ چار شعر کا لکھوایا گیا تھا مگر میرے پاس جو مجموعہ محفوظ ہے اس کا سرورق ہی نہیں ہے معلوم نہیں مجھے بغیر سرورق کے ملا تھا یا مجلد بنتے ہوئے جلد ساز نے ضائع کر دیا، وہ قطعہ اس طرح تھا ؎

ڈنمارک کی قندیل .... حاجی
.... کی مشین گن ظرافت حاجی
کیا نام کہ ہوتا ہے جہاں سے رخصت
واللہ کہ ہے قابل زیارت حاجی

پینتیس سال پہلے یہ قطعہ میں نے کتابت کے مراحل طے کرتے ہوئے اور پھر پروف کی شکل میں دیکھا ہے نقطہ زدہ مقامات ذہن سے اتر گئے ہیں اس لیے جو کچھ یاد تھا لکھ دیا ہے کسی اور صاحب کو یاد ہو تو درست کر دیں یا مطبوعہ ٹائٹل پیج کسی کے پاس ہو تو صحت کر دیں۔

میر محفوظ علی مرحوم جن دنوں حیدرآباد میں ملازم تھے میں بہت کم سن تھا مگر میرے ہوش سنبھالنے کے بعد ایک دفعہ وہ حیدرآباد پہنچے تو والد مرحوم سے ملنے کے لیے آئے اور میں نے زیارت کی اس کے بعد دہلی میں بھی مجھے ان سے نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا۔ نہایت ہی مخلص، قدیم وضع کے شریف بزرگ تھے، طبیعت نہایت ہی مزیدار تھی۔ سادگی حد سے زیادہ اور ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، آخری بار وہ تقسیم ملک سے دو تین سال پہلے حیدرآباد آئے تھے اس کے بعد سے پھر ملاقات نہیں ہوئی، البتہ ان کے فرزند ابن علی سے دوستی رہی مگر وہ بھی جلد حیدرآباد سے چلے گئے نہ جانے اب کہاں ہیں۔

مضامین کا مجموعہ اور اس پر مولوی عبدالحق کا مقدمہ طبع ہو جانے کے بعد محفوظ علی پر کچھ لکھنا بے کار ہے اس لیے میں نے ان کے صرف وہ مضامین نقل کر دیئے جو حاجی بغلول کے نام سے طبع ہوئے ہیں، امید ہے کہ برادران ادب ان سے مستفید ہوں گے۔

صاحب کے بعد جناب

علی عباس حسینی ——— کرشن چندر ——— ل۔ احمد

شخصیت نگاری سوانح نگاری کی مشکل ترین قسم ہے۔ کسی عظیم ہستی کے واقعات حیات کو بیان کر دینا، اور اس کے کارناموں، شاہکاروں اور تصنیفوں پر تفریظی نظر ڈال دینا نسبتاً آسان کام ہے۔ لیکن شخصیت نگاری نہ تو سوانح حیات کا مسلسل بیان ہے اور نہ محض مدح سرائی۔ یہاں تو مصنوعی کی جگہ اصلی چہروں کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔ اس فن نگارش میں کامیابی کے لیے مردم شناس نظر کے ساتھ ساتھ، عام انسانی نفسیات سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اور ان دونوں سے بالاتر وہ فنکارانہ سبکدستی جو نیم جمیل نقوش میں بھی آب و رنگ اس حسن سے بھرتی ہے کہ ان کمزوریوں کے بے نقاب ہونے پر بھی شخصیت کی عظمت مجروح نہیں ہونے پاتی۔ بلکہ ان جلیل مرتبہ بزرگوں کو بھی اپنا ہی جیسا خطا و نسیان سے مرکب انسان سمجھ کر ناظر کے دل میں ان کے لیے ایک طرح کی کشش اور ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح کی باریک و سبک خطوط کشی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ یہ فن مالک کی دین ہے۔

اُردو کے مختلف ادیبوں نے اس صنف نگارش میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں سے اکثر کامیاب بھی رہے ہیں۔ حسن نظامی، حسرت لاہوری، مرزا محمد عسکری، مولانا عبدالرزاق، رشید احمد صدیقی، رئیس احمد جعفری، ڈاکٹر اعجاز حسین اور مولوی عبدالحق نے بڑے بڑے ادیبوں اور مصنفوں کی نجی اور شعوری زندگی سے ہمیں بڑے حسن سے متعارف کرایا ہے۔ شوکت تھانوی نے اپنے خاص انداز رنگ میں اپنے تیار کردہ شیش محل میں اچھے اچھوں پر کلوخ اندازی کی ہے، مرزا فرحت اللہ بیگ نے نذیر احمد کی کہانی کچھ ان کی کچھ اپنی زبانی لکھ کر "جوتیوں میں دال بٹنے" کی بڑی اچھی منظر کشی کی ہے۔ عصمت چغتائی نے اپنے عظیم بھائی پر "دوزخی" تحریر کر کے "گھر کی مرغی دال برابر" والی مثل ثابت کر دی ہے۔

لیکن محمد طفیل مدیر "نقوش" غالباً ان کارناموں سے مطمئن نہیں ہوئے۔ انھوں نے نقوش کا ایک خاص نمبر اس صنف نگارش کے لیے مخصوص کر دیا۔ یوں تو نقوش کا ہر خاص نمبر کتابت و طباعت، ترتیب و تدوین اور مضامین کی نوعیت اور مقالہ نگاروں کی اہمیت کے لحاظ سے ایک مستقل ادبی تالیف کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن ان میں بھی شخصیت نمبر، طنز و ظرافت نمبر اور تازہ ترین پطرس نمبر آپ اپنی مثال ہیں۔ ان خاص نمبروں نے طفیل کی سلیقہ مندی، نطافت، ذہانت، بداعت اور ہوشمندانہ ادارت پر مہر لگا دی ہے۔ وہ اگر خود کبھی کچھ نہ لکھتے جب بھی یہ لگاتار بے مثل نمبر ممتاز خادمانِ ادب کے زمرے میں ان کی شمولیت کے ضامن تھے۔ لیکن "صاحب" کی تصنیف نے

انھیں اردو ادیبوں کے حلقے میں بھی ایک مستقل مقام دے دیا ہے۔

”صاحب“ چند جیسے صاحبانِ قلم کی شخصیتوں کی بے نقابی ہے جنھیں طفیل نے بہت ہی قریب سے دیکھا ہے۔ ان گرامی محبوبوں کے قریب ترین نظاروں نے بھی طفیل کی آنکھوں کو خیرہ نہیں کیا ہے۔ بلکہ دیدہ وری میں کچھ اضافہ ہی ہو گیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ طفیل نے اس دید و بازدید کے حالات بڑی دیدہ دلیری سے بیان کئے ہیں، لیکن انھوں نے اس میں بلا کی فنکاری بھی دکھائی ہے۔ انھوں نے اپنی شخصیت کو دبا کر اپنے ممدوح کی شخصیت کو ہر جگہ ابھارا اور پیش پیش رکھا ہے۔ جن ”صاحبان“ کی اس طرح نقاب کشائی کی گئی ہے، ان میں سے ہر ایک دنیائے ادب میں ایک ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ پھر بھی طفیل نے ان شخصیتوں کے گل بوٹوں کے ساتھ ساتھ ان کے داغ بھی دکھا دیئے ہیں۔ اور یہ سب کچھ کیا ہے بڑی پُرکار ”سادگی“ سے۔ یہ وہی سادگی ہے جس پہ مقتول غالب مر جانے کو جی چاہتا ہے۔ اس سادگی میں دلوں کو مسلنے والی چٹکیاں بھی ہیں اور بے پناہ طنز بھی۔

اس سلسلے میں جو امر طفیل کو دوسرے ہم چشموں اور ہم عصروں سے الگ کر دیتا ہے، وہ ہے خود اپنے باطن کی بھی پردہ دری۔ اور یہ ہے طفیل کے کردار کی عظمت کی دلیل۔ منٹو کی ضمانت اور ندیم کی گرفتاری کے سلسلے میں خود طفیل کے نفس نے جہاں جہاں کمزوریاں دکھائی ہیں اور بڑے لوگوں کے بیچ اپنی ناک کو اونچا رکھنے میں جس جس طرح جد و جہد کی، اُن سب کو ایمانداری اور سچائی سے، اپنی صفائی میں کچھ کہے بغیر بیان کر ڈالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اس کے لیے مہاتماؤں جیسے کردار کی ضرورت ہے۔ طفیل نے اپنی کمزوریوں کا اعتراف و اقرار کر کے اور اپنی ذاتی شخصیت کی بھی ایک جھلک دکھا کر اپنے کو ایک بڑا لکھنے والا ہی نہیں، ایک بڑا انسان بھی ثابت کر دیا ہے۔ ”صاحب“ میں دوسرے ”صاحبان“ کے ساتھ ساتھ اس ”بڑے صاحب“ کی زیارت کا بھی شرف ہمیں حاصل ہوتا ہے۔

طفیل کی طرزِ تحریر میں بڑی پُرکار سادہ بیانی ہے۔ یہ سادگی ہی نہیں بلکہ ایک طرح کی سادہ کاری ہے۔ اس میں پھول بوٹے ہیں، رنگینی ہے، ظرافت ہے، طنز ہے، فنکاری ہے۔ اس بظاہر سادہ لوحی میں صاحبانِ نظر کے لیے تیر و نشتر بھی ہیں۔ لیکن یہ زہر میں بجھے ہوئے تیر نہیں ہیں، جن کی خراش سے سارا جسم مسموم ہو جاتا ہے، بلکہ یہ مفرحات سے بھری سیرنجیں ہیں جو رگوں میں سرعت سے دوڑتی اور دلوں کو گرماتی ہیں، اور ان سے اخوت و انسانیت کی شیرینی کا احساس تیز سے تیز تر ہو جاتا ہے۔

ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

(علی عباس حسینی)

پہلی بار جب محمد طفیل میرے کمرے میں داخل ہوئے تو پہلی نظر میں وہ مجھے سجادہ نشین سے نظر آئے۔ دوسری نظر میں لکڑیوں کے ٹال کے مالک سے، تیسری نظر میں ایک معصوم بچے سے، جو وقت سے پہلے بڑا ہو جائے۔ چوتھی نظر کا انھوں نے مجھے موقعہ نہیں دیا۔ اس وقت تک وہ مجھ سے بغل گیر ہو چکے تھے۔

پہلے وقتوں میں آدمی کی ایک شخصیت ہوتی تھی۔ یا ڈیڑھ ہوتی تھی، یا بہت زور مارو تو دو ہو جاتی تھیں۔ آج کل تو ایک

کمال میں درجنوں شخصیتیں نظر آتی ہیں۔ بلکہ کبھی کبھی سینکڑوں۔ جوں جوں زندگی پیچیدہ ہو گی شخصیت بھی پیچیدہ ہوتی جائے گی۔ یہ تہذیب کا پہلا اصول ہے۔ اس بارے میں یہ تو نہ کہوں گا کہ محمد طفیل! اپنے کسی دوست کے سلسلے میں کسی زود نگہی کا شکار رہوں۔ کم نگہی کا شکار ہو سکتا ہوں۔ اس لیے میرے نزدیک جانی پہچانی شخصیتوں کو ادبی خاکوں میں ڈھالنا بے حد مشکل کام ہے۔ مگر اس سے پہلے "صاحب" میں اور اب "جناب" میں جناب محمد طفیل صاحب نے اسی مشکل کام سے عہدہ برآ ہونے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

اب ایسی کامیاب کوشش بھی نہیں کہ مقالے پر مقالے تعریف میں لکھ دیے جائیں۔ لیکن ایسی اوسط درجے کی بھی نہیں کہ در خور اعتنا نہ ہو۔ ان خاکوں میں ایک عام سطح سے بلند ہو کر بات کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان سے مؤلف کی جولانی اور بے باکی ایک نئی تکنیک اور رسائی کا پتہ دیتی ہے۔ جو دوسرے شخصیت نگاروں کے انداز نگارش سے ہٹ کر ہے۔

ان میں سے اکثر و بیشتر خاکے تو بے حد مختصر ہیں۔ جو نسبتاً طویل ہیں انھیں بھی میں ان شخصیتوں کے اعتبار سے مختصر ہی کہوں گا۔ اب مختصر خاکہ نگاری میں مختصر افسانہ نگاری کے سے اسلوب برتنا پڑتے ہیں۔ شخصیت کے دو ایک پہلو ہی سامنے آسکتے ہیں۔ ہفت رنگ کیفیت پیدا کرنے کے لیے کسی ایک ہی شخصیت کو بار بار مختلف زاویوں سے دیکھنے سمجھنے پرکھنے اور پرکھ کر مسلسل اور مفصل طور پر لکھنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ محمد طفیل کے ان خاکوں کو دیکھ کر ہمت بندھتی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ انھیں کسی قد آور شخصیت پہ مفصل طور پر لکھنے کے لیے اکسایا جائے۔

شخصیتوں کے خاکے بالعموم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ اس قدر زرق برق چمکتے رنگین اور معلا ہوتے ہیں کہ دیوی دیوتاؤں کی شبیہ مبارک معلوم ہوتے ہیں ——— اردو ادب میں شخصیت نگاری کا فن انھی دو انتہاؤں میں برتا گیا ہے۔ یا تو مقدس صنم گری، یا زہریلی کارٹون بازی۔ مقام شکر ہے، کہ محمد طفیل کارٹون سازی سے تو صاف بچ گئے ہیں۔ اُن کے کسی مختصر سے مختصر خاکے نے خد و خال کسی شخصیت کو مسخ کر کے ابھارے بھیر گئے ہیں۔ حالانکہ مختصر خاکہ نگاری میں یہ کام بہت آسان ہوتا ہے۔ اور نو آسان ادیب کا ذہن خود بخود اس طرف ڈھلتا جاتا ہے۔ دوسری طرف ان خاکوں میں بھی جن میں "نیازمندی" اور "مرعوبیت" کے عناصر ضرورت سے زیادہ ابھرے ہیں —— اُن میں بھی زیر تحریر نو نشاں لفظوں کی محفلیں کمال کے اندر کانٹے سے چبھتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ محمد طفیل کا خاص رنگ ہے۔ بظاہر بے حد نیازمندانہ، مرعوبیت سے معمور، منکسر المزاج سے مزین۔ وضعداری سے نہکا ہوا۔ لیکن اگر بہ نظر غائر دیکھیے .... تو بات کہہ گئے ہیں! "وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں" یوں کہ ہر نیازمند تحریر کے پس منظر میں آپ کو مصنف کا زہر تبسم جھلکتا ہوا ملے گا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف دبے پاؤں ہر بڑی شخصیت کی جیب کاٹ رہا ہے۔ اب معلوم ہوا کہ محمد طفیل حضرت جوہری نہیں جیب کترے بھی ہیں۔

محمد طفیل اردو ادب میں شخصیت نگاری کے جدید میلانات کو آگے لائے ہیں۔ ان کی کاوشیں اس لحاظ سے لائق ستائش ہیں۔ اور وہ اس کام کے لیے اپنے منصب اور اپنی فطرت کے اعتبار سے بے حد موزوں نظر آتے ہیں۔ اُن کی سرشت میں کینہ نہیں۔ دل میں حسد نہیں۔ نگاہ میں رہ رہ کر ہوتی ہوئی کیفیت نہیں جو کسی بھی اچھے سے اچھے لکھنے والے کو کسی دوسری بڑی شخصیت سے انصاف کرنے سے روک سکتی ہے۔ ہر بڑا انسان معمولی انسان کی ایک مبالغہ آمیز صورت ہوتا ہے اُسے اگر کوئی ایک معمولی انسان کی محرومیوں کی نظر سے دیکھے گا تو خطا کھائے گا۔ ہر بڑی شخصیت کا اپنا ایک اخلاقی نظام ہوتا ہے۔ اُسے اگر سیرت نگار اپنے ذاتی اخلاقی نظام سے پرکھے گا تو نفسیاتی اعتبار سے ممکن ہے وہ صحیح ثابت ہو۔ مگر شخصیت نگاری

ے باب میں وہ ناکام رہے گا۔ مقام مسرت ہے کہ محمد طفیل میں یہ دونوں خامیاں نہیں ہیں۔ لکڑیوں کے اس گٹھے میں جس کا نام جناب ہے۔ ہر طرح کی لکڑی ہے۔ موٹی اور پتلی بھی۔ نئی اور پرانی بھی۔ گیلی اور سوکھی بھی۔ مگر ادیبوں کا یہ پشتارہ ہے بے حد دلچسپ ۔ صفحہ اول سے آخر تک یہ کاغذی زنبیل گوناگوں جادو رنگ کیفیتوں سے معمور ہے۔ اور ان میں سے ہر لکڑی جلتی ہے۔ کوئی پطرس کی طرح ہنسانے چلاتی ہے تو کوئی مرزا ادیب کی طرح رُک رُک کر جلتی ہے کوئی شکیلہ اختر کی طرح ایک ہی رنگ میں جلتی چلی جاتی ہے۔ تو کوئی مجاز کی طرح راکھ ہو چکی ہے......!

محمد طفیل نے پہلے صاحب لکھا پھر جناب۔ صاحب اور جناب کے بعد اب دو قسم ہی کے انسان باقی رہ گئے ہیں۔ عزت مآب اور خانہ خراب۔ دیکھئے ان لوگوں کی باری کب آتی ہے؟

(کرشن چندر)

جناب محمد طفیل صاحب، مدیر نقوش کی یہ تازہ تصنیف چند خاکوں کا مجموعہ ہے، جس میں صاحب موصوف نے اپنے وہ تاثرات قلمبند کئے ہیں جو مختلف اشخاص سے ملنے کے بعد ان کے ذہن دافکس میں مترتب ہوئے۔ انداز تحریر مزاحیہ ہے، اور حق یہ ہے کہ ان کی طرز انشاء کمال دلکش، عبارت بے حد شگفتہ، طنز غایت لطیف اور مزاح نہایت نازک ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی انشاء و عبارت اگر اتنی حسین و دلنشین نہ ہوتی تو اس کتاب کے دوسرے محاسن شاید اس قدر روشن و تابناک نہ ہوتے۔ کتاب کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پڑھنے والا اچانک کسی نئی اور دلکشا فضا میں پہنچ گیا ہے۔ کم از کم مجھے ایسا ہی لگا۔

مگر یہ تو میں کتاب کے متعلق اپنا خیال ظاہر کرنے لگا، حالانکہ مجھے تو بتانا یہ تھا کہ اب سے پہلے بھی مدیر نقوش مضمون کی فرمائش کبھی کبھی کر دیا کرتے تھے جس کی تعمیل سے میں اکثر قاصر رہتا تھا اور نادم البتہ بہت ہو لیتا تھا۔ اس کتاب کے پڑھنے سے یہ ڈر لگا کہ میرا نادم ہوتے رہنا اکارت ہی گیا۔ صاحب موصوف تو یوں ہی "بھی "گرامی نامے" ارسال کر دیا کرتے ہیں۔ میں بہر حال دیانتداری سے ذیل میں بتا دینا چاہتا ہوں کہ یہ مضمون صاحب موصوف کی فرمائش کی تعمیل نہیں ہے۔ بلکہ اس کتاب نے تقاضے کر کر کے لکھوایا ہے۔ یہاں یہ میرا یہ اظہار خیالات محدود رہے گا، اس لیے مختصر ہو گا، دوسری صورت میں غیر متعلق باتیں بھی مضمون میں راہ پا جاتیں۔ خیر!

ایک نقاد ادیب (F. TUGLAS) کا قول میری نظر سے گزرا ہے کہ "ایک اعلیٰ تصنیف میں قاری تو مصنف کی روح سے آشنا ہوتا ہی ہے، خود مصنف بھی اپنی روح کو دیکھ سکتا ہے۔" پیش نظر تصنیف میں ایسے مقامات سامنے آتے ہیں جہاں مصنف کی روح بے نقاب نظر آتی ہے اور کسی وقت یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ مصنف اپنی روح کو دیکھ رہا ہے۔

اسی نقاد نے ایک اور بڑی گہری بات بھی کہی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "ایک تصنیف کو تمام کر لینے کے بعد مصنف بالکل ہی نہیں رہتا جیسا شروع کرتے وقت تھا۔ دوران تصنیف میں وہ مختلف زندگیاں جی لیتا ہے یعنی اپنے بے شمار خیالات و محسوسات کے اجزا سے خود اپنی تخلیق کرتا جاتا ہے۔"

اس بیان کی تعبیر میں اس طرح کرتا ہوں کہ لکھنے والا جب بھی کچھ لکھے گا اس میں اچھی باتیں بھی ہوں گی اور بری بھی

اور ظاہر بات ہے کہ ایک لکھنے والا جب اپنی پسند و ناپسند کو ضبطِ تحریر میں لاتا ہے تو پورا زورِ بیان صرف کر دیتا ہے۔ اس طرح اس کے خیالات و محسوسات کے اظہار میں اس سے زیادہ شدت ہوتی ہے جتنی اس کے ذہن و خیال میں تھی۔ اور جب وہ اپنی تحریر میں زورِ بیان پیدا کر لیتا ہے تو اس کے مثبت و منفی خیالات و تصورات میں بھی شدت آجاتی ہے یعنی وہ اپنے مثبت خیالات پر زیادہ مستحکم، و منفی تصورات سے زیادہ متنفر ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح اس کے نفس میں ایک نوع کا تغیر آجاتا ہے۔ مصنف کے اندر یہ تبدیلی آسکر وائلڈ کے اس قول کا مصداق ہے کہ "فطرت زندگی کی نقل کرتی ہے"۔

جناب طفیل کی پہلی تصنیف "صاحب" اور تازہ تصنیف "جناب" کا اس جہت سے تقابلی مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

انسانی رشتوں (وسیع مفہوم میں) کو برتنے اور سمجھنے کے لیے نظر کے دو مختلف زاویے ہو سکتے ہیں: ایک یہ کہ انسان بالطبع نیک ہے اور اس کی خرابیاں حالات و اسباب کی پیدا کی ہوئی ہیں جو حالات و اسباب بدل جانے سے رفع ہو سکتی ہیں۔ یہ انسان دوستی پرستی کا نقطۂ نظر ہے۔ دوسرا نقطۂ نظر سرمایہ داری نظام کی پیداوار ہے کہ انسان بدبختی حیوان ہے خود غرضی اس کی فطرت ہے، اور اس کی اچھائی بس ایک غلاف ہے جس کو وہ اوڑھے ہوئے ہے۔

اس کتاب کے مطالعے سے واضح ہو جاتا ہے کہ مصنف پہلے نقطۂ نظر کا قائل ہے: وہ انسانی کمزوریوں کو نظر انداز کر سکتا ہے، خوبیوں کی قدر کرتا ہے، خود اپنی مخالفت کرنے والوں کو سب سے زبردست سمجھتا ہے۔ سب سے زبردست کی ترکیب میں نہایت لطیف طنز بھی پوشیدہ ہے: وہ دوست ہی کیا جو ضرر نہ پہنچائے! جناب طفیل کا یہ انداز طبیعت بلا شبہ عالی ظرفی کا ثبوت اور کردار کے استحکام کی دلیل ہے۔

کردار نگاری میں اس خیال کو مرکزی نقطے کی حیثیت دی جاتی ہے کہ ایک انسان دوست مصنف اپنے کرداروں میں انسانیت کے ذرے پالتے، کو ڈھونڈھ لیتا ہے جو اس کردار کی تعمیر کا سنگِ بنیاد ہوتا ہے اور یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ بُرے سے بُرے انسان میں بھی کوئی ایک خوبی ایسی ہوتی ہے جو اس کی تمام برائیوں پر بھاری ہوتی ہے، اور بالکل اس کے برخلاف بھی۔

اس کتاب کا مطالعہ یہ بھی بتا دیتا ہے کہ جناب طفیل نے اپنے کرداروں میں وہ قیمتی انسانیت ڈھونڈھ نکالا ہے۔ جن شخصیتوں کا اس کتاب میں ذکر ہوا ہے ان کی جس جس خصوصیت کو اجاگر کیا گیا ہے وہ خصوصیتیں ان کرداروں کی تعمیر کے سنگِ بنیاد کا درجہ رکھتی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب طفیل کو قیافہ شناسی کا دعوے تو نہیں، وہ مردم شناس بھی ہیں۔

میں اس مضمون کو مثالوں سے بوجھل بنا دینا نہیں چاہتا مگر مقصودی مطالعہ کرنے والے کو میرے خیالات کی تصدیق ہر وقت ہو گی۔

حضرت نیاز فتحپوری نے جناب طفیل کی انشا پردازی، ادبیت اور جودتِ ذہانت کی بڑی جامع داد دی ہے اور اس باب میں مزید کچھ کہنا تحصیلِ حاصل کا مترادف ہوگا۔ مگر اندھے کے ہاتھ بٹیر لگ جانے کے مصداق مجھے ایک پہلو سوجھ گیا ہے: جناب طفیل کے طنز و مزاح میں MARK TWAIN کی خصوصیت کا رنگ بھی ملتا ہے: تو تمین بات کچھ اس ڈھنگ سے کہتا ہے جس سے پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ تو تمین اپنے طنز یا مزاح سے خود متاثر نہیں بلکہ شاید اس سے باخبر بھی نہیں ہے۔

ایک اور خوبی مجھے جناب طفیل کے طنز و مزاح میں یہ نظر آئی ہے کہ وہ کڑوی سے کڑوی بات کو بھی قند و گلاب بنا دیتے ہیں

وہ جس کی "چکی" لیتے ہیں اسے سمجھائی دیتے ہیں کہ یہ چکی طبعاً نہایت ضروری تھی ورنہ خون کے منجمد ہو جانے کا اندیشہ تھا اور جس کی چکی لی جاتی ہے وہ ان کا ممنون کرم بن جاتا ہے۔

ادبی صناعت جس شئے سے عبارت ہے وہ حسن بیان ہے، اور حسن بیان جبھی پیدا ہو سکتا ہے جبکہ لکھنے والے کو زبان پر عبور حاصل ہو۔ الفاظ کا صحیح استعمال نہ ہو تو لکھنے والا نہ تو اپنا معہود ذہنی دوسروں کو منتقل کر سکتا ہے نہ اپنے کرداروں کے، جو اسی کے ذہن میں تخلیق پاتے ہیں، ذہنی انداز کو واضح کر سکتا ہے۔ اور اس وجہ سے، اسی مناسبت سے، اس کی صناعت ناقص یا ناکام رہتی ہے۔

دنیا بھر کے ممتاز و مقتدر اہل قلم میں یہ خصوصیت قدر مشترک ہے کہ ان کی زبان و بیان گہرے فکر و احساس کی قوت سے قوی اور استعمال الفاظ میں مفہوم کی قطعیت کے ساتھ صورت پذیری کا لوچ ہوتا ہے۔ یہ وہ خصوصیت ہے جو عبارت کو خراد پر چڑھا کر سڈول اور مجلا بنا دیتی ہے اور وہ جادو اثر بن جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ زبان و الفاظ کا صحیح استعمال ان کی قوت کو کہیں بڑھا دیتا ہے جس کی بنا پر صناعت شعر و ادب کو فن نقاشی پر فوقیت دی جاتی ہے۔

جناب طفیل کی انشاء و عبارت میں الفاظ کی وہ قوت متحرکہ جھلکتی نظر آتی ہے جو رنگوں سے بہتر نقش بنا سکتی ہے۔ اور واقعی یہ امر حیرت انگیز بات نہیں کہ وہ اردو روزمرہ و محاورات کا ایسا بے ساختہ استعمال کر سکتے ہیں: بلاشبہ جناب طفیل نے اردو کلاسیکی ادب کا گہرا اور وسیع مطالعہ کیا ہے۔

خود جناب طفیل کے بقول یو۔ پی۔ پنجاب کی چپقلش کو گولی مار دینا چاہیئے۔ بلکہ مل سکے تو توپ سے اڑا دینا چاہیئے کہ نہ جنازہ اٹھے اور نہ مزار بن سکے۔ یہاں مجھے اس حقیقت امر کا اظہار کرنا ہے کہ آغوش مادر میں جناب طفیل نے جو آوازیں سنیں وہ اردو روزمرہ کی آوازیں نہیں تھیں، اور اب بھی وہ گھر میں اور باہر بھی پنجابی ہی بولتے اور سنتے ہیں مگر انھیں اردو زبان میں ابداع و اختراع کا ملکہ حاصل ہے۔

آجکل کے اردو ادیبوں میں "مغالطے" کی بیماری وبا کی صورت میں پھیلی ہوئی ہے، مگر "جناب" کے پڑھنے سے معلوم ہو جاتا ہے کہ بفضلہ جناب طفیل اس وبا سے مامون و مصئون ہیں، بلکہ وہ اردو ادیبوں کی "مکتبیت" اور ان کے بزعم خود غلط ہونے کی شدت محسوس کرتے ہیں: اس کتاب میں انھوں نے اپنی ذات کو نشانہ بنا کر اصلاحی نشتر چلائے ہیں اور سمجھانا چاہا ہے کہ علم کی انتہا نہیں ہے اور عالم وہ ہے جسے اپنے جہل کا علم ہو۔

"جناب" کو پڑھ کر جن شخصیتوں سے تعارف ہوتا ہے ان میں سے میں صرف مجاز کو جاننے کی حد تک جانتا تھا، مرزا یگانہ اور عشرت رحمانی سے ایک ایک بار معمولی سی ملاقات ہوئی تھی، بعض کو ان کی شہرت کی بنا پر جانتا اور اکثروں سے قطعی ناواقف ہوں۔ میں خوش ہوں کہ جناب طفیل کے طفیل اتنی بہت سی دلچسپ ہستیوں سے متعارف ہو سکا۔

ان خاکوں میں شکیلہ اختر کا خاکہ بہت مکمل اور ان کی شخصیت کمال دلچسپ معلوم ہوئی۔ مدیر نقوش اور بلونت سنگھ کی "تصویریں" پڑھ کر دل میں یہ حسرت پاتا ہوں کہ کاش ایسی دلکش ہستیوں سے ملاقات ہوئی ہوتی۔ مدیر نقوش کی متقاطیسی شخصیت کا ایسا نقش جناب طفیل ہی بنا سکتے تھے۔ بلاشبہ ان کی کردار نگاری صحیح فہم اور گہرے احساس کا نتیجہ ہے۔

یہاں پہنچ کر خود جناب طفیل کے لفظوں میں مجھے اظہارِ خیالات میں توازن پیدا کر لینا چاہیے۔ میں نگران کی اس قابلِ قدر تصنیف کو نہ بھی سراہوں تو اور بہت اس کی ثنا و تحسین کرنے والے موجود ہیں۔ اور اس کتاب کے ذریعے سے مجھے یہ علم ہو چکا ہے کہ مدیر نقوش جیسی "بے ضرر و غیر مفید" ہستی کے بھی دشمن پیدا ہو جاتے ہیں اور پنجاب والوں کی دشمنی کا قصہ بھی مجھے معلوم ہے کہ وہ کلکتہ پہنچ کر عملاً ثابت بھی کر دیتے ہیں۔ جناب طفیل کے بقول موت برحق ضرور ہے، اور مجھے تو نشانِ منزل بھی نظر آ رہا ہے، مگر مجھے یہ خیال گوارا نہیں ہوتا کہ میرے کوچ کا بہانہ مدیر نقوش بنیں: انھیں ابھی بہت جینا ہے اور بہت سے اچھے اچھے نمبر نکالنا ہیں، وہ باقی عمر اس تاسف میں یوں گزاریں، اس لیے، اور اس لیے بھی کہ اس مضمون کو میں تبصرہ ہی کہنا چاہتا اور تقریظ نہیں بنانا چاہتا ہوں۔ میں چند کوتاہیوں کی طرف اشارہ کروں گا جو مجھے اس کتاب میں نظر آئیں۔

اس کتاب کے بارے میں مصنف کا فرمانا ہے کہ وہ اگر باقی رہی تو اپنے ادبی محاسن کی بنا پر نہیں بلکہ ان غیرفانی شخصیتوں کے صدقے میں جئے گی جن کا اس میں مذکور ہے۔ مجھے ان کے خیال سے اتفاق نہیں کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کتاب جب تک باقی رہ سکی اپنی خوبیوں کی بنا پر رہے گی۔ مجھے یہ اندیشہ بھی ہو رہا ہے کہ صاحب موصوف اگر "لافنائیت" اس فیاضی سے بانٹتے رہے تو ایک دن وہ آ جائے گا جب کسی ذات کی افضلیت بیان کرنے کے لیے اسے "فانی" کہنا پڑے گا۔ تسلیم، کہ بعض ہستیاں اپنے دیوی کارناموں کی بنا پر "تاریخی" بن جاتی ہیں مگر اتنی سستی "لافنائیت" جس کی منطقی توجیہہ نہ کی جا سکتی ہو، یا تو خوش عقیدگی کا نتیجہ ہو سکتی ہے یا پھر مبالغہ کی جائے گی۔ اس دنیا میں کتنی ہی "غیرفانی" ہستیاں فنا ہو چکی ہیں! امتدادِ وقت تاریخ کی ان کتابوں کو بھی فنا کر دے گا جن میں ان "لافانی" ہستیوں کا تذکرہ ہوا ہے! ماضی کب یاد کیا جاتا اور وہ یاد کرنے والے کتنے آدمی ہوتے ہیں؟ ماضی جتنا بعید ہوتا جاتا ہے۔ اس پر ظلمات کے پردے پڑتے جاتے ہیں۔

اقبال و پطرس کے بیان میں بھی ارادتمندی جھلکتی نظر آتی ہے جسے شہرت پرستی بھی سمجھا جا سکتا ہے۔ لاریب کہ اقبال اپنے وقت کے بہت بڑے دانشور تھے، مگر پطرس اتنے بڑے نہ ہوں، تھے دانشور وہ بھی۔ ڈگریوں کا فرق بتایا جا سکتا ہے۔ دو دانشوروں کی علمی بحث کو "بھائی سے ٹکر لینا" کہنا ارادتمندی ہی کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ اقبال کے زمانے میں اور آج بھی ایسی ہستیاں تھیں اور ہیں جو علم و فضل میں ڈاکٹر اقبال پر فوقیت رکھتی تھیں۔ مگر وہاں کے لوگوں نے انھیں "مرشد" "مولانا" نہ کہا نہ مانا، علمی استفادہ البتہ کرتے رہے۔ حقیقت نگاری کا تقاضا ہے کہ علمی بحثوں کو علمی ترازو میں تولا جائے۔

جناب طفیل نے پطرس کے باب میں لکھا ہے کہ ان کے یہاں تکرار و اعادہ بہت تھا، مخصوص طور پر دوستوں کے نام ان کے خطوں میں فقرے اور پیرے الجھ جاتے تھے۔ پطرس کی یہ کوتاہی خلاف فصاحت ضرور ہے۔ یہ تکرار و اعادہ الفاظ و تلمیحات ڈاکٹر اقبال کے یہاں نہیں ہے کیا؟ مگر میں اسے ادبی کوتاہی اس لیے نہیں سمجھتا کہ ہر آدمی کی اپنی فرہنگ ہوتی اور وہ محدود ہوتی ہے، کوئی مصنف اپنی زبان کے تمام الفاظ استعمال نہیں کر سکا ہے۔ البتہ اس بات کو اخلاقی اعتبار سے دیکھا جا سکتا ہے: فطرتاً آدمی اپنے دوستوں سے یکساں تعلق خاطر نہیں رکھ سکتا۔ اسی لیے پرانے اخلاق میں "حفظ مراتب" کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پطرس تصنع سے کام لیتے تھے یعنی غیر مخلص تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یگانہ چنگیزی پر جناب طفیل نے نہایت خلوص و احترام کے ساتھ تبصرہ کیا ہے، لیکن اس میں عمومی تعصب کام کرتا نظر آ

ان کی نظر میں یگانہ بڑے بلند پایہ شاعر تھے مگر خلل دماغ کی وجہ سے غالب و اقبال کے کمال کے سامنے دوزانو نہیں ہوگئے۔ مجھے اعتراف ہے کہ یگانہ کا وہی کلام میری نظر سے گزرا جو ان رسالوں میں چھپا جو میری نظر سے گزرتے تھے۔ اس لیے میری رائے ان کے باب میں قابل اعتبار نہیں ہو سکتی۔ مگر میرا عمومی تاثر یہ ہے کہ وہ فی الجملہ غالب پرستی کے مخالف تھے جو بت پرستی سے جا ملی تھی۔ اور اقبال کو یگانہ ہی نہیں، دوسرے اردو شعرا نے بھی نہیں مانا ہے۔

انسان کا شعور اس کے مادی ماحول کے سانچے میں ڈھلتا ہے: بالکل ممکن ہے کہ معاشی بدحالی نے یگانہ کے اندر احساس کمتری پیدا کر دیا ہو جیسا کہ جناب طفیل کا خیال ہے، اور ہو سکتا ہے کہ حالات و اسباب نے ان کے ذہنی و فکری قویٰ کو بھی متاثر کر دیا ہو۔ لیکن غالب و اقبال کے سامنے سر نہ ٹیک دینا احساس کمتری یا اختلال ذہنی کا نتیجہ، دلیل سے ثابت کئے بغیر تو دعوے بے دلیل ہی کہا جائے گا۔ یگانہ نے اس ذیل میں جو کچھ کہا الفاظ سے ادا کیا اور استعمال الفاظ میں استدلال ہوتا ہے جو بلند و معقول بھی ہو سکتا ہے اور پست و پوچ بھی۔ اس لیے اگر یگانہ کا استدلال غیر صحیح یا پوچ تھا تو اسے دلیل سے ثابت کیا جانا چاہیے۔ میری چھوٹی سی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ یگانہ بڑے صناع شاعر تھے مگر ساتھ فاتر العقل بھی تھے، اس لیے کسی ماہر نفسیات سے پوچھنا پڑے گا کہ کیا یہ دونوں باتیں ایک ذات میں بیک وقت یکجا ہو سکتی ہیں۔

ایک عرصہ ہوا جب حبیبی ماتی جالئی نے مجھے یگانہ کے دو فارسی شعر سنائے تھے اور وہ یہ تھے: ؎

ناخدا از من بگذر، سوئے دگراں بنگر　　کار من بدریا در، دست و بازوی تنہا
ہمدرفیق و ہمہ ہمدم، پر شکستہ و بیدم　　دادر امی زیبد، بال و پر من تنہا

ان شعروں میں خود داری و اعتماد نفس اور انسان دوستی کے ساتھ اس خدائی کارخانے پر طنز بھی ہے۔ میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ جو شخص اس پائے کے شعر کہہ سکتا ہے اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ جس پر چاہے اعتراض کرے!

غالب و اقبال کا فن و کمال اپنی جگہ ہے مگر ان کی ذات میں "قدوسیت" پیدا کر دینا علمی بے بضاعتی کی دلیل ہے، فن و کمال کی قدردانی نہیں ہے۔ اور اس کے ذمہ دار ہمارے "مکتبی" قسم کے ادیب ہیں جنھوں نے جناب طفیل کے بقول "جھوٹی سچی" باتیں لکھ کر "محمد فاضل" بننے کی کوششیں کی ہیں۔ وہ ادیب پروفیسر حسن کو جناب طفیل نے چنوتی دی ہے کہ پطرس کا سا ایک فقرہ تو لکھ دیکھیں۔

مولانا حالی کے بقول جو قوم دانیوں کو نبی بنا دیتی اور نبیوں کو خدا سے جا ملاتی ہے اگر اپنے اہل فن کو ولی بنا دے تو ایسی عجوبہ بات بھی نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو علم و فن سے تعلق نہیں ہو سکتا۔

یہاں تک لکھ پایا تھا کہ جھپکی سی آگئی اور مرزا یگانہ نمودار ہوگئے۔ بالکل اسی ہیئت اور حلیے میں جس میں میں نے انھیں ایک ہی بار دیکھا تھا۔ فرمانے لگے: —

"آپ کچھ میرے متعلق لکھ رہے ہیں؟"

"آپ کے متعلق کہنا تو صحیح نہ ہوگا، مدیر نقوش نے آپ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے عرض کیا۔

"اظہار خیال آپ آزادی سے کیجئے مگر میری طرف سے مدیر نقوش کو یہ ضرور بتا دیجئے کہ یہ تو وہ خود مانتے ہیں کہ ایک بڑا آدمی دوسرے کی بڑائی مان لے تو اپنی بڑائی کو ناقص کر دے گا۔ اقبال بھی بڑے اور میں بھی بڑا۔ میں ان کی بڑائی کیونکر تسلیم کر لیتا؟ لیکن وہ اگر

پھر بھی غور و تامل سے کام لیتے تو دیکھ سکتے تھے کہ میں نے فی المعنی اقبال کی بڑائی تسلیم کر لی ہے، ان کے فلسفے کو مان کر میں اپنی خودی کو ملند کرنا چاہتا تھا! لیکن اقبال کے مرید اور ارادتمند مجھے فاتر العقل کہہ کر خود اپنے مرشد طریقت کی تکذیب پر کمربستہ ہیں تو قصور کس کا ہے؟ اور ان کو میرا یہ شعر ضرور یاد دلا دیجئے :

خودی کا نشہ چڑھا، آپ میں رہا نہ گیا　　　خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا

پھر مجھے چپت آگئی۔

یگانہ پر اپنے تبصرے کے آخر میں جناب طفیل نے ان کا ایک شعر بھی نقل کیا ہے

امید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر　　　کہاں کے دیر و حرم گھر کا راستہ نہ ملا

میں جناب طفیل پر اعتراض نہیں کرتا کیونکہ شعر ہی اس قسم کا ہے کہ ناقص ہونے کے باوجود مفہوم فوراً سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس شعر میں شاعر نے یہ کہا ہے کہ دوراہے پر پہنچ کر امید و بیم نے نہ ادھر جانے دیا نہ ادھر، اور وہ دوراہہ ظاہر ہے کہ دیر و حرم کا ہے۔ مفہوم اپنی جگہ مکمل ہے۔ لیکن شعر میں معنوی و لسانی دونوں نقص ہیں، شعر کے سیاق میں گھر کا راستہ نہ ملنے کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ گھر سے تو چل کر آپ دوراہے پر پہنچے ہیں، اور دوراہے پر پہنچ کر آپ تذبذب میں پڑ گئے کہ کدھر جائیں۔ فیصلہ نہ کر سکنے کے مفہوم میں امید و بیم کا جملہ اس لیے بھی بے موقعہ ہے کہ دیر یا حرم میں پہنچ جانے کے بعد بھی امید و بیم پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں۔ اگر کہا جائے کہ دوراہے پر سے پھر گھر کو پلٹ آنا تھا تو شعر باعتبار معنی اور بھی پست ہو جائے گا اور گھر کا راستہ نہ ملنے کی کوئی توجیہہ بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ لسانی نقص یہ ہے کہ "کہاں کے" کا جملہ ہمیشہ تحقیر کا مفہوم ادا کرتا ہے، کہاں کے وہ ایسے لاٹ صاحب ہیں، وغیرہ

اب میں طفیل صاحب کے لفظوں میں :
"قلم رکھتا ہوں اور توبہ استغفار کرتا ہوں"

(آل۔ احمد)

اثر لکھنوی

بات کھوتے جو التجا کرتے ‏ ‏ اے دل نامراد کیا کرتے

نہ وفا کرتے یا وفا کرتے ‏ ‏ کوئی وعدہ تو کر لیا کرتے

ہائے کیا لطفِ داستاں ہوتا ‏ ‏ ہم کہا کرتے وہ سنا کرتے

ملنے جلنے کا لطف تھا باہم ‏ ‏ دل سے دل بھی اگر ملا کرتے

اب ستم ڈھاتے ہیں کھلے بندوں ‏ ‏ عکس سے اپنے جو حیا کرتے

کچھ کہا اور چڑھ گئی تیوری ‏ ‏ کس طرح شرح ماجرا کرتے

ہم ہیں اب اور کنجِ تنہائی ‏ ‏ اس لیے گھلتے کبھی پھرا کرتے

تیرے در کے گدا ہیں مستغنی ‏ ‏ کیا ہوس خلد کی بھلا کرتے

ہیں ستائے ہوئے بتوں کے اثر

ورنہ یہ اور خدا خدا کرتے،

یہ ستارے

احمد ندیم قاسمی

دن تو آلام کا میلا ہے ؛ سو کٹ جاتا ہے
چھپ کے رو لیتا ہوں، محفل میں چہک لیتا ہوں
(کتنی صدیوں سے یہی ہے مری دنیا کا چلن)
شب کو لیکن یہ ستارے نہیں سونے دیتے
سوچتا ہوں — مرے دل میں تری یادوں کی طرح
سینۂ شب پہ ستارے ہیں کہ زخموں کے چمن
کون جانے کہ پسِ پردۂ ظلمات ہے کیا
اور پسِ پردۂ ظلمات ستارے ہی تو ہیں
یہ ستارے غمِ پنہاں کے اشارے ہی تو ہیں

صوفی تبسم

ہر ایک شکوے میں ہوتی ہے ایک پیار کی بات
کچھ اس مزے سے سناتا ہے یار، یار کی بات

ہر ایک بات میں بے اختیار ہے انساں
مگر حدیثِ محبت ہے اختیار کی بات

جہان والے ہر اک شے کو بھول جاتے ہیں
ہمیشہ یاد رہی ہے جہاں کو پیار کی بات

یہ ایک نکتہ بھی اہلِ وفا کو یاد رہے
کہ کاروبارِ محبت ہے اعتبار کی بات

اسی سے راحتیں حاصل ہیں اہلِ دنیا کو
سکوں کا راز یہی ہے، یہی قرار کی بات

اسی سے دیر و حرم کے چراغ روشن ہیں
اسی کے دم سے دلوں کے ایاغ روشن ہیں

بول انمول

مجید امجد

اب یہ مسافت کیسے طے ہو، اے دل تو ہی بتا،
گھٹتی عمر اور گھٹتے فاصلے، پھر بھی وہی صحرا!

چیت آیا، چیتاؤنی بھیجی ــــ اپنا وچن نبھا؛
پت جھڑ آئی، پتر لکھے آئے، جیون بیت چلا!

خوشیوں کا مکھ چوم کے دیکھا، دنیا مان بھری،
دکھ وہ سجن کٹھور کہ جس کو روح کرے سجدا!

اپنا پیکر، اپنا سایا، کالے کوس کٹھن،
دوری کی جب سنگت ٹوٹی، کوئی قریب نہ تھا

کانچ کی اک دیوار، زمانہ، آمنے سامنے ہم!
نظروں سے نظروں کا بندھن، جسم سے جسم جدا!

اپنے گرد، اب، اپنے آپ میں گھلتی سوچ بھلی،
کس کے دوست اور کیسے دشمن، سب کو دیکھ لیا!

راہیں دھڑکیں، شاخیں کڑکیں، اک اک ٹیس اٹل
کتنی تیز چلی ہے، اب کے، دھول بھری، دکھنا!

دکھڑے کیتے لاکھوں مکھڑے، کس کی کون سنے!
بولی تو اک اک کی ویسی، بانی سب کی جدا!

تین نظمیں

قتیل شفائی

شیشم کے خشک پتّے
یوں گر کے ٹہنیوں سے
دھرتی پہ آ رہے ہیں

جیسے مرے ارادے
دنیا سے مات کھا کر
آنسو بہا رہے ہیں

شبنم کے موتی
جب تک چمن میں
لوٹے نہیں تھے

سورج کے آگے
تب تک ستارے
جھوٹے نہیں تھے

رات کے بھید ہیں گہرے
نیلے اور سنہرے
دن میں سب دکھ سہہ لے
جو کہنا ہے کہہ لے

رات کا رنگ نرالا
اگن جیسا کالا
شام سے پہلے پہلے
جو کہنا ہے کہہ لے

ساغر نظامی

حسن کو لاجواب ہونا تھا — عشق کو کامیاب ہونا تھا

آستاں بوسیوں سے کیا حاصل — بزم میں باریاب ہونا تھا

آپ کی کامرانیوں کے لیے — مجھے ناکامیاب ہونا تھا

تیرے نقشِ قدم سے گلشن میں — ذرہ ذرہ گلاب ہونا تھا

تلخیٔ زیست کیا کیا تو نے — زندگی بھر خراب ہونا تھا

وہ گنہ بے حساب کر نہ سکے — جو گنہ بے حساب ہونا تھا

ذرّے انجم بنے ستارے خاک — یوں ہی اک انقلاب ہونا تھا

اے نظامِ شگفتگیٔ حسن — خاک کو بھی گلاب ہونا تھا

زندگی اب بھی خام ہے ساغر
اور بھی انقلاب ہونا تھا

غلام ربانی تاباں

آوارگی بہ دوست کسے راہ پر کہیں
اب کوئی رہ گزر ہو تری رہ گزر کہیں

کچھ احترام گردشِ دوراں بھی چاہیے
زلفوں کو رات لوحِ جبیں کو سحر کہیں

راہِ طلب میں تازہ کریں رفتگاں کی یاد
ہر نقشِ پا کو شمعِ سرِ رہ گزر کہیں

اس کشمکش نے لطفِ تماشہ بھی کھو دیا
آئینہ جمال کہیں یا نظر کہیں

اک تم کہ ہر قدم پہ ہے منزل کی آرزو
اک ہم کہ منزلوں کو غبارِ سفر کہیں

منظور ہر سزائے محبت ہمیں مگر
اُف وہ سزائے خاص جسے درگزر کہیں

تاباںؔ کسی کے لطف کی یہ انتہا بھی دیکھ — وہ غم دیا ہے جس کو غمِ معتبر کہیں

پروفیسر شور

مصحفِ روزگار کا سوگند — آیتِ روزگار ہیں ہم لوگ
رنگ و بوئے چمن سے ہیں آزاد — آپ اپنی بہار ہیں ہم لوگ
پائے ساقی پہ سر نہیں رکھتے — میکدہ در کنار ہیں ہم لوگ
ہم نے سجدے کیے ہیں کانٹوں پر — سرکشانِ بہار ہیں ہم لوگ
ہم کہاں اور کہاں کشاکشِ دام — آپ اپنے شکار ہیں ہم لوگ
ہم سے پوچھو مزاجِ برق و شرر — خانہ زادِ بہار ہیں ہم لوگ
ظلمتِ ابر و باد پر مت جا — برقِ خرمن شکار ہیں ہم لوگ
نازِ پروردۂ تلاطم ہیں — دوشِ ساحل پہ بار ہیں ہم لوگ
چشم بر راہ و گوش بر آواز — ہمہ تن انتظار ہیں ہم لوگ
قہقہے ہم سے بدگماں سہی — درد کا اعتبار ہیں ہم لوگ
سر اٹھا اے خلوصِ مہر و وفا — تیرے پروردگار ہیں ہم لوگ
جس کو ترسی ہے تیرگی صدیوں — اس سحر کی پکار ہیں ہم لوگ
قیدِ ساحل جسے قبول نہیں — وہ یمِ بے کنار ہیں ہم لوگ
ظلمتِ رہگزار کو مت دیکھ — مشعلِ رہگزار ہیں ہم لوگ

ڈوب جائے فضا جو ہم ڈوبیں
نبضِ لیل و نہار ہیں ہم لوگ

ہمارے اوّلین اجداد

طویل نظم "جمہور نامہ" کا ایک باب

جگن ناتھ آزاد

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
زندگی گفت کہ در خاک تپیدم ہمہ عمر
تا ازیں گنبدِ دیرینہ درے پیدا شد

(اقبال)

وادیٔ نیل میں ابنِ آدم کے قدم

تہذیب کی اوّلین جھلک

اب اپنے اوّلیں اجداد کا ہم ذکر کرتے ہیں
جہاں پہنچے ہیں اس منزل سے کچھ آگے گزرتے ہیں
بشر جب آگیا اس خاک کی بگڑی بنانے کو
چلا منزل بہ منزل محفلِ ہستی سجانے کو
یہ پیکر خاک کا تھا یا کوئی تھا نور کا ہالہ
تماشائے جہاں تھا اس کا جلوہ دیکھنے والا
بڑھا تسخیرِ فطرت کی طرف یہ پیکرِ خاکی
قدم اٹھتے خاک پر، تخئیل کے تیور تھے افلاکی

وہ جس کو ایک دن پیڑوں کی شاخوں نے سنبھالا تھا
جہانِ برق و باراں پر حکومت کرنے والا تھا

عزائم نے بڑی دقت سے جینے کا چلن سیکھا
ضرورت تھی تو کیسے آگ جلتی ہے یہ فن سیکھا
یہی بیتاب دل پتھر کے اوزاروں سے بھی گزرا
یہ لوہے کے نکیلے تیز ہتھیاروں سے بھی گزرا

یہ میدانوں سے بھی گزرا یہ طوفانوں سے بھی گزرا
یہ کہساروں سے بھی گزرا بیابانوں سے بھی گزرا
بالآخر ایک دن یہ نیل کی وادی تک آپہنچا
جو کل تک صید تھا اب شانِ صیادی تک آپہنچا

نہ پوچھ اے ہم نشیں! کیا چیز تھی یہ نیل کی وادی
نظر کے سامنے تھی ایک شادابی ہی شادابی
ذخیرہ پانیوں کا دلنشیں اشجار کی دنیا
ضروری خوردنی اجناس کے انبار کی دنیا
یہاں سیکھے بشر نے آبپاشی کے سلیقے بھی
کچھ آرام و سکوں سے رہنے سہنے کے طریقے بھی
معاشی فکر سے جب ذہن نے قدرے سکوں پایا
تو اک دنیا تفکر کے مسائل کی بسا لایا
مسائل پہ ذرا سوچا تو استفہام لہرایا
خرد کے سامنے ہر گام پر تازہ سوال آیا
نجوم و مہر کیا ہیں؟ ابر کیا ہے؟ برق کیا شئے ہے؟
وہ جس سے جگمگاتی ہے جبینِ شوق کیا شئے ہے
فلک پہ چاند ہوتا ہے زمیں پہ چاندنی کیا ہے
یہ ظلمت رات کی کیا ہے یہ دن کی روشنی کیا ہے
یہ کیوں ہر سال رودِ نیل میں سیلاب آتا ہے
ہمیشہ کاروانِ موت کیوں یہ ساتھ لاتا ہے
تعلق ایک ہی موسم سے اس طوفان کا کیا ہے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ آخر ماجرا کیا ہے
یہ رمزِ زندگی چبھتا ہوا کانٹا بنی دل میں
تفکر کا یہ پہلو بن گیا گویا انی دل میں
سوالوں سے بشر کے دل کی کیفیت تھی سیمابی
مٹائی ذاتِ مطلق کے تصور نے یہ بیتابی

ادھر اک ذاتِ مطلق کی طرف پرواز تھی جاری
ادھر تھی مادیت کی ترقی ذہن پر طاری
جو دیکھا ایک ہی موسم ہے دریاؤں کے طوفاں کا
مقرر سال میں ہے وقت گرما کا زمستاں کا
رکھی تقویم کی بنیاد اس پر اہلِ دانش نے
گھڑی تک پھر اسے پہنچا دیا انساں کی کوشش نے
گھڑی یہ دھوپ کی تھی دھوپ ہی سے یہ محرک تھی
اسے حاصل رسائی زیست کے اک ایک پل تک تھی
نہیں اب تک دکھائی تھی مگر زر نے جھلک اپنی
رکھی تھی دورِ آدم سے ابھی شر نے جھلک اپنی

سیم و زر تک انسان کی رسائی اور اظہارِ تموّل

بشر کو آ گیا جب رہنے سہنے کا طریقہ بھی
نوشت و خواند کا سیکھا ذرا اس نے سلیقہ بھی
مویشی پالنے کا ڈھنگ بھی جب پا لیا اس نے
سکونِ زندگی کا رنگ بھی جب پا لیا اس نے
تو سیم و زر کی جانب کو بڑھا دستِ طلب اس کا
نہ تھا یہ ابتدائی ولولہ کچھ بے سبب اس کا
یہ سیم و زر کہ حاصل تھا بشر کی سعیِ پیہم کا
جو بن کر اک تجلی عالمِ ظلمات میں چمکا

اسی کو آبروئے عالم ایجاد بننا تھا
نظام زندگانی کی اسے بنیاد بننا تھا

یہ حرص سیم و زر اے ہمنشیں میں کیا کہوں کیا تھی
بشر کے دل کی اک بیتاب بجلی تھی کہ شعلہ تھی
جو طالب اس کے تھے اُن کے خزانے بھر دیے اس نے
زمین مصر پر فرعون پیدا کر دیے اس نے
ہوا پھر ہر طرف اظہار بھی دولت پرستی کا
نمایاں تھا نشہ چہروں سے اس بے کیف مستی کا
یہ ارماں ہو گئے بیدار فرعونوں کے سینوں میں
کہ ممکن ہو تو دولت ساتھ لے جائیں زمینوں میں
مقابر میں ممی کے ساتھ سیم و زر بھی جا سویا
کسے تھی یہ خبر کیا زیست نے پایا ہے کیا کھویا
لٹیرے اور ڈاکو ان خزینوں تک بھی جا پہنچے
بشر کے ہاتھ مُردوں کے دفینوں تک بھی آ پہنچے
تو فرعونوں نے لاشوں کے لئے اہرام بنوائے
کہ عقل انسان کی چکرائے جب تک دیکھی جائے
یہ کہسار مہیب انسان کی قدرت کے کرشمے ہیں
یہ مزدوروں کی مجبوروں کی محنت کے کرشمے ہیں

زمیں کے صفحے پر یہ شاہکار دست آدم ہیں
یہ صحراؤں کے ذرّوں میں بہار دست آدم ہیں

مصر کا عروج و زوال

ایک تفصیلی جائزہ

دریائے نیل کے احسانات، اجتماعی زندگی کی ابتدا

بڑھا جب کاروان زندگی کچھ اور آگے کو
چلی ظلمات میں تابندگی کچھ اور آگے کو
سناتا ہے مؤرخ نیل کا اس طرح افسانہ
کہ محفل مصر تھی اور نیل تھا محفل کا پیمانہ
زمیں کی وسعتوں پہ مصر وہ آباد محفل تھی
کہ ہر اک فکر سے آزاد تھی دلشاد محفل تھی
مسافر کو یہاں کا ذرّہ ذرّہ سازگار آیا
یہ وہ صیاد تھا خود دام میں جس کے شکار آیا
یہاں گندم کے خوشے کھیتیوں میں مسکراتے تھے
روئی کا تاج پہنے سر پہ پودے لہلہاتے تھے
ہزاروں جانور ہر کام پہ خدمت کو حاضر تھے
شجر طاعت کو پیدا تھے حجر خدمت کو حاضر تھے
قباحت تھی تو بس یہ تھی کہ رود نیل کا پانی
ہمیشہ سال میں اک بار بن جاتا تھا طوفانی
یہ دریا سال میں اک بار جب طوفان اٹھاتا تھا
تو آدم زاد کو منظر قیامت کا دکھاتا تھا
نہ باقی مال رہتا تھا نہ جاں محفوظ رہتی تھی
جو رہتی تھی تو بس اک "الاماں" محفوظ رہتی تھی
مگر آزاد! ظاہر میں جو دریا کا یہ طوفاں تھا
یہ اہل مصر پہ تاریخ کہتی ہے کہ احساں تھا

ادھر تھے حملہ آور نیل کے اندازِ طوفانی
حفاظت کے لیے اُٹھا اُدھر سے عزمِ انسانی
گھروں پر اور شہروں پر جب اک طوفاں چھا جائے
تو کب ممکن کہ اک انساں اکیلا اس سے ٹکرائے
یہاں تو یہ ضرورت ہے کہ مل کر زندگی اُبھرے
اگر تخریب اُمڈے جھوم کر پائندگی اُبھرے
یہی طوفاں کہ نقشہ تھا عذابِ آسمانی کا
بنا خالق بالآخر اجتماعی زندگانی کا

یہ طوفانِ نیل کا تصویرِ احساں ہو گیا آخر
جو شر تھا خیر کی صورت نمایاں ہو گیا آخر

بشر نے اجتماعی زندگی کی قدر پہچانی
تو رودِ نیل سے رخصت ہوا اندازِ طوفانی
جو کوئی اجتماعی زندگی کا رازداں نکلا
تو گویا کارواں میں وہ امیرِ کارواں نکلا

امیری سے امیرِ کارواں شاہی تک آ پہنچا
حکومت کا طریقہ "ماہ سے ماہی تک" آ پہنچا

زمانے کے شبستاں میں حکومت کی پری چمکی
تو گویا اور سے کچھ اور تھی تصویرِ عالم کی
سنہری تخت میں جو تھی چمک دیکھی نہ جاتی تھی
طلائی تاج میں جو تھی دمک دیکھی نہ جاتی تھی
گروہوں کو مٹا ڈالا شہنشاہی کے جلووں نے
یہ سب قصہ چکا ڈالا شہنشاہی کے جلووں نے
بالآخر خود شہنشاہی سے ٹکرائی شہنشاہی
یہی تاریخ میں شاید تھی معراجِ کم آگاہی
ہوئی انجام کار اے دل! زمینِ مصر حصوں میں
حقیقت تھی مگر آخر ہوئی تقسیم قصوں میں

"شمالی" اور "جنوبی" میں ہوئی تقسیم یہ وادی
چلی یوں خاک کے ذروں پہ صیادوں کی صیادی

سرزمینِ مصر کا اتحادِ اوّلیں

ہورس کا تاریخی کارنامہ

جنوبی مصر سے اک تاجدارِ سرفروش اُٹھا
جنوں سر میں لیے دل میں لیے جوش و خروش اُٹھا
شمالی مصر کا اُس نے کلیجہ چاک کر ڈالا
مٹایا اس کو دنیا سے یہ قصہ پاک کر ڈالا
بنایا اس دیارِ غیر کو جزوِ دیار اپنا
کیا چاروں طرف اس دیس میں قائم وقار اپنا
مورخ بے خبر ہے کون یہ مردِ مہوس تھا
فسانے بعض کہتے ہیں کہ اس کا نام ہورس تھا
خود تاریخ کے اس بابِ ژولیدہ میں بے بس ہے
کہ مصری دیوتاؤں میں بھی اک کا نام ہورس ہے
فسانہ کچھ بھی ہو باقی حقیقت پھر بھی رہتی ہے
کہ اس کو اتحادِ اولیں تاریخ کہتی ہے

یہ قصہ جب کا ہے جب مصر کی اُٹھتی جوانی تھی — جب اس کی سے لیوپولیس نامی راجدھانی تھی
وہ مرکز ہے لیوپولیس کا اصلی ٹھکانہ ہے
جہاں اس وقت رودِ نیل کا دلکش دہانہ ہے

یہ دورِ اتحادِ اوّلیں دورِ طلائی تھا — یہ دورِ خود نما اک جلوۂ باطن نمائی تھا
یہ دورِ ابتدائی ایک برتر دور تھا گویا — دیارِ مصر کا تہذیب پرور دور تھا گویا
یہاں محفوظ تھا انساں بھی اور تہذیبِ انساں بھی — یہاں تھا رزق کا ساماں بھی حاصل کیفِ ایماں بھی
کہ مشرق میں بھی اک صحرا تھا مغرب میں بھی اک صحرا — شمالی حد سمندر تھی جنوبی حد پہ جنگل تھا
قدم انساں کا آگے کو بے فکری سے بڑھتا تھا — تفکر ابنِ آدم کا یہاں پروان چڑھتا تھا
تجسس نے جسے کہتے ہیں "ہل" ایجاد کر ڈالا — زمیں کی سطح کو کچھ اور بھی آباد کر ڈالا
وہی دریا جو پہلے اک قیامت کا نظارا تھا — بہ فیضِ عقلِ انسانی وہی اب محفل آرا تھا
جو رودِ نیل تھا کل تک فقط گرداب کی دنیا — بنا وہ بحرِ انساں ماہیِ بے تاب کی دنیا
چلائے اس کے سینے پر سفینے دستِ آدم نے — دکھائے کیا کہوں کتنے قرینے دستِ آدم نے
کئے ایجاد چپو بادباں بھی کر دئے پیدا — جو موسم کا پتہ دیں وہ نشاں بھی کر دئے پیدا
سفر یوں ہو رہے تھے ابنِ آدم تھا سفینے پر — سفینے چل رہے تھے نیل کے خاموش سینے پر
ہوا پیدا ذرا اک حوصلہ قلبِ شناور میں
تو داخل تھے سفینے روم کے گہرے سمندر میں

دوسرا اتحاد

میدانِ تہذیب میں مصر کے نئے معرکے

پھر پرچمِ متحدہ مصر کا گردوں پہ لہرایا — پھر اپنے آپ کو تاریخ نے اک بار دہرایا
نگاہِ آسماں نے پھر پرانا ماجرا دیکھا — جنوبی اور شمالی مصر کا نقشہ جدا دیکھا
رہی ان دونوں حصوں کی الگ تنظیم مدت تک — زمینِ مصر گویا ہو رہی تقسیم مدت تک
شمالی مصر سے اب کے شہنشاہِ جری اٹھا — دلِ بے باک میں لے کر جنونِ خود سری اٹھا
ملایا اس نے پھر دونوں کو اپنے زورِ بازو سے — یہ محفل پھر مہک اٹھی یگانہ پن کی خوشبو سے
یہ تازہ اتحاد اس سرزمیں کو سازگار آیا — چمن میں رقص فرماتا ہوا دورِ بہار آیا
دیارِ مصر کی اس دور میں قسمت چمک اٹھی — فضا ساری خرد کے نورِ پیہم سے دمک اٹھی

نوشت و خواند کا فن عالمِ ایجاد میں آیا
تخیل کا جہاں الفاظ کے ارشاد میں آیا
ہوئی آباد کاغذ پہ ادھر تصویر کی دنیا
ادھر تعمیر اس پہ ہو گئی تحریر کی دنیا
جہانِ ظرف میں اب دھات کی تھی کار فرمائی
کہ تھا تانبے کی کانوں کا ذخیرہ دشتِ سینائی
دواؤں کا عمل انسان کی روداد میں آیا
تو جراحی کا فن بھی معرضِ ایجاد میں آیا
حکومت وقت کی مضبوط بنیادی پہ قائم تھی
یہ فرعونوں کے اک اندازِ جلادی پہ قائم تھی
شہیدِ رنگ مذہب بھی اسیرِ دامِ دنیا بھی
یہ انسان آپ تھے ذوقِ تماشا بھی، تماشا بھی

یہ تھے اہرام کے صانع سفینوں کے یہ خالق تھے
بڑے مجبور تھے لیکن خزینوں کے یہ خالق تھے

گزرتا ہی رہا یہ دور بھی اپنے طریقے سے
کبھی بھونڈے وطیرے سے کبھی عمدہ سلیقے سے
بالآخر شرق سے ابھری نئی اک شانِ صیادی
ملا دی خاک و خوں میں مصریوں کی جس نے آزادی
وہی وادی جو کل تک شادکامی کا مرقع تھی
وہ اب اک تلخ کامی کا غلامی کا مرقع تھی
غلامی تھی مگر ذوقِ یقیں باقی ابھی تک تھا
دلوں میں ایک عزمِ آہنی باقی ابھی تک تھا
اسی ذوقِ یقیں نے کاٹ دی بیڑی غلامی کی
اسی نے مصر کو صورت دکھائی شادکامی کی
ہوئی دلشاد پھر اک بار گویا نیل کی وادی
یہ وادی بن گئی اک بار پھر تصویرِ آزادی
مگر یہ تشنہ کامی کی نہیں تھی آخری باری
غلامی اور آزادی کا یہ چکر رہا جاری
کبھی پابند غیروں کی کبھی آزاد غیروں سے
یہ دنیا مصر کی اکثر رہی آزاد غیروں سے
زمینِ مصر جس نے وقت کو تہذیب سکھلائی
قیامت ہے کہ خود اس کو نہ یہ تہذیب راس آئی
وہی تہذیب جس سے دہر کا چہرہ ہے نورانی
زمینِ مصر کے حق میں بنی وجہِ پریشانی

بس اس خاطر کہ جیتے زندگی ارمان کی بازی
قلوپطرہ نے بھی آخر لگا دی جان کی بازی

قلوپطرہ کا نام اب تک جہاں بھولا نہیں ہوگا
مذاقِ عاشقی یہ داستاں بھولا نہیں ہوگا
وہ جس کے حسن کے پرتو سے ہے تاریخ تابندہ
وہ جس کے تذکرے سے محفلِ ہستی ہے رخشندہ
وہ جس کے ذکر میں اب تک شراروں کی تجلی ہے
بہاروں کی لطافت چاند تاروں کی تجلی ہے
وہ حسن و ناز کا پیکر وہ اک تصویر خوبی کی
وہ قرطاسِ جہاں پہ جلوہ گر تحریر خوبی کی
وہ اک مجموعۂ خوبی وہ اک تنویرِ محبوبی
قلم کاروں کی فن کاروں کی وہ تصویرِ محبوبی
اسی وادی کو غیروں سے بچانے کے لئے نکلی
یہ بجلی اپنی تیزی آزمانے کے لیے نکلی
جو وہ چمکی تو اپنے عزم کو شمشیر زن بھولے
ہے کیا اندازِ ناوک افگنی ناوک فگن بھولے

جو آئے جان لینے جان دے دینے کو حاضر تھے
فقط اک جان کیا ایمان دے دینے کو حاضر تھے

جو گھوڑوں پہ سوار آئے تھے خاک راہ ہو بیٹھے
جو نعرہ بن کے آئے تھے وہ اب اک آہ ہو بیٹھے

نہ صیادی میں وہ خوش تھے نہ لوٹ آنے پہ راضی تھے
کہ جو صیاد آئے صید بن جانے پہ راضی تھے

کہیں بے بس رسالے تھے کہیں بے بس سپاہیں تھیں
کماں تھے اس کے ابرو اور تیر اس کی نگاہیں تھیں

یہی کچھ ایک مدت جنگ کا نقشہ رہا جاری
کہ تھی فوجوں پہ بھاری اک حسینہ کی فسوں کاری

مگر وہ ایک آگسٹس کہ ان سب سے نرالا تھا
جری تھا سورما تھا مات یوں کب کھانے والا تھا

نہ اس نے زندگی ڈھالی تھی اپنی اس قرینے میں
کہ تھا دل کے عوض پتھر کا ٹکڑا اس کے سینے میں

نہ چل پایا قلوپطرہ کا سحر دلنشیں اس پہ
جو یہ دیکھا کہ ہے توہین آمادہ ستم پرور

اجل کے جام میں زہر ہلاہل گھول کر پی کر
ذرا سی دیر میں مر کر ہمیشہ کے لیے جی کر

سپرد موت کر دی حسن نے تابندگی اپنی
دیار مصر پہ قربان کر دی زندگی اپنی

ہوئی رخصت زمانے سے زمانے کی وہ محبوبہ
نصیبہ مصر کا پھوٹا، بنا وہ روم کا صوبہ

بابل، شط العرب، نینوا اور ہندوستان میں تہذیب کی کرنیں

ہوئی جس شمع سے روشن دیار مصر کی محفل
اسی کی ضو سے چمکی کائنات خطۂ بابل

اسی تنویر سے شط العرب بھی جگمگا اٹھا
یہ غنچہ بھی اسی باد سحر سے مسکرا اٹھا

یہ بجلی نینوا پر آ کے اس انداز سے چمکی
کہ پہلے سے منور تر ہوئی تصویر عالم کی

تمدن نے مقدر نینوا کا آ کے چمکایا
تو بابل کیا دیار مصر بھی زیر نگیں آیا

مگر بابل کی قسمت کا ستارا پھر چمک اٹھا
اندھیرے میں تمدن کا ستارا پھر چمک اٹھا

یہ بابل بن گیا فن و ہنر کا ایک گہوارہ
چمک اٹھا یہاں پھر علم کی تقدیر کا تارا

مقدر کو مگر اس کی نہ تھی منظور یہ عظمت
کہ ایرانی گڈریوں نے مٹا دی آ کے یہ شرکت

گڈریوں کی حکومت بھی فقط اک عارضی شے تھی
بڑا ناپائدار اس کا نشہ نکلا یہ وہ مے تھی

سکندر نے گڈریوں کی حکومت کو مٹا ڈالا
حسیں وادی کو اپنے دیس کا حصہ بنا ڈالا

سکندر کی حکومت کو لتاڑا روم والوں نے
عجب اس خاک کا حلیہ بگاڑا روم والوں نے

جب اہل روم کا سکہ جما اس خاک پہ آ کر
تو اس پہ حملہ آور ہو گیا ترکوں کا اک لشکر

وہ رن گھمسان کا آخر پڑا شاداب وادی میں
ہزاروں جان اپنی دے گئے بے آب وادی میں

نہ تھا محفوظ مال اس میں نہ جاں محفوظ تھی اس میں
اگر کچھ تھی تو بس اک "الاماں" محفوظ تھی اس میں

کچھ اس انداز سے ٹکرائیں شمشیروں سے شمشیریں　　کہ تقدیروں کے آگے ہو گئیں مجبور تدبیریں
ہوا جب خاتمہ اک روز اس قہرِ الٰہی کا　　تو اس شاداب وادی میں یہ عالم تھا تباہی کا
کہ آدم کا نشاں اس خاک پر تارے نہ پاتے تھے
کھنڈر ہی عظمتِ ماضی کا افسانہ سناتے تھے

سندھ کی وادی پر ایک نظر

مؤرخ جب کبھی روداد بھارت کی سناتا ہے　　تو اس کے تذکرے کی کیفیت میں ڈوب جاتا ہے
وہ کہتا ہے کہ یہ دنیا بھی اتنی ہی پرانی ہے　　عراق و مصر و بابل کے برابر کی کہانی ہے
ہڑپے کے خرابے یہ نشاں موہنجو دارو کے　　حقائق کی ہیں تصویریں تخیل کے نہیں دھوکے
قدم صحراؤں کے چھوتی ہوئی یہ سندھ کی وادی　　گھڑی ہو دیو زادوں میں کوئی جیسے پری زادی
زمانے کی انگوٹھی کا بڑا نایاب ہیرا ہے　　یہیں آ کر تجلی نے جگر ظلمت کا چیرا ہے
یہاں تہذیب کا جو رنگ تھا کیا اب سناؤں میں　　تنوع سے بھرا موضوع کیسے لب پہ لاؤں میں
ضرورت کی یہاں ہر چیز ملتی تھی بآسانی　　یہاں کپڑے کی بھی بہتات غلے کی فراوانی
امیری کا غریبی کا یہاں جھگڑا نہ تھا کوئی　　یہاں نیچا نہ تھا کوئی یہاں اونچا نہ تھا کوئی
عراق و مصر و بابل میں تو شاہی تھی فقیری تھی　　یہاں دونوں نہ تھیں بس اک امیری ہی امیری تھی
بڑے آرام سے اپنے گھروں میں لوگ رہتے تھے　　نہ جورِ بادشاہی تھا نہ وہ یہ جور سہتے تھے
مکاں آباد تھے وہ جن میں جنت کے نمونے تھے　　جو کنبے تھے محبت کے مروت کے نمونے تھے
جب اوروں نے طریقہ بھی نہ سیکھا تھا نہانے کا　　رواج اس دیس میں پھیلا ہوا تھا غسل خانے کا
ہنر بھی اوج پر تھا اور مذہب بھی بلندی پر　　رواں تھے اس جگہ کے لوگ راہِ حق پسندی پر
تجارت ہو رہی تھی مصر سے فارس سے بابل سے　　ہزاروں میل [illegible] تھے دلوں کے رابطے دل سے
یہاں سونا بھی تھا، چاندی بھی تھی ہیرے بھی موتی بھی　　یہاں تھی لعل [illegible] روشنی گوہر کی جوتی بھی
نظامِ شہر کہتا ہے جسے اس دور کا انساں　　یہ نطقِ گارڈن سٹی کہ تھا موجود یہ ساماں
کئی قانون تھے موجود امورِ شہرداری کے　　سبھی ساماں تھے اس باغ میں فصلِ بہاری کے
ترقی کی غرض اک دلنشیں تصویر تھا بھارت
ہزاروں سال پہلے بھی حسیں تصویر تھا بھارت

شاد عارفی

منزلیں۔ اشعار کہہ چلنے میں۔ آساں ہوگئیں
آہ وہ غزلیں جو صرفِ یادِ جاناں ہوگئیں

سبزہ و گل پہ بہاریں شبنم افشاں ہوگئیں
کیا فضائیں بھی شریکِ دردِ انساں ہوگئیں

جس قدر نزدِ نقابِ روئے جاناں ہوگئیں
جستجوئیں اور حیران اور حیراں ہوگئیں

کہہ گیا ہوں گا۔ جنونِ شوق کی تائید میں
مجھ سے جو باتیں خلافِ طبعِ درباں ہوگئیں

مشکبو زلفیں۔ جنھیں کافر کہا جاتا رہا
عارضِ گلرنگ پر آکر مسلماں ہوگئیں

صبحِ نو کی نکہتیں "احباب دسمے" کی صحبتیں
کچھ پریشاں اور کچھ خوابِ پریشاں ہوگئیں

حسن کی فطرت ہے اربابِ الم کی دلبری
التجائیں اپنی تاثیروں پہ ۔ نازاں ہوگئیں

جب سے ہم نے الجھنوں کو مقصدِ ہستی کہا
الجھنیں ۔ ہم غم نصیبوں سے ۔ پریشاں ہوگئیں

دھجیوں کو جبکہ آخر کار کچھ بننا ہی تھا
وہ جو دامن بن نہیں پائیں گریباں ہوگئیں

جن جراحتہائے دل کو تھی توقع آپ سے
رفتہ رفتہ آپ سے مایوسِ درماں ہوگئیں

ہیں یہی "آبادکارانِ وطن" تو ایک دن
"دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں"

"خلد میں ہم ان پریزادوں سے لیں گے انتقام"
اب یہ روحیں ہوں کہ حوریں ہوں جو انساں ہوگئیں

غالبِ مرحوم کے ہم بے تکلے نقالِ شاد
مشکلیں ہم پر پڑی کب تھیں کہ آساں ہوگئیں

عبدالمجید حیرت

دیوانے تو ہیں دیوانے — ہم ہی کون سے ہیں فرزانے
آپس میں وہ ربط کہاں ہے — بکھرے ہیں تسبیح کے دانے
ہوتی ہے اک بات ذرا سی — بن جاتے ہیں سو افسانے
اک دنیا یہ بھی کہتی ہے — اپنوں سے اچھے بیگانے
کاش کہیں بھی اونچے ہوتے — جتنے اونچے تھے کاشانے
اب کیا رکھا ہے، یہ دیکھو — تھے، جب تھے، بھرپور خزانے
شمع کی لَو ایسی تو نہیں تھی — ٹوٹ پڑے جس پر پروانے
یہ محرومی اُن سے پوچھو — خالی ہیں جن کے پیمانے
پیرِ مغاں اسے کاش یہ سمجھے — رند نہیں، تو کیا میخانے
آنکھیں ہوں تو دیکھے کوئی — یہ آبادی، یہ ویرانے

دیکھے تھے ہم نے بھی، حیرت
کیسے کیسے خواب سہانے

امتیاز علی عرشی

تمھاری مہربانی ہم پہ گرچہ کم نہیں ہوتی
چراغِ آرزو کی لَو، مگر، مدھم نہیں ہوتی

جہنّم کا دھواں بھر جائے ایسی آنکھ میں یارب
کسی کے دکھ پہ جو تھوڑی بہت بھی نم نہیں ہوتی

اگر باقی ہے دل میں آرزو کی کوئی چنگاری
تو پھر یہ زندگی کی آگ بھی مدھم نہیں ہوتی

تمنّا ہے کبھی کاکل کا حسنِ برہمی دیکھیں
مگر قسمت کو کیا کیجے کہ یہ برہم نہیں ہوتی

ڈبو دے کوئی ہم کو لے کے طوفانِ حوادث میں
کہ قطروں سے ہماری پیاس بالکل کم نہیں ہوتی

ہے دل میں آج بھی پیوست نیشِ آرزو لیکن
خدا جانے خلش کیوں ان دنوں پیہم نہیں ہوتی

بجھا دیتے گلوں کی پیاس ہم اپنے پسینے سے
چمن تازہ یونہی رہتا، اگر شبنم نہیں ہوتی

نشانِ جم تو مل جاتا ہے کوشش سے مگر عرشی
عطا ہر اک کو اس دنیا میں خوئے جم نہیں ہوتی

کون لے گیا؟

خلیل الرحمٰن اعظمی

وہ رنگِ رُخ، وہ آتشِ خوں کون لے گیا؟ — اے دل ترا وہ رقصِ جنوں کون لے گیا؟
زنجیرِ آنسوؤں کی کہاں ٹوٹ کر گری؟ — وہ انتہائے غم کا سکوں کون لے گیا؟
دردِ نہاں کے چھین لیے کس نے آئینے؟ — نوکِ مژہ سے قطرۂ خوں کون لے گیا؟
جو مجھ سے بولتی تھیں وہ راتیں کہاں گئیں؟ — جو جاگتا تھا سوزِ دروں کون لے گیا؟
کس موڑ پر بچھڑ گئے خوابوں کے قافلے — وہ منزلِ طرب کا فسوں کون لے گیا؟
جو شمع اتنی رات جلی کیوں وہ بجھ گئی؟ — جو شوق ہو چلا تھا فزوں کون لے گیا؟

خود مجھ کو لے گیا ہے کوئی مجھ سے مانگ کر
ڈھونڈوں کہاں، میں کس سے کہوں کون لے گیا؟

شاعر لکھنوی

خود کو جو اہلِ نظر، اہلِ وفا کہتے ہیں
دیکھنا ہے کہ ستمگر وہ کیا کہتے ہیں

عشق کی سادہ مزاجی کو خطا کہتے ہیں
ہائے کیا دور ہے کیا لوگ ہیں کیا کہتے ہیں

اور کچھ وسعتِ مفہوم بڑھانے کے لیے
ہم ترے حسن تغافل کو ادا کہتے ہیں

کتنی کلیوں کی مہک لوٹ کے لے جاتی ہے
وہ سبک گام جسے بادِ صبا کہتے ہیں

غنچہ و گل کو بصد شوق وہ پامال کریں
اس زمانے میں اسے شوخیٔ پا کہتے ہیں

عشق اُسے سرخیٔ رخسار بنا دیتا ہے
آپ جو بات بعنوانِ حیا کہتے ہیں

کیجیے جرأت گستاخ نگاہی کہ یہاں
لوگ معصوم نگاہی کو خطا کہتے ہیں

ہم سے سیکھے کوئی جینے کی ادا اے شاعر
ہم کہ جینے کو بھی اک رسم وفا کہتے ہیں

واسوخت

نور بجنوری

پیکرِ مہر و وفا سمجھے تھے
او ستم گر! تجھے کیا سمجھے تھے

ٹھوکریں پہلے بھی کھائی تھیں مگر
تجھ کو اوروں سے جدا سمجھے تھے

تھی وہ اپنے ہی لہو کی سرخی
ہم جسے رنگِ حنا سمجھے تھے

ہم کڑی دھوپ کے جھلسائے ہوئے
تیری زلفوں کو گھٹا سمجھے تھے

ناز تھا رشتۂ الفت پہ ہمیں
تجھ کو زنجیرِ بپا سمجھے تھے

ایک زرتار بگولہ تھا جسے
شاخِ گل، دستِ صبا سمجھے تھے

آخرِ کار بھٹکنا تھا ہمیں،
سائے کو راہ نما سمجھے تھے

تیرہ بختی یہ ہماری کہ تجھے
مہروش، مہ لقا سمجھے تھے

وہ بھی اک حسنِ طلب تھا شاید
ہم کہاں بندِ قبا سمجھے تھے

ہائے وہ سادگیٔ عہدِ جنوں
ایک پتھر کو خدا سمجھے تھے

ظہور نظر

جو کچھ تری جفا سے بچا نذرِ مے کیا
ہم نے دلِ خراب کا خوں پے بہ پے کیا

سہتے رہے عذاب ترا اور چپ رہے
نالہ ہمیں نے عشق میں پابندِ نے کیا

اس پر بھی خوش نہیں ہے زمانہ تو کیا کریں
ہم سے تو زندگی نے کہا جو بھی ہے کیا

راہِ وفا سے ترکِ محبت کے موڑ تک
صدیوں کا فاصلہ تھا جسے ہم نے طے کیا

کس دُھن میں اب یہ باغِ غمِ دل کرے نظر
جب تک ترے فریب کی ٹوٹی نہ لے کیا

راز یزدانی

حسابِ ہوش یہاں اب تک شمار ہو نہ سکا
جو کام عقل سے دیوانہ وار ہو نہ سکا

جنوں بشانِ خرد ناگوار ہو نہ سکا
مگر جنوں سے بھی دل کو قرار ہو نہ سکا

وہ گل سے کم ہے بہاروں کی رازداری میں
جو خارِ اہلِ چمن میں شمار نہ ہو نہ سکا

تری وفا تو ہے تیری وفا مگر اے دوست
تری جفا پہ کبھی اختیار ہو نہ سکا

غلط نہیں تری معصومیٔ نگاہ مگر
غلط فسانۂ منصور و دار ہو نہ سکا

یہاں تصورِ آئینِ نخل بندی ہے
چمن میں واقفِ ظرفِ بہار ہو نہ سکا

سزا ملے تو یہی اک خطا بھی کیا کم ہے
کہ نازِ دوست تغافل شعار ہو نہ سکا

خرد تو پھر بھی حدِ خرد بھی بھٹک گئی لیکن
جنوں بھی صرفِ تمنائے یار ہو نہ سکا

تمہارے غم کو میں دل سے لگا تو لوں لیکن
تمہارا غم بھی اگر دل فگار ہو نہ سکا

وہ اک شباب کی تہمت تو ہے شباب نہیں
جو تم کو دیکھ کے تم پہ نثار ہو نہ سکا

سہی ندامتِ عرضِ سکوں بھی راز مگر
سکوں حریفِ دلِ بے قرار ہو نہ سکا

شفقت کاظمی

کب تک کوئی آسرا لگائے
جب تجھ کو خیال ہی نہ آئے

اُس آگ میں کب سے جل رہا ہوں
جس آگ نے گھر کے گھر جلائے

آئی ہیں چمن میں جب بہاریں
بچھڑے ہوئے دوست یاد آئے

ہم دل سے اُنھیں تو کیا بُھلاتے
خود وہ بھی ہمیں بھلا نہ پائے

ہم آپ ہی اب کریں تجسس
احباب تری خبر نہ لائے

جن سے نہ ہوا نباہ شفقتؔ
اکثر وہی لوگ یاد آئے

اقبال صفی پوری

حیا کے بار سے نظریں جھکی جھکی جیسے
ملے ہیں وہ مگر اس طرح اجنبی جیسے

بہت ہے دل کے لیے اُن کی کم نگاہی بھی
مجھے تو دولتِ کونین مل گئی جیسے

وہ یوں خیال سے گزرے ہیں موجِ مے گویا
وہ یوں نگاہ میں آئے ہیں روشنی جیسے

خنک خنک سی یہ بوندیں، یہ نرم نرم پھوار
چھلک اُٹھے ترے لہجے کی نغمگی جیسے

نہیں ہے دل کے دھڑکنے کی بھی کوئی آواز
کسی کی یاد بہت دور لے گئی جیسے

کبھی کبھی تو کسی کا خیال یوں آیا
ذرا سی دیر کو ہو جائے روشنی جیسے

ترے بغیر یہ عالم ہے دیدہ و دل کا
کسی فسانے میں عنوان کی کمی جیسے

وہ جب قریب سے گزرے تو یہ ہوا محسوس
گزر رہی ہو دبے پاؤں زندگی جیسے

بہت ہے شورِ اُجالوں کا پھر بھی اے اقبال
بھٹک رہا ہے اندھیروں میں آدمی جیسے

تابش دہلوی

حسن، پنہاں ہے تو پنہاں ہی سہی
ہم ہمہ آئینہ حیراں ہی سہی

دسترس میں تو ہو کچھ نقدِ بہار
ہاتھ آئے تو گریباں ہی سہی

فاصلہ کم بھی تو دوری ہے بہت
وہ ترا قربِ رگِ جاں ہی سہی

رنج الفت کی تلافی ہے محال
تو جفاؤں پہ پشیماں ہی سہی

زلف کے سائے میں کٹ جائے گی عمر
اب وہ اک خوابِ پریشاں ہی سہی

کیجیے پاسِ روایاتِ چمن
نام وحشت کا بہاراں ہی سہی

پیرہن ہو تو چکا نذرِ بہار
اب کوئی تارِ رگِ جاں ہی سہی

عیشِ یک لمحہ تو قائم بھی نہیں
برق اک شمعِ شبستاں ہی سہی

دورِ تابشؔ میں غزل ہی سے ہنوز
ہم غزل سنج و غزلخواں ہی سہی

شمع خاموش ہے

مظہر امام

شامِ واماندہ کی آزردہ خزاں سامانی
اپنی نگوں گشتہ تمناؤں کا انبار لیے
چپکے چپکے سے غم خانے میں در آئی ہے
دشتِ ویراں میں اُترنے لگے ظلمت کے عقاب
ہو گئیں بارِ خموشی سے فضائیں بوجھل
شمع خاموش ہے، تاریک ہے ایوانِ حیات
دُکھ سے بھرپور ہے شوریدہ جوانی کا ایاغ
اپنے چہرے پہ فسانے ہیں گراں باری کے
مرقدِ چشم میں ہیں سوختہ آنسو مدفون،
قلبِ مجروح، غمِ وقت کا گہوارہ ہے
موجِ طوفانِ حوادث کے طمانچے کھاتا
جیے جاتا ہوں کہ جینے کی بھی پابندی ہے!

میری ہی طرح بلکتی ہوئی روحوں کا ہجوم
جیے جاتا ہے کہ مرنا بھی نہیں ہے بس میں
کہیں انفاس کے ہونٹوں پہ سسکتی ہے حیات
منجمد ہے کہیں احساس کی پلکوں پہ لہو!
کہیں تپتے ہوئے، جلتے ہوئے لب نوحہ کناں
تشنگی اپنی کسی لب سے بجھانے کے لیے
کہیں معصوم تمنائیں دریدہ دامن
اپنی طفلانہ خطاؤں کی عقوبت کا شکار
اور ندامت کی یہ زنجیر، یہ کالی ناگن
مضمحل آہوں، تھکی سانسوں کا سینہ جکڑے
روحِ ایام کو ڈستی ہی چلی جاتی ہے!

اور اس پر بھی ہے جبّار کا حکمِ جاں سوز
بس جیے جاؤ — کسی شکل سے جیتے ہی رہو!

احمد ظفر

شب کی تنہائی میں دیکھے ہیں کچھ ایسے منظر
چاند میں داغ جگر تھا تو ستارے اخگر

دل کے ساحل پہ امیدوں کے سفینے ڈوبے
پھول سے لب بھی ترے دیکھ رہا ہوں پتھر

آئنہ تو ہے تو میں اس میں نظر آؤں گا!
جس طرح میرے تصور میں ہے تیرا پیکر

میں وہ دریا ہوں جو چپ چاپ گزر جاتا ہے
اور آوازیں ڈھل جاؤں تو شور محشر!!

میں کسی طور بھی گم گردۂ منزل نہ رہا
دل کے صحرا میں میرا درد تھا میرا رہبر

رُت بدلتی ہے تو ہر چیز بدل جاتی ہے
کلیاں آنکھیں نظر آتی ہیں تو غنچے ساغر

میرے بت خانہ احساس میں آؤ تو کبھی
وقت نے دیکھو بنا ڈالا ہے مجھ کو آذر

جمیل ملک

تاروں کی انجمن میں، نہ شمس و قمر میں ہے
وہ روشنی جو دیدۂ اہلِ ہنر میں ہے

یوں لہلہا رہی ہے مرے دل میں چاندنی
جیسے وہ مہتاب یہیں، میرے گھر میں ہے

یہ زندگی کا کھیل، بہت مختصر سہی!
اک حسن، اک اُٹھان تو رقصِ شرر میں ہے

وہ ناز و غمزہ، دشنہ و دشنام کیا ہوئے؟
بیٹھی ہوئی سپاہ تری رہگزر میں ہے!

صدیاں گزر گئیں، اسے کوئی نہ پا سکا،
جو حرفِ التماس ہماری نظر میں ہے

صبحِ ازل چلا تھا کوئی رختِ جاں لیے
دیکھ اے ابد کی شام! مسافر سفر میں ہے

چمکائے گا کچھ اور، اُجالا، اسے جمیل
راتوں کا سوز و ساز اگر چشمِ تر میں ہے

بشیر بدر

پتھر کے جگر والو، غم میں وہ روانی ہے — خود راہ بنا لے گا بہتا ہوا پانی ہے

اک ذہنِ پریشاں میں خوابِ غزلستاں ہے — پتھر کی حفاظت میں شیشے کی جوانی ہے

دل سے جو چھٹے بادل تو آنکھ میں ساون ہے — ٹھہرا ہوا دریا ہے بہتا ہوا پانی ہے

ہم رنگِ دلِ پُرخوں ہر لالۂ صحرائی — گیسو کی طرح مضطر اب رات کی رانی ہے

جس سنگ پہ نظریں کیں خورشیدِ حقیقت ہے — جس چاند سے منہ موڑا پتھر کی کہانی ہے

اے پیرِ خردمنداں دل کی بھی ضرورت ہے — یہ شہرِ غزالاں ہے یہ ملکِ جوانی ہے

غم وجہِ دلِ افگار دل غم وجہِ قرارِ دل — آنسو کبھی شیشہ ہے آنسو کبھی پانی ہے

اس آسرائے دل پر ہم نے بھی کفن پہنا — ہنس کر کوئی پوچھے گا کیا جان گنوانی ہے

دن تلخ حقائق کے صحراؤں کا سورج ہے — شب گیسوئے افسانہ یادوں کی کہانی ہے

وہ حسن جسے ہم نے رسوا کیا دنیا میں — نادیدہ حقیقت ہے ناگفتہ کہانی ہے

وہ مصرعِ آوارہ، دیوانوں پہ بھاری ہے — جس میں ترے گیسو کی بے ربط کہانی ہے

ہم خوشبوئے آوارہ ہم نورِ پریشاں ہیں
اے بدرؔ مقدر میں آشفتہ روانی ہے

اختر ہوشیارپوری

انہی راہوں میں خراماں ہوگی — تو نہیں بوئے گلستاں ہوگی
ہم تو چپ ہیں کہ جہاں سنتا ہے — اب خموشی ہی غزلخواں ہوگی
تم نہیں ہوگے تو خود ذات مری — میرے افسانے کا عنواں ہوگی
جانتے ہم تو نہ خواہش کرتے — بوئے گل بوئے پریشاں ہوگی
کیا خبر تھی مرے سینے کی جلن — تیری صورت سے نمایاں ہوگی
زیست ہر حال میں کٹ جائے گی — تم نہ ہوگے شب ہجراں ہوگی
سرد جب ہوگی سلگتی ہوئی شام — دل میں اک آگ فروزاں ہوگی
شب کا سناٹا صدائیں دے گا — بے کلی سلسلہ جنباں ہوگی
دل رہین غم جاناں ہوگا — جاں اسیر غم دوراں ہوگی
تجھ کو دیکھا ہے تجھے چاہا ہے — اور کیا زیست پریشاں ہوگی
روزن در سے کوئی جھانکتا ہے — خلش عمر گریزاں ہوگی
کوئی کرتا ہے اشارے شب بھر — یاد ایام بہاراں ہوگی
دل کے انداز پتہ دیتے ہیں — دولت درد فراواں ہوگی
تجھ کو پا کر بھی پریشاں ہے حیات — تجھ سے چھٹ کر بھی پریشاں ہوگی

کس کو معلوم تھا اختر اک دن
آرزو ریگ بیاباں ہوگی

آتش لدھیانوی

دل کبھی غم سے سکوں پاتا نہیں
موج کو ساحل کہا جاتا نہیں

مجھ سے اتنی بے رُخی اچھی نہیں
کوئی اُس کو جا کے سمجھاتا نہیں

کچھ کہوں تو عشق رسوائے جہاں
چپ رہوں تو چپ رہا جاتا نہیں

کب خوشی پہلو تہی کرتی نہیں
کب کوئی غم دل کو بہلاتا نہیں

دھڑکنیں دل کی سُنی باقی نہیں
دیکھتے ہیں جو کہا جاتا نہیں

اس قدر ویرانیوں کے باوجود
دل ہے آتش راہ پر آتا نہیں

پرتو روہیلہ

ان کا دامن میرے ہاتھ
ہائے فریبِ امکانات

وقت کی آہٹ بڑھتی جائے
جیسے جیسے بھیگے رات

پریت ہماری ان دیکھی ہے
ان کا روپ کہی ہوئی بات

راہِ طلب میں منزل منزل
سائے تھے جو آئے ساتھ

ٹھنڈی آہیں تیری دین
ویراں دل تیری سوغات

سیکرٹری

علی عباس حسینی

۱۹۳۵ء کا واقعہ ہے۔۔

مکیش نے آکسفورڈ سے ڈگری پوری کر کے بیرسٹری کی سند لی ہی تھی کہ خبر ملی بیٹے پر پانی کی طرح روپیہ بہانے والے پتاجی پرلوک باشی ہوگئے۔ وہ ہمیشہ کے شاہ خرچ تھے۔ اس لیے نہ گھر میں دبا دبایا کچھ رکھا تھا نہ بنک میں کچھ بچا کچا پایا۔ وہ جیسے تیسے ہندوستان واپس آیا تو اسے محسوس ہوا کہ بیس بائیس آدمیوں کا بڑا سا خاندان اسی کو چلانا ہے۔ اور اس کے پاس تھیں صرف چند سندیں۔ بیرسٹری کی دوکان لگانے کے لیے بھی تو کچھ ٹیم ٹام کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہاں روزانہ کا خرچ بھی قرض ادھار پر چل رہا تھا۔ کیا نہ کرے، کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ انھیں پریشانیوں میں بلونت اس کے دوست نے، اخبار میں چھپے ہوئے ایک اشتہار کی طرف توجہ دلائی۔ ایک ہز ہائینس کو ایک پرائیویٹ سیکریٹری کی ضرورت تھی۔ محل میں قیام و طعام کے علاوہ پانچ سو روپیہ ماہوار تنخواہ۔

اس نے کہا "لو یہ منہ مانگی مراد بر آئی!"

مکیش نے کہا "نہ بابا، مجھ سے ان ہز ہائینسوں کے غترے ڈبے نہیں سہے جائیں گے۔"

بلونت ہنس کر بولا "مگر ان کے ساتھ ساتھ ہز ہائینسوں کے نخروں کے چٹخارے بھی تو ہیں!"

مکیش نے ناک سکوڑ کر کہا "وہ تو۔۔۔ غضب ڈھاتے ہیں منظور نظر بنے نوجوان کے لالے، ان کے معیار پر پورے نہ اترے تو ہر سنے کان بھرے جا رہے ہیں۔ اور وہاں یہ حال کہ "گئے بہ دشنامے خلعت دہند وگہے بہ سلامے بر نجند!"

بلونت بولا "اجی مرد بچہ سب کچھ جھیل جاتا ہے۔ پھر تمھارے معاملے میں سوال یہ ہے کہ بیرسٹری کی دوکان لگاتے لگاتے برسوں لگ جائیں گے اور تمھارے گھر کا یہ حال ہے کہ ہر روز کنواں کھودو تو پانی بھرو!"

مکیش نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہاں بھئی اپنے اکیلے کا معاملہ ہوتا تو میں روکھی سوکھی کھا کر بسر کر لیتا مگر ماں بہنوں کو کیا کھلاؤں کیا پہناؤں۔۔۔۔۔!"

بلونت نے اشاروں سے بے بسی ظاہر کرتے ہوئے کہا "اسی لیے تو کہتا ہوں کہ اپنی آزادی اور خودداری کی بھینٹ چڑھاؤ۔۔۔۔۔۔"

مکیش نے کہا "ہاں، مگر......"

ابھی وہ کچھ اور کہنے والا ہی تھا کہ اس کی ماں نے اندر سے پکار کر کہا "ارے مکیش تم نے کچھ بندوبست کیا؟"

مکیش نے بلونت کی طرف مہربانی نگاہوں سے دیکھا۔ اس نے خاموشی سے پرس سے دس دس کے پانچ نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔

مکیش ماتھے سے پسینہ پونچھتا اندر گیا اور ماں کو روپے دے کر فوراً پلٹ آیا۔ اسی دن اس نے سیکرٹری کی اسامی کے لیے درخواست بھیج دی۔

ایک ہفتہ بعد پہلا انٹرویو ہوا۔ ریاست کے ایک وزیر ایک مقامی ہوٹل میں درخواست دہندگان کی شخصیت کا معائنہ کرنے کے لیے آکر مقیم ہوئے۔ بیس پچیس امیدواروں کے ساتھ مکیش کو بھی تقریباً ایک گھنٹہ ہوٹل کے برآمدے میں کھڑے رہنا پڑا۔ بارے اس کی باری آئی۔ ہوٹل خاصا مہنگا تھا۔ اس لیے کمرہ بالکل جدید طریقے پر سجا تھا۔ اس میں "براجمان" تھے ایک سوکھے سے ٹھگنے منتری جی ایک میلی سی بنڈی اور دھوتی میں ملبوس۔ مکیش کے دھڑکتے ہوئے دل میں ان کی صورت دیکھتے ہی عجیب طرح کی خود اعتمادی پیدا ہوگئی۔ چھ فٹ کا جوان، خوبرو خوش پوش آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ ایسے دلیسوں کو کیا دھیان میں لاتا ہے۔ مگر ریاستی وزیر گرم و سرد زمانہ سے واقف، بڑا ہی منجھا ہوا جہاں دیدہ تھا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں مکیش کو اٹھایا، بٹھایا، چلایا پھرایا۔ اس نے مکیش کو اس طرح دیکھا جس طرح گھوڑا خریدتے وقت اس کی دُم، سُم، کنوتیاں، جنوریاں دیکھتے ہیں۔ اب تک باتیں مادری زبان میں تھیں۔ اس نے دفعتاً پٹری بدلی۔ انگریزی میں گفتگو کرنے لگا۔ مکیش نے آکسفورڈ کے خاص لب و لہجے میں جب انگریزی پھول بکھیرنا شروع کر دیے تو منتری جی گھبرا کر تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حاکموں کی مقدس زبان، حاکموں کے خاص لب و لہجے میں "قرات" کی جا رہی تھی، ایسے میں کرسی پر نہیں بیٹھا جا سکتا تھا!

پھر بھی سیکرٹری کو صرف زبان ہی نہیں چلانا پڑتی اسے قلم بھی تو گھسنا پڑتا ہے۔ اس لیے مکیش دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہاں اسی کی طرح کے پانچ خوش قسمتوں کو تین خطوں کے جواب اور ایک تقریر لکھنے کا حکم دے دیا گیا۔ دو خطوں میں دو اداروں کی طرف سے چندہ کی اپیل کی گئی تھی اور ایک میں ایک انجمن نے سرپرستی کی درخواست کی تھی۔ تقریر کے لیے موضوع تھا "ایک ادبی جلسے کے لیے خطبۂ صدارت"

مکیش نے چندے والے خطوں کے جواب میں لکھا "ہز ہائنس نے خیر و خیرات کے لیے ایک علیحدہ محکمہ قائم کر رہا ہے۔ آپ اسی سے خط و کتابت کریں" نیچے قوسین کے درمیان ایک نوٹ میں لکھا کہ "اس جواب سے سرکار عالی کی خوش انتظامی کی بھی تعریف ہوگی اور جود و سخا کی بھی۔ ہر جگہ چرچے ہونے لگیں گے کہ سرکار نے خیر و خیرات کے لیے ایک خاص محکمہ قائم کر رکھا ہے۔"

سرپرستی چاہنے والی انجمن کو لکھا کہ "سرکار عالی آپ کی انجمن کی سرپرستی کرنے سے معذور ہیں۔ وہ حد درجہ عملی آدمی ہیں اور ہمیشہ عمل کو قول پر ترجیح دیتے ہیں۔ لیکن چونکہ انھیں ڈاکٹروں نے ریاست کے ضروری انتظامات کے علاوہ کسی نئے کام میں ہاتھ ڈالنے سے سختی سے منع کیا ہے، اس لیے وہ کسی نئی انجمن کی سرپرستی قبول نہیں فرما سکتے" — اس پر نیچے قوسین میں نوٹ میں لکھا کہ "ہر انجمن والا یہی چاہتا ہے کہ وہ کسی بڑے آدمی کا نام سرپرستی میں حاصل کرلے اور اس کے نام نامی کو اچھال کر

بہانے سے خوب چندے وصول کرے۔ اس لیے سوائے چند مخصوص حالتوں کے سرکار عالی کو کسی انجمن کی سرپرستی نہ قبول فرمانا چاہیئے۔"

خطبۂ صدارت میں ادب برائے ادب کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اس کی تہذیبی اہمیت پر زور دیا تھا۔ قدیم اقدار کی حمایت کی تھی۔ نیچے نوٹ میں لکھا تھا "اس مقالہ کو سرکار عالی خود ہی اپنی زبان گہربار سے "ڈکٹیٹ" فرمائیں گے۔ یہ تو میرے اپنے ہذیانات ہیں جو میری جہالت کے پول کھولتے ہیں۔"

جب تحریری مقابلے کے نتیجوں کے سلسلے میں منتری جی مختلف جوابات کا ہز ہائینس سے ذکر کر رہے تھے، تو اس وقت ہر ہائینس بھی موجود تھیں۔ انھوں نے مکیش کے جوابات میں بہت دلچسپی ظاہر کی اور انھیں منگوا کر خود بہ نفس نفیس پڑھا اور بہت سراہا۔ انھوں نے بھی انگریزی گورنسوں سے تعلیم پائی تھی اور وہ حسن کے ساتھ ساتھ علم کے زیور سے بھی آراستہ تھیں۔ سیکرٹری کے انتخاب میں ان کی رائے کی بڑی اہمیت تھی۔ اس لیے ہز ہائینس نے خوشنودی کا اظہار فرماتے ہوئے کہا "یہ نوجوان خودمختار ریاستوں میں ملازمت کرنے والی خاص صلاحیت و ذہنیت رکھتا ہے۔ مگر آپ ان پانچوں امیدواروں کو پہلے ہر ہائینس کی خدمت میں پیش کیجیے۔ پھر میں خود ان سے گفتگو کروں گا۔"

چنانچہ مکیش ہر ہائینس کے سامنے پیش ہوا۔ انھوں نے مکیش کو اس نظر سے دیکھا جس نظر سے مالنیں گلے کے ہار کے لیے چمن پر نظر ڈالتے ہی زینت گلو پھول چن لیتی ہیں۔ ان کے اشارے پر جب وہ تسلیمیں کر کے کرسی پر بیٹھ گیا تو انھوں نے اس سے بہت ہی دلچسپ سوالات کیے۔

انھوں نے نیچی نظریں کیے کیے پوچھا "آپ کی شادی ہو گئی ہے؟"

مکیش نے کہا "جی نہیں سرکار"۔ اس نے ہر ہائینس کے چہرے پر ایک چمک سی دیکھ کر شرارت سے مگر معصوم لب و لہجہ میں اتنا اور اضافہ کیا "میں ابھی اس قید سے آزاد ہوں۔"

انھوں نے مسکرا کر کہا "سیکرٹری کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ وہ سوائے عہدے کی پابندیوں کے ہر طرح کی پابندی سے آزاد ہو!" پھر انھوں نے رک کر پوچھا "مگر بیوی نہیں، تو کوئی محبوبہ ضرور ہوگی؟"

مکیش نے کہا "سرکار، میرا معیار حسن ذرا بلند ہے!"

انھوں نے ابروؤں کی کمان چڑھا کر کہا "کچھ یقین نہیں آتا کہ یورپ اور ایشیا کے ان تمام ممالک میں جن کی آپ نے سیر کی، آپ کو آپ کے معیار کی کوئی حسینہ نہیں دکھائی دی۔"

اس نے جواب دیا "جی سرکار نظر تو آئی، مگر اپنی دسترس سے باہر!"

انھوں نے متانت سے ارشاد فرمایا "آپ ہمیں بتائیں ہم کوشش کریں گے کہ آپ کی خواہش پوری ہو جائے۔"

مکیش نے گردن جھکا کر عرض کی "سرکار، یہ وہ مقام بالا ہے جہاں نام لیتے ہی زبان جلتی ہے۔ اس ذات کے سلسلے میں 'خواہش' کے لفظ کا خیال ہی معصیت ہے۔ یہاں تو صرف پرستش ہی کی گنجائش ہے۔"

وہ مسکرا کر بولیں "تو وہ انسان کی جگہ کوئی دیوی ہوگی!"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "جی ہاں سرکار، کچھ ایسا ہی ہے۔"

ہر ہائنس نے ترچھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "اچھا یہ بتائیے کہ اگر آپ کو یہ اسامی دے دی جائے تو آپ کی پرستش میں کوئی رکاوٹ تو نہ پیدا ہو جائے گی؟"

وہ ڈھیٹ بن کر بولا "سرکار، اس دیوی کی پرستش کا موقع تو اس ملازمت کے بعد ہی مل سکتا ہے!"

ہر ہائنس نے اپنے پتلے پتلے عنابی ہونٹوں پر زبان اس طرح پھیری جیسے وہ کسی شیریں چیز کا ذائقہ محسوس کر رہی ہیں۔ پھر انھوں نے نظریں نیچی کر کے پوچھا "یہ بتائیے اگر ہز ہائنس کسی بڑے ہوٹل میں مقیم ہوں اور میں بھی ساتھ ہوں تو آپ ہمارے قیام کے کمروں کا کیا انتظام کریں گے؟"

اس نے دست بستہ عرض کی "ہوٹل کا پورا ونگ کرایہ پر لیا جائے گا۔ ایک سرے پر ہز ہائنس کا کمرہ ہوگا۔ دوسرے سرے پر سرکار عالیہ کا۔ بیچ میں دونوں سرکاروں کے مخصوص خادم و خادمائیں اور یہ غلام خاص۔"

انھوں نے ترچھی نظروں سے دیکھ کر پوچھا "مگر اجنبی جگہوں میں مجھے نیند بھی کم آتی ہے اور پھر ..." وہ ہلکی سی ہنسی ہنسیں "مجھے تھوڑا سا ڈر بھی لگتا ہے۔ اس کا کیا انتظام ہوگا؟"

اس نے گردن جھکا کر کہا "میں تو رات بھر دیوی کے دھیان میں صرف کروں گا ہی، سرکار حکم دیں گی تو کبھی کبھی جھانک کر دیکھ بھی لیا کروں گا کہ دیوی کی پنکھڑی جیسی پلکوں پر نیند کی پری نے بسیرا لیا یا نہیں!"

انھوں نے اسے کنکھیوں سے دیکھا۔ آہستہ آہستہ "دیوی! دیوی!" کہا، پھر گلنار چہرے سے آخری سوال کیا۔

"مسٹر مکیش فرض کیجیے میں ایسا تخلیہ چاہتی ہوں کہ ہز ہائنس کا میرے کمرے میں اس وقت تشریف لانا کسی طرح مناسب نہ ہو اور وہ آنا چاہیں تو آپ اس کا فوری انتظام کیا کریں گے؟"

اس نے عرض کی "اگر مجھے بروقت اطلاع دے دی گئی تو میں ہز ہائنس کے لیے ایسی تفریحوں یا عادتوں کا بندوبست کر دوں گا کہ انھیں سرکار کے کمرے تک جانے کا خیال بھی نہ آئے!"

ہر ہائنس نے خوشی سے تالی بجا کر کہا "واہ، واہ مسٹر مکیش۔ آپ یقینی ہر طرح ہمارے ہز ہائنس کے سیکرٹری بننے کے لائق ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر آپ نے ہز ہائنس کے دل میں اپنے جوابات سے وہی جذبہ اعتماد پیدا کر دیا جو میرے دل میں آپ کی طرف سے موجزن ہے تو آپ یقینی اس عہدے پر مقرر کیے جائیں گے۔" پھر نظر سے نظر لڑا کر بولیں "میں اُن سے پُرزور سفارش کر دوں گی!"

مکیش ہز ہائنس کے سامنے پیش کیا گیا۔ انھوں نے سر سے پاؤں تک اس طرح نظروں میں تولا جس طرح چکلہ اکبر کو آنکھوں آنکھوں میں تولتا ہے۔ پھر دفعتہً پوچھا "پرائیویٹ سیکرٹری کی صحیح تعریف سے واقف ہو؟"

اس نے کہا "میں کیا اور میرا علم ہی کیا مگر جو کچھ میری موٹی عقل میں آتا ہے اس کے رُو سے پرائیویٹ سیکرٹری اپنے آقا کا غلام خاص ہے۔ وہ ہز ہائنس کو ہر طرح کی دردسری سے بچانے اور ہر قسم کی آسائش پہنچانے کا ذمہ دار ہے۔ اس کا کوئی حصہ جسم اس کا اپنا نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کسی عضو سے سرکار کے حکم کے بغیر اپنا نجی کام نہیں لے سکتا۔ نہ اپنی آنکھوں سے اپنے لیے دیکھ سکتا ہے، نہ اپنے کانوں سے اپنے لیے سن سکتا ہے نہ اپنی زبان سے اپنے لیے بول سکتا ہے اور نہ

اس کے لب آقا کی مدح سرائی کے علاوہ خدا کی حمد تک میں کھل سکتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

وہ دم لینے کے لیے رکا تو ہز ہائنس نے پوچھا "اور اس کا دماغ؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر جھٹ سے بولا "اس کی کنجی تو بالکل مالک کے اختیار میں ہوگی۔ جب ہز ہائنس چاہیں گے وہ اسے کوک دیں گے اور وہ مشین کی طرح چلنے لگے گا، جب سرکار نہ چاہیں گے وہ بند پڈیو کی طرح خاموش پڑا رہے گا!"

ہز ہائنس مسکرائے "یقینی تم نے صحیح تعلیم پائی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا، یہ تو بتاؤ کہ تمھارے نزدیک حسین کون ہے؟"

اس نے بے تامل کہا "جو سرکار کو بھائے!"

ہز ہائنس نے بڑے سرپرستانہ انداز سے اس کی پیٹھ تھپک کر فرمایا "تم یقینی میرے سیکرٹری بننے کے مستحق ہو۔ بس ایک بات اور۔ تم جانتے ہی ہو کہ میرا دل ذرا کمزور ہے۔ تم تو خود ہی اپنے جوابات میں اس کا ذکر کر چکے ہو۔ تو یہ بتاؤ کہ مجھ تک کون سی باتیں پہنچائی جائیں کون سی نہیں!"

مکیش نے کہا "عالی جاہ کو ان تمام خبروں سے محفوظ رکھنا چاہئے، جو غصے سے، نفرت سے، آویزش سے، جنگ و جدل سے، سیاست و مذہب سے تعلق رکھتی ہوں۔ سرکار کے کانوں تک تو نغمہ و سرود کی جھنکاریں پہنچنا چاہئیں یا سیمیں بدنوں کے قلقل مینا جیسے قہقہے۔"

ہز ہائنس نے بڑے سرپرستانہ انداز سے اسے دیکھ کر کہا "تمھیں اپنے خیالات کے اظہار کا سلیقہ ہے۔ اچھا، تم آج سے سیکرٹری مقرر کئے گئے، لیکن ذرا انگریزی ایجنٹ بہادر سے بھی مل آؤ۔" ان کے چہرے پر خجالت کی لہر دوڑ گئی "تم ہم لوگوں کی دشواریوں کو تو سمجھتے ہی ہو!"

گورنر جنرل بہادر کے ایجنٹ کی خدمت میں پیشی ہوئی۔ گرگ باراں دیدہ تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ اس نے پوچھا "صرف ہز ہائنس نے آپ کا تقرر منظور کیا یا ہر ہائنس نے بھی اس بات کو پسند فرمایا؟"

اس نے سر جھکا کر کہا "جی، خیال تو یہی ہے کہ دونوں نے"

اس نے مکیش کو غور سے دیکھا۔ اسی طرح جس طرح بنیا مرچیں تولتے وقت بھی ڈنڈی کو دیکھتا ہے۔ پھر سوال کیا، "آپ کے نزدیک سب سے زیادہ خیر خواہ ملازم کون ہے؟"

مکیش نے کہا "میری کیا بساط کہ میں ایسے اہم مسئلے پر کسی ذاتی خیال کا اظہار کر دوں، مگر حضور کا حکم ہے تو میری حقیر رائے میں ریاست کا سب سے زیادہ خیر خواہ وہی ہے۔ جو ریاست کے اہم معاملات کو ہز ہائنس تک نہ پہنچنے دے، بلکہ حضور کی طرف رجوع کر کے حضور کے دانشمندانہ فیصلے پر کاربند ہو!"

اس نے بھوئی تیوری چڑھا کر پوچھا "یہ کیوں؟"

مکیش نے کہا "اس لیے کہ حکومت کرنے کا دماغ حضور کو عطا ہوا ہے اور ہز ہائنس کو صرف عیش کرنے والا مزاج!"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور مکیش کو رخصت کرتے ہوئے بولا "مسٹر مکیش! میں

آپ کو آپ کی تقرری پر مبارک باد دیتا ہوں۔ آکسفورڈ کی تعلیم آپ کے بارے میں ذرہ بھر بھی رائگاں نہیں گئی!"

جب مکیش تقرری کا حکم لے کر گھر پہنچا تو بلونت موجود تھا۔ اس نے ہنس کر پوچھا:

"کہو یار، بازی جیت آئے؟"

مکیش نے خاموشی سے اس کی طرف کاغذ بڑھا دیا۔ پھر گھٹی ہوئی آواز میں وہ بولا:۔

"ہاں! اپنا جسم ہی نہیں، اپنا ضمیر بھی بیچ آیا"

——— اور اس کی آنکھوں سے دو گرم گرم بوندیں ٹپک پڑیں!

خاندانی تصویر

حجاب امتیاز علی

ان دنوں زندگی ایک پکا راگ بن کر رہ گئی ہے۔ ثقیل قسم کی مصروفیات، ثقیل قسم کے فرائض نے جکڑ رکھا ہے۔ ہلکی پھلکی موسیقی کی قسم کے مشغلے زندگی سے تقریباً نکل گئے ہیں۔

لیکن گذشتہ اتوار مدت کے بعد ایک پرانی الماری کھولنے کا اتفاق ہوا تو اس میں سے ایک بہت پرانی خاندانی تصویر نکل آئی۔ آپ کے ہاں بھی گھر کے اندرونی کمروں میں کہیں نہ کہیں لگی ہوگی ——— ؟ آپ کے خاندان کے بزرگوں اور پیاروں کی تصویر ——— جس میں آپ بھی سر جھکائے منہ لٹکائے کسی مجرم کی طرح ایک کونے میں کھڑے ہوں گے؛ لیکن جس خاندانی تصویر کا میں ذکر کر رہی ہوں وہ اس سے بہت مختلف ہے۔

ہاں تو میں کہہ رہی تھی۔ الماری میں سے ایک پرانی خاندانی تصویر نکل آئی۔ اسے دیکھ کر گذرا زمانہ آنکھوں تلے پھر گیا۔ بچپن کی یاد۔ اور بیتے دنوں کا خیال بے چین کرنے لگا۔ آنکھوں میں بے اختیار آنسو۔ اور ہونٹوں پہ بے ساختہ مسکراہٹ کی دھوپ چھاؤں نے مجھ پر مالیخولیا کی سی کیفیت طاری کر دی۔ اس تصویر میں ہم لڑکے لڑکیوں کے علاوہ خاندان کے چند بزرگ بھی موجود تھے واضح رہے۔ بزرگ میرے خاندان کے ——— ! جو سب کے سب خاص قسم کی شخصیتوں کے مالک تھے۔ کوئی خود سر۔ کوئی کنجوس۔ کوئی چڑچڑا کوئی سنسور۔ بڑے غور سے اس عجیب و غریب تصویر کو دیکھا تو ہنستے ہنستے مرے تو پیٹ میں بل پڑ پڑ گئے۔ ہائے اللہ ——— کیونکہ اس میں جو کچھ تھا وہ زلزلے سے تباہ شدہ شہر سے مشابہ تھا۔ یہ تصویر تو آپ کو دکھا نہیں سکتی۔ لیکن لفظوں میں تصویر کی تصویر کھینچنے کی کوشش کرتی ہوں۔

ہائے ——— یہ بالکل کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آج اسے گذرے ایک مدت ہونے آئی ہے۔ کہ اسکول سے شب برات کی دو دن کی چھٹی ملی تو اسی کو غنیمت جان کر میں پٹاخے چھوڑنے اور آتش بازی کا تماشہ دیکھنے گھر چلی آئی۔ ادھر سے بھیا ریحانی اپنی یونیورسٹی سے اور صوفی اپنے آرٹ کالج سے پہلے ہی آئی ہوئی تھی۔

گھر پہنچ کر جب میں اپنے باغ کے صدر دروازے میں داخل ہوئی تو سب سے پہلے بھیا ریحانی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ مجھے دیکھتے ہی بولے "مارے روتی۔ آن پہنچیں تم ! ———" یہ کہتے کہتے ایک قلابازی لگائی اور امرود توڑ کر کھانے لگے۔ میں بولی "سب کیسے ہیں ریحانی ؟"

ریحانی جلدی جلدی امرود کھاتے ہوئے بولے "کیا بتاؤں روحی۔ سارے بزرگوں کی طبعی خصوصیات اور موروثی امراض اپنے عروج پر پہنچے ہوئے ہیں۔ ناک میں دم ہے"

میں ہنس پڑی اور بولی "مثلاً؟"

ایک چھوٹا سا امرود منہ میں داخل کر کے کہا "یوں سمجھ لو۔ ہر چیز لب بام پہنچی ہوئی ہے۔ دادا جعفر کا چڑچڑا پن اور وجع مفاصل۔ پھوپی زیتون کی کنجوسی اور رنجش۔ دادی زبیدہ کی عیب جوئی اور خلل اعصاب۔ یونیورسٹی سے آیا اس نیت سے تھا کہ خوب سیر و تفریح کروں گا۔ ناچوں گا، کودوں گا۔ ہنسوں گا۔ بولوں گا۔ لیکن جب سے آیا ہوں ان بزرگوں نے زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ کیا مجال کہ ذرا بے فکری سے سیٹی بھی بجا سکوں۔ بس شکنجے میں جکڑ رکھا ہے۔ ادھر صوفی غریب کو خانہ داری سکھائی جا رہی ہے۔ ادھر مجھے اخلاق کے سبق پڑھائے جا رہے ہیں۔"

میں ہنس پڑی۔ بولی "مگر ریحانی۔ تمہیں اس کی ضرورت بھی تھی۔ اب دیکھو۔ امرود کس مزے سے کھا رہے ہو اور میں کھڑی سوکھ رہی ہوں۔ دن بدن اخلاق گرتا ہی جا رہا ہے تمہارا۔"

ریحانی نے دانتوں سے کتر کر ایک امرود کا ٹکڑا میری طرف پھینک دیا۔ بولے "دیکھ لینا۔ تمہاری کیا گت بنتی ہے صاحبزادی۔"

میں بولی "ارے نہیں۔ دو دن کے لیے تو آئی ہوں۔ دن بھر پٹاخے چلاؤں گی۔ رات کو آتش بازی کے تماشے دیکھوں گی۔"

ریحانی امرود پھینک کر منہ پونچھتے ہوئے بولے "خیر ناشتے کے کمرے میں چلو۔ سب وہیں ہیں۔ میں بھی ادھر سے آتا ہوں۔"

جب میں ناشتے کے کمرے میں داخل ہوئی تو خاندان کے سب رکن میز کے گرد بیٹھے ناشتے کے شغل میں منہمک تھے۔

دادا جعفر ساری دنیا سے ناخوش پیلے ریشم کا ڈریسنگ گون اور کالی مخمل کی تنگ سی ٹوپی پہنے میز کے سرے والی کرسی پر بیٹھے بآواز بلند زور زور سے چائے کے گھونٹ کھینچ رہے تھے اور ان کے اس عمل سے کمرے کی خاموش فضا میں رہ رہ کر ایک گونج سی پیدا ہو رہی تھی۔

دادی زبیدہ میز کے دوسرے سرے والی کرسی پر دیوان حافظ ہاتھ میں لیے متمکن تھیں اور رہ رہ کر لخلخہ سونگھ رہی اور اعصاب کے تہ و بالا ہونے کی شکایت کر رہی تھیں۔

پھوپی زیتون ناشتہ کرنے والوں کی پلیٹوں سے مٹھائی بڑی احتیاط سے ایک دوسری بڑی پلیٹ میں اکٹھی کر رہی تھیں کہیں ایسا نہ ہو کہ مٹھائی کا کوئی بچا کھچا ریزہ نوکروں کو نصیب ہو جائے۔ اس طرح نوکروں کی عادات بگڑنے کا اندیشہ اور فضول خرچی کا ڈر تھا۔

بھیا ریحانی ایک پھولدار اونچی سی بش شرٹ پہن کر واپس آ پہنچے تھے اور باغ کی فرانسیسی کھڑکی میں بے فکری سے بیٹھے کیلے پر کیلا چھیل چھیل کر کھا رہے اور مسکرا مسکرا کر کن انکھیوں سے صوفی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

اور صوفی ایک ادا کے ساتھ دادا جعفر کے لیے انڈا پھینٹ رہی اور کن انکھیوں سے ریحانی کی طرف دیکھ کر مسکرائے جا رہی تھی۔

ڈرتے ڈرتے میں نے ایوانِ طعام میں قدم رکھا۔ پھر گلا صاف کرکے سب کو مخاطب کرکے بولی "تسلیمات"۔

اس کے جواب میں دادا جعفر نے مجھ پر ایک تنقیدی نظر ڈالی اور چڑچڑے لہجے میں فرمایا "تسلیمات۔ مگر آپ نے اپنی آمد کا تار کیوں نہ دیا؟"

پھوپی زیتون بولیں "اچھا کیا۔ خواہ مخواہ کے خرچ۔ اتنے سے سفر میں تار کی کیا ضرورت ہے"

"مجھے تار دینے کا کچھ خیال نہ رہا دادا ابا" میں نے معذرت کے لہجے میں کہا۔

دادی زبیدہ کھلنے کی شیشی بند کرکے میری طرف متوجہ ہو گئیں۔ "لو اور سنو۔ روحی کی باتیں — ہوں۔ خیال نہ رہا۔ خیال تو اپنے قابو میں رکھنا چاہیئے"

میں ان سب کی اس قسم کی باتوں کی عادی تھی اس لیے متانت سے بولی "بہت اچھا دادی جان پیاری۔ آئندہ تو یونہی کروں گی اپنے خیال کو۔ یہ بتائیے آپ سب کیسے ہیں؟"

دادا ابا پیار کا ایک پُرشور گھونٹ لے کر حقارت سے بولے "کیسے ہوتے۔ وہی جانیں ہیں۔ وہی زبیدہ کے اعصاب۔ وہی زیتون کی ہچکیاں۔ اور وہی سراد جمع مفاصل۔ ہوں ہوں"

بھیا ریحانی تیسرا کیلا چھیل کر کھانے کھاتے بولے "یوں کہئے نا دادا جان

ع وہی سوزِ دل کی ہیں گرمیاں وہی دردِ دل کی ہیں شدتیں"

یہ سن کر مری ہنسی نکل گئی۔ دادا جعفر پلٹ کر مجھے دیکھنے لگے۔

صوفی ضبط کرکے دبی زبان میں بولی "تو بہ ریحانی۔ حد کر دی تم نے۔ ایسے موقع پر ایسا مصرع!"

ریحانی جلدی سے کیلا نگل کر بولے "میں نے اپنی طرف سے برجستہ مصرع پڑھا ہے"

دادا جعفر ایک آہ بھر کر بولے "تمہیں شاعری سوجھ رہی ہے۔ ادھر ہمارا یہ حال ہے کہ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں"

"مایوسی و دلخراش باتیں نہ کیجئے دادا ابا پیارے" میں نے کہا۔

صوفی انڈا چھیلتے چھیلتے بولی "خدا آپ لوگوں کو ہمارے سروں پر کم از کم دو ہزار سال زندہ رکھے"

اس پر ریحانی پانچواں کیلا اٹھاتے اٹھاتے بولے "آمین۔ آمین — لیکن مجھے خیال آ رہا ہے۔ واقعی۔ آج کل کسی کی زندگی کا بھی کیا اعتبار۔ اس لیے کیوں نہ ایک خاندانی تصویر کھنچوائی جائے؟ اتفاق سے اس شب برات پر ہم سب اکٹھے ہیں یادگار رہے گی"

"تم ٹھیک کہتے ہو ریحانی بیٹے" دادا جعفر متاثر سے نظر آنے لگے۔

دادی زبیدہ دیوان حافظ پڑھتے پڑھتے نظر اٹھا کر بولیں "لیکن ایک شرط پر ——— ورنہ میں نہ کھنچواؤں گی اپنی تصویر"

"وہ کونسی شرط دادی جان؟"

دادی زبیدہ بولیں "ایک تو یہ کہ میں گلے میں سراندیپ کے موتیوں کی مالا پہنوں گی۔ دوسرے دیوان حافظ ہاتھ میں ہوگا۔ تیسرے کمبخت فوٹوگرافر مجھے کوئی ہدایات نہ دے کہ سر ترچھا رکھو۔ ہاتھ سیدھے رکھو۔ مجھ سے آنکھیں ملاؤ ——— اس قسم کی پابندیوں سے مرے اعصاب ۔۔۔۔۔۔!"

اس پر پھوپی زیتون تچمچے سے شہد چھڑاتے ہوئے بولیں " اسے بس رہنے بھی دو اپنی شرطیں۔ خواہ مخواہ کے خرچ۔ فوٹوگرافر مٹھی بھر روپے لے گا اور تصویر ایسی کھینچے گا ——"

"جیسی ہماری شکلیں ہوں گی" ریحانی نے کیلا نگل کر چٹخارہ بھرتے ہوئے کہا۔

"یوں چٹخارہ نہ بھرا کرو ریحانی" دادی زبیدہ ڈانٹ کر بولیں "یہ حرکت آداب طعام کے خلاف ہونے کے علاوہ دیوان حافظ کے پڑھنے میں خلل انداز ہوتی ہے"

"جی میں معافی چاہتا ہوں دادی جان پیاری" ریحانی نے ہاتھ بڑھا کر پھلدان میں سے چھوٹا کیلا لیتے ہوئے کہا، پھر بولے "ہاں وہ تصویر کی بات تو رہ گئی"

زیتون پھوپی مربّے کی بوتل کا ڈھکن زور زور سے بند کرتے ہوئے بولیں "اسے کہہ تو دیا کہ خواہ مخواہ کے خرچ ہیں۔ مٹھی بھر روپے رستے پڑ جائیں گے فوٹوگرافر کمبخت کو"

اُس صبح دادا جعفر بے حد خوش ہو رہے تھے بولے "مٹھی بھر روپے دینے پڑیں یا پھٹکی بھر۔ تصویر ضرور کھنچوانی چاہئے۔ ریحانی کا خیال درست ہے۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں۔ خاندانی تصویر ضرور اترنی چاہئے"

"خاندانی تصویر کے شوق میں لٹادو اپنی خاندانی دولت" پھوپی زیتون کانی کے ڈبے پر زور سے مٹھی مارتے ہوئے بولیں تاکہ ڈبا مضبوطی سے بند ہو جائے اور نوکروں کی زد سے بچا رہے۔

دادا جعفر ازل کے ضدی تھے کسی بات سے منع کیجئے تو وہی کریں گے۔ اب اپنی بات پر اڑ گئے بولے "خواہ مجھے اپنی پوری جائداد رہن رکھ دینی پڑے مگر میں لے کر رہوں گا تصویر"

"شوق سے لٹاؤ شوق سے لٹاؤ اپنی جاگیر ——" پھوپی زیتون طیش میں آکر کہنے لگیں "مگر یوں خاندانی دولت لٹاتے کسی کو نہیں دیکھا"

دادی زبیدہ دیوان حافظ بند کرکے غصہ سے بولیں "توبہ۔ اس ماحول میں کوئی دیوان حافظ پڑھ سکتا ہے؟ تم لوگ اتنی اونچی آواز میں بحث کرتے ہو کہ مرے اعصاب —!" اتنا کہہ کر لخلخہ سونگھنے لگیں۔

آخر فوٹوگرافر بلوایا گیا۔ آتے ہی اسے ذہن نشین کرایا گیا کہ تم کسی بات میں دخل نہ دو۔ منہ میں گھونگنیاں بھر کر چپ سادھے رہو۔ تصویر خواہ ہم بیٹھ کر کھنچوائیں یا لیٹ کر"

اب ایک کھلبلی سی مچ گئی۔ دیر تک یہی طے نہیں پا سکا کہ تصویر اندر کمرے میں لی جائے یا باہر پائیں باغ میں۔

دادا جعفر کہنے لگے "کمروں میں اندھیرا ہے۔ کچھ نظر نہ آئے گا"

اس پر دادی زبیدہ بولیں "باغ میں تیز روشنی ہے۔ میری آنکھیں چندھیا جائیں گی"

پھوپی زیتون نے فرمایا "تصویر اندر لی جائے یا باہر۔ روپے تو اُتنے ہی لگیں گے"

ہمت کر کے بدنصیب فوٹوگرافر نے تھرتھراتی آواز سے اتنا کہا "از راہ نوازش باغ میں تشریف لے آیئے آپ صاحبان"

اس پر دادی زبیدہ بے حد برا مان گئیں "لو شروع ہو گئیں ناخلل اندازیاں! نہ بابا۔ میں نہیں کھنچواتی اپنی تصویر تھوڑی

دیر میں کے گا۔ سر نیچا رکھو۔ آنکھیں مجھ سے ملاؤ۔"

"نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں بیگم صاحبہ۔ بخدا نہیں۔ یہ ہرگز نہیں کہوں گا آنکھیں مجھ سے ملاؤ۔" فوٹوگرافر معذرت کرنے لگا۔

"ارے میں خوب جانتی ہوں ان لوگوں کو۔۔۔"

بحث کرتے کرتے سب کے سب باہر باغ میں نکل آئے۔ اب یہ طے نہیں پا سکا کہ تصویر بیٹھ کر لی جائے یا کھڑے ہو کر یا کچھ لوگ بیٹھے ہوئے ہوں کچھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھے اور کھڑے ہونے میں فرق ہی کیا ہے۔ پیسے تو اتنے ہی لگیں گے۔ ہاں تصویر بچھ ٹی اترو، تو کچھ فائدہ بھی ہے۔" زیتون پھوپی نے کہا۔

دادا جعفر بولے۔ "خاندانی تصویر بہت بڑے سائز کی ہونی چاہیئے۔"

دادی زبیدہ بولیں "لیکن بڑے سائز کی تصویر میں شکلیں بری آتی ہیں۔"

"اور چھوٹے سائز کی تصویر میں خوبی یہ ہوتی ہے کہ حرج کم شکل اچھی" زیتون پھوپی بولیں۔

ریحان اکتا کر بولے "مگر بحث تو اس پہ ہو رہی تھی کہ تصویر بیٹھ کر لی جائے یا کھڑے ہو کر؟ آپ لوگ تصویر کے سائز پر بحث کر کے وقت ضائع کر رہے ہیں"

میں بولی "یوں کریں خواتین بیٹھ جائیں۔ آپ لوگ کھڑے ہیں"

صوفی بولی "یا بزرگ سارے بیٹھ جائیں۔ ہم تینوں کھڑے ہو جائیں"

پھوپی زیتون دبی زبان سے بولیں "ان سارے جھگڑوں سے بہتر یہی ہوتا کہ سرے سے تصویر ہی نہ کھنچوائی جاتی۔"

دادی زبیدہ کو بے حد ناگوار گذرا بولیں "تم چپ رہو زیتون۔۔۔۔ مزید براں ایک بیٹھا رہے دوسرا کھڑا ہو تو میرے اعصاب تہ و بالا ہو جاتے ہیں۔ دم گھٹ جاتا ہے۔ اس لیے سب کھڑے ہوں"

"کیسی باتیں کرتی ہو زبیدہ" دادا جعفر چڑچڑاتے لہجے میں بولے "ایک قطار میں سب کھڑے ہوں تو سب بونے معلوم ہوں گے کسی کی ٹانگ کٹ جائے گی یا کسی کا سر۔۔۔"

"اور پیسے ضائع جائیں گے۔" پھوپی زیتون بڑبڑائیں۔

"میں بتاؤں۔۔۔؟" ریحان نے عین وقت پہ بے حد عقلمندی سے کام لیا کہنے لگے "پیچھے کے برآمدے میں ایک گول میز پڑی ہے۔ سب اس پر بیٹھ جائیں۔"

"اور ہماری ٹانگیں؟" دادا جعفر نے فکرمندی سے کہا۔

"ظاہر ہے وہ لٹکتی رہیں گی" ریحان نے کہا۔

سب کو یہ رائے پسند آئی۔ گول میز پیچھے کے برآمدے سے بڑی مشکل سے زینے طے کر کے باہر باغ میں نکالی جا سکی۔ سارے نوکر چیونٹیوں کی طرح اس پہ پل پڑے۔ ریحان راستہ بتاتے جاتے تھے۔ دادا جعفر ہر قدم پر ٹوکتے جاتے تھے۔

"میز کا پایا یا دایا نکل آیا تو نقصان علیحدہ" پھوپی زیتون چیخ پڑیں۔

نوکر میز کو زینے پر سے نیچے لاتے ہوئے شدتِ محنت کی وجہ سے ایک خاص قسم کا راگ گانے لگے تھے۔
فوٹوگرافر بیچارہ سہا ہوا ایک کونے میں کھڑا ساری کارروائی دیکھتا رہا۔ لیکن اُسے اُف کرنے کی اجازت نہ تھی۔
میز لاکر باہر باغ میں ڈال دی گئی۔ اب ایک اور مسئلہ حل طلب تھا جو مرے خیال میں سارے مسائل سے زیادہ مشکل تھا
میز بے حد اونچی تھی۔

"یہاں تو ایک سیڑھی کی ضرورت ہوگی" دادی زبیدہ بولیں۔

"ہاں جیسے ہوائی جہاز کو لگائی جاتی ہے" میں نے کہا۔

"میں تو یونہی چھلانگ لگا دوں گی" صوفی بے حد سمارٹ ہوکر بولی۔

"نیچے اینٹیں رکھوا دیں" پھوپی نے کہا۔

"نہیں نہیں مالی کی سیڑھی منگواؤ" دادا نے رائے دی۔

"جانے کہاں رکھ گیا سیڑھی۔ کل سے چھٹی پر گیا ہوا ہے" ریحانی بولے۔

غرض جتنے منہ اتنی باتیں ——— شاید ماؤنٹ ایورسٹ کی چڑھائی میں بھی ہلیری کو وہ مشکلیں پیش نہ آئی ہوں گی جتنی ہم سب کو اس میز کے اوپر پہنچنے میں آئیں۔ اب چڑھائی کی کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ چڑھتے ہوئے کوئی خدا کی مدد مانگ رہا تھا کوئی بزرگان دین کی۔

اب فوٹوگرافر سے آخر نہ رہا گیا۔ دو قدم پیچھے ہٹ کر باریک آواز میں بولا "آپ لوگ اس پر چڑھ تو رہے ہیں مگر میز ہل رہی ہے"

دادی زبیدہ کے ہوش اڑ گئے "دیکھی اس کی شرارت! اب کہہ رہا ہے میز ہل رہی ہے جبکہ میں دیوان حافظ لے کر اوپر چڑھ چکی ہوں۔ پہلے کیوں نہ کہا؟"

فوٹوگرافر ڈر گیا۔ ہکلاتا ہوا بولا "آ آ آ ——— پ بیٹھی بیٹھی رہیے ——— ہل ——— ہلیے نہ"

"لو اور سنو" دادی زبیدہ غصے سے بولیں "یعنی ہلنے کی بھی اجازت نہیں ——"

ریحانی ہنس پڑے "ایک شعر عرض کرتا ہوں ؎

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے"

"تم چپ رہو ریحانی" دادی جان نے ڈانٹا۔

"جی بہت اچھا دادی جان" ریحانی نے کہا۔

"ارے تم لوگوں کی بحث میں میز ڈانواڈول ہو رہی ہے۔ میں کیسے چڑھوں؟" ہانپتے ہوئے پھوپی زیتون اوپر پہنچ کر بولیں۔
صوفی کھلکھلا کر ہنس پڑی بولی "ہائے ہائے ——— آپ چڑھ تو گئیں اوپر زیتون پھوپی۔ مگر اپنے دانت لگانے تو بھول ہی گئیں"
دادی زبیدہ چراغ پا ہو گئیں "تم بھی کیا تماشہ کرتی ہو زیتون۔ پوپلے منہ سے تصویر اتراؤ گی۔ وہ بھی خاندانی تصویر؟"

پھوپی زیتون کو بھی تاؤ آ گیا، بولیں "ہاں ہاں نہیں لگاتی دانت میری مرضی ——— وقت بے وقت استعمال کرنے لگ جاؤں تو دانت ہفتہ بھر میں ٹوٹ جائیں اور دندان ساز کو مفت میں روپے دینے پڑ جائیں۔ خواہ مخواہ کے خرچ"

فوٹوگرافر بے اختیار بیچ میں بول پڑا "بیگم صاحبہ۔ بیگم صاحبہ۔ اتنا ہاتھ ہلا ہلا کر بات نہ کیجیے نیز نہایت مخدوش حالت میں ہے"

"پھر نہیں کیا؟" دادی جان نے کہا۔

"تم سب لڑتی رہو آپس میں۔ میں کھنچواتا ہوں اپنی تصویر" دادا جعفر غصے سے بولے "اتارو فوٹوگرافر تصویر۔ ؟"

فوٹوگرافر آگے کو بڑھا "جی بہت اچھا ——— ایک۔ دو ——— تین"

دادی زبیدہ چیخیں "ٹھہرنا ٹھہرنا۔ ابھی نہیں ———"

یکایک ریحانی قہقہہ لگا کر بولے "ارے دادا جعفر آپ نے جلدی میں کپڑے ہی نہ بدلے! اور اوپر چڑھ گئے! ہاہاہا ———"

دادا جعفر تصویر کے لیے بن کر بیٹھتے ہوئے بولے "اس قسم کے موقعوں پر میں لباس بدلنے کا قائل نہیں۔ اس سے ایک تکلف پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسرے نیز ... ہی ہے۔ اترنا چڑھنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اتارو فوٹوگرافر تصویر ———"

"جی بہت اچھا۔ ایک۔ دو۔ تین ......"

"ٹھہرنا ٹھہرنا ——— ایک منٹ ———" دادی زبیدہ بولیں پھر دادا جعفر کو دیکھ کر بولیں "غضب غضب! ڈریسنگ گاؤن۔ اور سر پہ کالی مخمل کی ٹوپی۔ اس میں کھنچوائی جائے گی خاندانی تصویر؟"

"تو تم چاہتی تھیں میں سر پر سہرا باندھ کر تصویر کھنچواتا؟" دادا جعفر بگڑ کر بولے۔

دادی زبیدہ متفکر ہو کر بولیں "خیر مری بلا سے۔ لیکن از راہ کرم مجھ سے پرے ہٹ کر بیٹھنا۔ شرم آتی ہے مجھے تمہارے ایسے لباس میں۔" صوفی جھک کر مجھے دیکھنے لگی پھر بولی "ہے ہے روحی تم نے چہرے پر اتنا پوڈر تھوپ رکھا ہے کہ سرکس کا مسخرہ معلوم ہوتی ہو" میں جل گئی بولی "اور تم نے جو اتنے گہرے رنگ کا لپ اسٹک لگا رکھا ہے؟ تصویر میں یوں معلوم ہو گا جیسے منہ میں کوئی کالا چوہا پکڑ رکھا ہو"

ریحانی چلائے "یا یا اب بند بھی ہوں گی یہ بحثیں کبھی؟ ——— تم اتارو فوٹوگرافر تصویر ———"

فوٹوگرافر گلا صاف کر کے دو قدم آگے کو بڑھ کر بولا "جی بہت اچھا۔ ایک۔ دو۔ تین ——— شکریہ شکریہ"

دادی زبیدہ چلائیں "ٹھیرنا ٹھیرنا ایک منٹ۔ زیتون تم پرے ہٹ کر بیٹھو۔ اور جعفر تم بھی۔ تم لوگوں کی ہیئت دیکھ کر میں زمین میں گڑی جا رہی ہوں۔ یہ پلپلا منہ اور مخمل کی ٹوپی"

دادا کو تاؤ آ گیا۔ میز پر کھڑے ہوتے ہوئے بولے "اچھا بابا اچھا۔ لو دور ہٹ کر بیٹھتا ہوں ——— "یہ کہتے ہی پرے ہٹ کر دھم سے میز پر بیٹھ گئے۔ ادھر میز چوں چوں چوں کرتی جانے کیا ہو گئی۔

تیسرے دن تصویر دھل کر آئی تو کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ تصویر کس چیز کی ہے اور اس میں کیا ہو رہا ہے۔ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی شہر پر بم گرا ہو اور لوگ قلابازیاں کھا رہے ہوں ———

دادا جعفر کی مخملی ٹوپی زمین کی طرف آ رہی تھی اور وہ خود سر بسجود سے معلوم ہو رہے تھے۔

پھوپی زیتون مٹھی میں کوئی چیز مضبوطی سے پکڑے جیسے رکوع میں جھکی کھڑی تھیں۔
دادی زبیدہ موتیوں کی مالا سمیت زمین پہ بیٹھی گویا سلام پھیر رہی تھیں۔
میں میز کے پائے سے چمٹی ہوئی تھی۔
صوفی کہنی کے بل ایک طرف پڑی تھی۔
اور ریحانی ہوا میں معلق تھے!!
میز کے مختلف ٹکڑے ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے!
یہ تھی ہماری خاندانی تصویر!!

آخری آدمی

انتظار حسین

الیاسف اس قریے میں آخری آدمی تھا۔ اس نے عہد کیا تھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور میں آدمی ہی کی جون میں مروں گا۔ اور اس نے آدمی کی جون میں رہنے کی آخر دم تک کوشش کی۔

اور اس قریے سے تین دن پہلے بندر غائب ہو گئے تھے۔ لوگ پہلے حیران ہوئے اور پھر خوشی منائی کہ بندر جو فصلیں برباد اور باغ خراب کرتے تھے نابود ہو گئے۔ پر اس شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا کرتا تھا یہ کہا کہ بندر تو تمہارے درمیان موجود ہیں مگر یہ کہ تم دیکھتے نہیں۔ لوگوں نے اس کا برا مانا اور کہا کہ کیا تو ہم سے ٹھٹھا کرتا ہے۔ اور اس نے کہا کہ بے شک ٹھٹھا تم نے خدا سے کیا کہ اس نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کیا اور تم نے سبت کے دن مچھلیوں کا شکار کیا۔ اور جان لو کہ وہ تم سے بڑا ٹھٹھا کرنے والا ہے۔

اس کے تیسرے دن یوں ہوا کہ الیعذر کی لونڈی گجردم الیعذر کی خوابگاہ میں داخل ہوئی اور سہمی ہوئی الیعذر کی جورو کے پاس الٹے پاؤں آئی۔ پھر الیعذر کی جورو خوابگاہ تک گئی اور حیران و ہراساں واپس آئی۔ پھر یہ خبر دور دور تک پھیل گئی اور دور دور سے لوگ الیعذر کے گھر آئے اور اس کی خوابگاہ تک جا کر ٹھٹھک ٹھٹھک گئے کہ الیعذر کی خوابگاہ میں الیعذر کی بجائے ایک بڑا بندر آرام کرتا تھا۔ اور الیعذر نے پچھلے سبت کے دن سب سے زیادہ مچھلیاں پکڑی تھیں۔

پھر یوں ہوا کہ ایک نے دوسرے کو خبر دی کہ اے عزیز الیعذر بندر بن گیا ہے۔ اس پہ دوسرا زور سے ہنسا "تو نے مجھ سے ٹھٹھا کیا" اور وہ ہنستا ہی چلا گیا حتیٰ کہ منہ اس کا سرخ پڑ گیا اور دانت نکل آئے اور چہرے کے خدوخال کھنچتے چلے گئے اور وہ بندر بن گیا۔ تب پہلا کمال حیران ہوا۔ منہ اس کا کھلا کا کھلا رہ گیا اور آنکھیں حیرت سے پھیلتی چلی گئیں اور پھر وہ بھی بندر بن گیا۔

اور الیاب ابن زبلون کو دیکھ کر ڈرا اور یوں بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تجھے کیا ہوا ہے کہ تیرا چہرہ بگڑ گیا۔ ابن زبلون نے اس بات کا برا مانا اور غصے سے دانت کچکچانے لگا۔ تب الیاب مزید ڈرا اور چلا کر بولا کہ اے زبلون کے بیٹے تیری ماں تیرے سوگ میں بیٹھے، ضرور تجھے کچھ ہو گیا ہے۔ اس پر ابن زبلون کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور دانت بھینچ کر الیاب پر جھپٹا۔ تب الیاب پر خوف سے لرزہ طاری ہوا۔ اور ابن زبلون کا چہرہ غصے سے اور الیاب کا چہرہ خوف سے بگڑتا چلا گیا۔ ابن زبلون غصے سے آپے سے باہر ہوا اور الیاب خوف سے اپنے آپ میں سکڑتا گیا۔ اور وہ دونوں کہ ایک مجسم غصہ اور ایک خوف کی پوٹ تھے آپس میں گتھ گئے۔ ان

کے چہرے بگڑتے چلے گئے۔ پھران کے اعضا بگڑے۔ پھران کی آوازیں بگڑیں کہ الفاظ آپس میں مدغم ہوتے چلے گئے اور غیر ملفوظ آوازیں بن گئے۔ پھر وہ غیر ملفوظ آوازیں دھندلا کر چیخیں بن گئیں۔ اور پھر وہ بندر بن گئے۔

الیاسف نے کہ ان سب میں عقلمند تھا اور سب سے آخر تک آدمی بنا رہا تشویش سے کہا کہ اے لوگو مقرر ہمیں کچھ ہو گیا ہے۔ آؤ ہم اس شخص سے رجوع کریں جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا ہے۔ پھر الیاسف لوگوں کو ہمراہ لے کر اس شخص کے گھر گیا اور حلقہ زن ہوکے دیر تک پکارا کیا۔ تب وہ وہاں سے مایوس پھرا اور بڑی آواز سے بولا کہ اے لوگو وہ شخص جو ہمیں سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کیا کرتا تھا آج ہمیں چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ اور اگر سوچو تو اس میں ہمارے لیے خرابی ہے۔ لوگوں نے یہ سنا اور دہل گئے۔ ایک بڑے خوف نے انھیں آلیا۔ وحشت سے صورتیں ان کی بھینچی ہونے لگیں اور خدوخال مسخ ہونے چلے گئے۔ اور الیاسف نے گھوم کر دیکھا اور سکتہ میں آگیا۔ اس کے پیچھے چلنے والے بندر بن گئے تھے۔ تب اس نے سامنے دیکھا اور بندروں کے سوا کسی کو نہ پایا۔ پھر اس نے دائیں بائیں نظر ڈالی اور ہر سمت بندر دیکھے۔ تب وہ ڈرا اور ان سے کترا کر چلا اور بستی کے اس کنارے سے اس کنارے تک گیا اور کسی کو آدمی نہ پایا۔ جاننا چاہیے کہ وہ بستی ایک بستی تھی سمندر کے کنارے اونچے برجوں اور بڑے دروازوں والی حویلیوں کی بستی۔ بازاروں میں کھوے سے کھوا چھلتا تھا کٹورا بجتا تھا۔ دم کے دم میں بازار ویران اور اونچی ڈیوڑھیاں سونی ہو گئیں اور اونچے برجوں میں اور عالیشان چھتوں پر بندر ہی بندر نظر آنے لگے۔ اور الیاسف نے ہراس سے چاروں سمت نظر دوڑائی اور سوچا کہ میں اکیلا آدمی ہوں۔ اور اس خیال سے وہ ایسا ڈرا کہ اس کا خون جمنے لگا۔ مگر اسے الیاب یاد آیا کہ خوف سے کس طرح اس کی صورت بگڑتی چلی گئی اور وہ بندر بن گیا۔ تب الیاسف نے اپنے خوف پر غلبہ پایا اور عزم باندھا کہ معبود کی سوگند میں آدمی کی جون میں پیدا ہوا ہوں اور آدمی ہی کی جون میں مروں گا۔ اور اس نے ایک احساس برتری کے ساتھ اپنے مسخ صورت ہم جنسوں کو دیکھا اور کہا تحقیق میں ان میں سے نہیں ہوں کہ وہ بندر ہیں اور میں آدمی کی جون میں ہوں۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں سے نفرت کی۔ اس نے ان کی لال بھبوکا صورتوں اور بالوں سے ڈھکے ہوئے جسموں کو دیکھا اور نفرت سے چہرہ اس کا بگڑنے لگا۔ مگر اسے اچانک زبون کا خیال آیا کہ نفرت کی شدت سے صورت اس کی مسخ ہو گئی تھی۔ اس نے کہا کہ اے الیاسف نفرت مت کر کہ نفرت سے آدمی کی کایا بدل جاتی ہے اور الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے نفرت سے کنارہ کیا اور کہا کہ بے شک میں انھیں میں سے تھا۔ اور اس نے وہ دن یاد کیے جب وہ ان میں سے تھا اور دل اس کا محبت کے جوش سے امنڈنے لگا۔ اور اسے بنت الاخضر کی یاد آئی کہ فرعون کے رتھ کی دودھیا گھوڑیوں میں سے ایک گھوڑی کی مانند تھی اور اس کے بڑے گھر کے در، سرو کے اور کڑیاں صنوبر کی تھیں۔ اس یاد کے ساتھ الیاسف کو بیتے دن یاد آئے کہ وہ سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے مکان میں عقب سے گیا تھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کے لیے اس کا جی چاہتا تھا۔ اور اس نے دیکھا کہ لمبے بال اس کے رات کی بوندوں سے بھیگے ہیں اور چھاتیاں ہرن کے بچوں کے مانند تڑپتی ہیں اور پیٹ اس کا گندم کی ڈھیری کی مانند ہے کہ پاس اس کے صندل کا گول پیالہ ہے۔ اور الیاسف نے بنت الاخضر کو یاد کیا اور ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کے تصور میں سرو کے دروں اور صنوبر کی کڑیوں والے گھر تک گیا۔ اس نے خالی مکان کو دیکھا اور چھپر کھٹ پر اسے ٹٹولا جس کیلئے اس کا جی چاہتا تھا اور پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے؟ اے وہ کہ جس کیلئے میرا جی چاہتا ہے۔ دیکھ موسم کا بھیا زد

کملا گیا اور پھولوں کی کیاریاں ہری بھری ہو گئیں اور قمریاں اونچی شاخوں پر پھڑپھڑاتی ہیں۔ تو کہاں ہے اے اخضر کی بیٹی۔ اے اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر آرام کرنے والی تجھے دشت میں دوڑتی ہوئی ہرنیوں اور چٹانوں کی دراڑوں میں چھپے ہوئے کبوتروں کی قسم تو نیچے اتر آ۔ اور مجھ سے آن مل کہ تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ الیاسف بار بار پکارتا تا آنکہ اس کا جی بھر آیا اور وہ بنت الاخضر کو یاد کر کے رو دیا۔

الیاسف بنت الاخضر کو یاد کر کے رویا۔ مگر اچانک اسے الیعذر کی جورو یاد آئی جو الیعذر کو بندر کی جون میں دیکھ کر روتی تھی حتیٰ کہ اس کی ہڑکی بندھ گئی اور بہتے آنسوؤں میں اس کے جمیل نقش بگڑتے چلے گئے اور ہڑکی کی آواز وحشی ہوتی چلی گئی — یہاں تک کہ اس کی جون بدل گئی۔ تب الیاسف نے خیال کیا بنت الاخضر جن میں سے تھی ان میں مل گئی۔ اور بے شک جو جن میں سے ہے وہ ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا کہ اے الیاسف ان سے محبت مت کر، مبادا تو ان میں سے ہو جائے۔ اور الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ اور الیاسف نے ہرن کے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کو فراموش کر دیا۔

الیاسف نے محبت سے کنارہ کیا اور اپنے ہم جنسوں کی لال بھبوکا صورتوں اور کھڑی دُموں کو دیکھ کر ہنسا۔ اور الیاسف کو الیعذر کی جورو یاد آئی کہ وہ اس قریے کی حسین عورتوں میں سے تھی۔ وہ تاڑ کے درخت کی مثال تھی اور چھاتیاں اس کی انگور کے خوشوں کی مانند تھیں۔ اور الیعذر نے اس سے کہا تھا کہ جان لے کہ میں انگور کے خوشے توڑوں گا۔ اور انگور کے خوشوں والی تڑپ کر ساحل کی طرف نکل گئی۔ الیعذر اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھل توڑا اور تاڑ کے درخت کو اپنے گھر لے آیا۔ اور اب وہ ایک اونچے کنگرے پر الیعذر کی جوئیں بین بین کر کھاتی تھی۔ الیعذر جھرجھری لے کر کھڑا ہو جاتا اور وہ دم کھڑی کر کے اپنے پیلے پیلے پنجوں پر اٹھ بیٹھی اور الیعذر کے اگلے پیر اس کے بدرنگ بالوں والی پشت پر ٹک جاتے۔ الیاسف یہ دیکھ کر ہنسا اور ہنستا ہی چلا گیا اور یاک کے ہنسنے کی آواز اتنی اونچی ہوتی کہ اسے ساری بستی گونجتی معلوم ہوئی۔ اور وہ اپنے اتنی زور سے ہنسنے پر حیران ہوا۔ مگر اچانک اسے اس شخص کا خیال آیا جو ہنستے ہنستے بندر بن گیا تھا۔ اور الیاسف نے اپنے تئیں کہا۔ اے الیاسف تو ان پر مت ہنس مبادا تو ہنسی کی جنس بن جائے۔ اور الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔

الیاسف نے ہنسی سے کنارہ کیا۔ الیاسف محبت اور نفرت سے، غصہ اور ہمدردی سے، رونے اور ہنسنے سے، ہر کیفیت سے گذر گیا اور ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے بے تعلق ہو گیا۔ ان کا درختوں پر اچکنا، دانت پیس پیس کر کلکاریاں کرنا، کچے پکے پھلوں پر لڑنا اور ایک دوسرے کو لہولہان کر دینا، یہ سب کچھ اسے آگے کبھی ہم جنسوں پر رلاتا تھا کبھی ہنساتا تھا، کبھی غصہ دلاتا کہ وہ ان پر دانت پیسنے لگتا اور انھیں حقارت سے دیکھتا۔ اور یوں ہوا کہ انھیں لڑتے دیکھ کر اس نے غصہ کیا اور بڑی آواز سے جھڑکا۔ پھر خود ہی اپنی آواز پر حیران ہوا۔ اور کسی کسی بندر نے اسے بے تعلقی سے دیکھا اور پھر لڑائی میں جٹ گیا۔ اور الیاسف نے تئیں لفظوں کی قدر جاتی رہی کہ اب وہ اس کے اور اس کے ہم جنسوں کے درمیان رشتہ نہیں رہے تھے۔ اور اس کا اس نے افسوس کیا۔ الیاسف نے افسوس کیا اپنے ہم جنسوں پر، اپنے آپ پر اور لفظ پر۔ افسوس ہے ان پر بوجہ اس کے کہ وہ لفظ سے محروم ہو گئے۔ افسوس ہے مجھ پر بوجہ اس کے کہ لفظ میرے ہاتھوں میں خالی برتن کی مثال رہ گیا۔ اور سوچو تو آج بڑے افسوس کا دن ہے

کہ آج لفظ مرگیا۔ اور الیاسف نے لفظ کی موت کا نوحہ کیا اور خاموش ہوگیا۔

الیاسف خاموش ہوگیا اور محبت اور نفرت سے، غصہ اور ہمدردی سے ہنسنے اور رونے سے درگذرا۔ اور الیاسف نے اپنے ہم جنسوں کو ناجنس جان کر ان سے کنارہ کر لیا اور اپنی ذات کے اندر پناہ لے لی۔ الیاسف اپنی ذات کے اندر پناہ گیر ہو کر جزیرے کی مانند بن گیا۔ سب سے بے تعلق، گہرے پانیوں کے درمیان خشکی کا ننھا سا نشان۔ اور جزیرے نے کہا کہ میں گہرے پانیوں کے درمیان زمین کا نشان بلند رکھوں گا۔

الیاسف کہ اپنے تئیں آدمیت کا جزیرہ جانتا تھا گہرے پانیوں کے خلاف مدافعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے گرد پشتہ بنا لیا کہ محبت اور نفرت، غصہ اور ہمدردی، غم اور خوشی اس پر یلغار نہ کریں، کہ جذبے کی کوئی رَو اسے بہا کر نہ لے جائے۔ اور الیاسف اپنے جذبات سے خوف کھانے لگا۔ پھر جب وہ پشتہ تیار کر چکا تو اسے یوں لگا کہ اس کے سینے کے اندر پتھری پڑگئی ہے۔ اس نے فکرمند ہو کر کہا کہ اے معبود کیا میں اندر سے بدل رہا ہوں۔ تب اس نے اپنے باہر پر نظر کی۔ اور اسے گمان ہونے لگا کہ وہ پتھری پھیل کر باہر آ رہی ہے، کہ اس کے اعضا خشک، اس کی جلد بدرنگ اور اس کا لہو بے رس ہوتا جا رہا ہے۔ پھر اس نے مزید اپنے آپ پر غور کیا اور اسے مزید وسوسوں نے گھیرا۔ اسے لگا کہ اس کا بدن بالوں سے ڈھکتا جا رہا ہے اور بال بدرنگ اور سخت ہوتے جا رہے ہیں۔ تب اسے اپنے بدن سے خوف آیا اور اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ خوف سے وہ اپنے اندر سمٹنے لگا۔ اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ٹانگیں اور بازو مختصر اور سر چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔ تب اسے مزید خوف ہوا اور اعضا اس کے خوف سے مزید سکڑنے لگے۔ اور اس نے سوچا کہ کیا میں بالکل معدوم ہو جاؤں گا۔

اور الیاسف نے الیاب کو یاد کیا کہ خوف سے اپنے اندر سمٹ کر وہ بندر بن گیا تھا۔ تب اس نے کہا کہ میں اندر کے خوف پر اسی طور غلبہ پاؤں گا جس طور میں نے باہر کے خوف پر غلبہ پایا تھا۔ اور الیاسف نے اندر کے خوف پر غلبہ پا لیا اور اس کے سمٹے ہوئے اعضا کھلنے اور پھیلنے لگے۔ اس کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے اور اس کی انگلیاں لمبی اور بال بڑے اور کھڑے ہونے لگے اور اس کی ہتھیلیاں اور تلوے چپٹے اور بھچے ہو گئے اور اس کے جوڑ کھلنے لگے۔ اور الیاسف کو گمان ہوا کہ اس کے سارے اعضا بکھر جائیں گے۔ تب اس نے عزم کر کے اپنے دانتوں کو بھینچا اور مٹھیاں کس کر باندھیں اور اپنے آپ کو اکٹھا کرنے لگا۔

الیاسف نے اپنے بدہیئت اعضا کی تاب نہ لا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اسے لگا کہ اس کے اعضا کی صورت بدلتی جا رہی ہے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنے آپ سے پوچھا، کیا میں میں نہیں رہا ہوں۔ اس خیال سے دل اس کا ڈوبنے لگا۔ اس نے بہت ڈرتے ڈرتے ایک آنکھ کھولی اور چپکے سے اپنے اعضا پر نظر کی۔ اسے ڈھارس ہوئی، اس کے اعضا تو جیسے تھے ویسے ہی ہیں۔ اس نے دلیری سے آنکھیں کھولیں اور اطمینان سے اپنے بدن کو دیکھا اور کہا کہ بےشک میں اپنی جون میں ہوں۔ مگر اس کے بعد آپ ہی آپ اسے پھر وسوسہ ہوا کہ جیسے اس کے اعضا بگڑتے اور بدلتے جا رہے ہیں اور اس نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔

الیاسف نے آنکھیں بند کر لیں۔ اور جب الیاسف نے آنکھیں بند کیں تو اس کا دھیان اندر کی طرف گیا اور اس نے جانا کہ وہ کسی اندھیرے کنوئیں میں دھنستا جا رہا ہے۔ اور الیاسف نے درد کے ساتھ کہا کہ اے مرے معبود میرے باہر بھی دوزخ

ہے میرے اندر بھی دوزخ ہے۔ اندھیرے کنوئیں میں دھنستے ہوئے ہم جنسوں کی پرانی صورتوں نے اس کا تعاقب کیا اور گذری یادیں محاصرہ کرنے لگیں۔ الیاسف کو سبت کے دن ہم جنسوں کا مچھلیوں کا شکار کرنا یاد آیا کہ ان کے ہاتھوں مچھلیوں سے بھرا سمندر مچھلیوں سے خالی ہونے لگا۔ اور ان کی ہوس بڑھتی گئی۔ اور انہوں نے سبت کے دن بھی مچھلیوں کا شکار شروع کر دیا۔ تب اس شخص نے جو انہیں سبت کے دن مچھلیوں کے شکار سے منع کرتا تھا کہا کہ رب کی سوگند جس نے سمندر کو گہرے پانیوں والا بنایا اور گہرے پانیوں کو مچھلیوں کا مامن ٹھہرایا سمندر تمہارے دست ہوس سے پناہ مانگتا ہے۔ اور سبت کے دن مچھلیوں پر ظلم کرنے سے باز رہو کہ مبادا تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے والے قرار پاؤ۔ اور الیاسف نے کہا کہ معبود کی سوگند میں سبت کے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کروں گا — اور الیاسف نے کہ عقل کا پتلا تھا سمندر سے فاصلہ پر ایک گڑھا کھودا اور نالی کھود کر اسے سمندر سے ملایا اور سبت کے دن مچھلیاں سطح آب پر آئیں تو تیرتی ہوئی نالی کی راہ گڑھے میں نکل گئیں۔ اور سبت کے دوسرے دن الیاسف نے اس گڑھے سے بہت سی مچھلیاں پکڑیں۔ وہ شخص جو سبت کے دن مچھلیاں پکڑنے سے منع کرتا تھا یہ دیکھ کر یوں بولا کہ تحقیق جس نے اللہ سے مکر کیا اللہ اس سے مکر کرے گا۔ اور بے شک اللہ زیادہ بڑا مکر کرنے والا ہے۔ اور الیاسف یہ یاد کر کے پچھتایا اور وسوسہ کیا کہ زیادہ مکر میں گھر گیا ہے۔ اس گھڑی اسے اپنی پوری ہستی ایک مکر نظر آئی۔ تب وہ اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑایا کہ پیدا کرنے والے تو نے مجھے ایسا پیدا کیا جیسا پیدا کرنے کا حق ہے۔ تو نے مجھے بہترین کینڈے پر خلق کیا اور اپنی مثال پر بنایا۔ پس اے پیدا کرنے والے کیا تو اب مجھ سے مکر کرے گا اور مجھے ذلیل بندر کے اسلوب پر ڈھالے گا۔ اور الیاسف اپنے حال پر رو دیا۔ اس کے بلتے ہوئے پشتے میں دراڑ پڑ گئی تھی اور سمندر کا پانی جزیرے میں آ رہا تھا۔

الیاسف اپنے حال پہ رو دیا اور بندروں سے بھری بستی سے منہ موڑ کر جنگل کی سمت نکل گیا کہ اب بستی اسے جنگل سے زیادہ وحشت بھری نظر آتی تھی اور دیواروں اور چھتوں والا گھر اس کے لیے لفظ کی طرح معنی کھو بیٹھا تھا۔ رات اس نے درخت کی ٹہنیوں میں چھپ کر بسر کی۔

جب صبح کو وہ جاگا تو اس کا سارا بدن دکھتا تھا اور ریڑھ کی ہڈی درد کرتی تھی۔ اس نے اپنے بگڑے اعضا پر نظر کی کہ اس وقت کچھ زیادہ بگڑے بگڑے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ڈرتے ڈرتے سوچا کیا میں میں ہی ہوں۔ اور اس آن اسے خیال آیا کہ کاش بستی میں کوئی ایک انسان ہوتا کہ اسے بتا سکتا کہ وہ کس جون میں ہے۔ اور یہ خیال آنے پر اس نے اپنے تئیں سوال کیا کہ کیا آدمی بنے رہنے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ وہ آدمیوں کے درمیان ہو۔ پھر اس نے خود ہی جواب دیا کہ بے شک آدم اپنے تئیں ادھورا ہے۔ کہ آدمی آدمی کے ساتھ بندھا ہوا ہے اور جو جن میں سے ہے ان کے ساتھ اٹھایا جائے گا۔ اور جب اس نے یہ سوچا تو روح اس کی اندوہ سے بھر گئی اور وہ پکارا کہ اے بنت الاخضر تو کہاں ہے کہ تجھ بن میں ادھورا ہوں۔ اس آن الیاسف کو ہرن کے تڑپتے بچوں اور گندم کی ڈھیری اور صندل کے گول پیالے کی یاد بے طرح آئی۔ جزیرے میں سمندر کا پانی امنڈا چلا آ رہا تھا اور الیاسف نے درد سے صدا کی کہ اے بنت الاخضر، اے وہ جس کے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ تجھے میں اونچی چھت پر بچھے ہوئے چھپر کھٹ پر اور بڑے درختوں کی گھنی شاخوں میں اور بلند برجیوں میں ڈھونڈوں گا۔ تجھے سرپٹ دوڑتی دودھیا گھوڑیوں کی قسم۔ قسم ہے تجھے کبوتریوں کی جب وہ بلندیوں میں پرواز کریں۔ قسم ہے تجھے رات کی جب وہ بھیگ جائے۔ قسم ہے تجھے رات کے اندھیرے کی جب وہ

بدن میں اترنے لگے۔ قسم ہے مجھے اندھیرے کی اور نیند کی اور پلکوں کی جب وہ نیند سے بوجھل ہو جائیں تو مجھے آن مل کہ تیرے لیے میرا جی چاہتا ہے۔ اور جب اس نے یہ صدا کی تو بہت سے لفظ آپس میں گڈمڈ ہو گئے، جیسے زنجیر الجھ گئی ہو، جیسے لفظ مٹ رہے ہوں، جیسے اس کی آواز بدلتی جا رہی ہو۔ اور الیاسف نے اپنی بدلتی آواز پہ غور کیا اور زاہد ابن زبلون اور ابیاب کو یاد کیا کہ کیونکر ان کی آوازیں بگڑتی چلی گئی تھیں۔ الیاسف اپنی بدلی ہوئی آواز کا تصور کر کے ڈرا اور سوچا کہ اے معبود کیا میں بدل گیا ہوں۔ اور اس وقت اسے یہ نرالا خیال سوجھا کہ اسے کاش کوئی ایسی چیز ہوتی کہ اس کے ذریعہ وہ اپنا چہرہ دیکھ سکتا۔ مگر یہ خیال اسے بہت انہونا نظر آیا۔ اور اس نے درد سے کہا کہ اے معبود میں کیسے جانوں کہ میں نہیں بدلا ہوں۔

الیاسف نے پہلے بستی کو جانے کا خیال کیا مگر خود ہی اس خیال سے خائف ہو گیا۔ اور الیاسف کو بستی کے خالی اور اونچے گھروں سے خفقان ہونے لگا تھا اور جنگل کے اونچے درخت رہ رہ کر اسے اپنی طرف کھینچتے تھے۔ الیاسف بستی واپس جانے کے خیال سے خائف چلتے چلتے جنگل میں دور نکل گیا۔ بہت دور جا کر اسے ایک جھیل نظر آئی کہ پانی اس کا ٹھہرا ہوا تھا۔ جھیل کے کنارے بیٹھ کر اس نے پانی پیا، جی ٹھنڈا کیا۔ اسی اثنا میں وہ موتی ایسے پانی کو تکتے تکتے چونکا۔ یہ میں ہوں؟ اسے پانی میں اپنی صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ اور الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آ لیا۔ اور وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

الیاسف کو الیاسف کی چیخ نے آ لیا تھا۔ اور وہ بے تحاشا بھاگا چلا جاتا تھا۔ وہ یوں بھاگا جاتا تھا جیسے وہ جھیل اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ بھاگتے بھاگتے تلوے اس کے دکھنے لگے اور چپٹے ہونے لگے اور کمر اس کی درد کرنے لگی۔ پر وہ بھاگتا رہا اور کمر کا درد بڑھتا گیا۔ کمر کا درد بڑھتا گیا اور اسے یوں معلوم ہوا کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی دوہری ہوا چاہتی ہے اور وہ دفعتاً جھکا اور بے ساختہ اپنی ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں۔ الیاسف نے جھک کر ہتھیلیاں زمین پر ٹکا دیں اور بنت الاخضر کو سونگھتا ہوا چاروں ہاتھ پیروں کے بل تیز کے موافق چلا۔

انغرے[1]

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

ابو سعید قریشی

کردار:

(۱) پشمینے : پٹھان دوشیزہ عمر بیس سال
(۲) بڈھا : اس کا باپ عمر ۸۰ سال داڑھی سفید
(۳) نوجوان

منظر

(وادیٔ کیبرداں میں ایک دیہاتی مکان کا حجرہ۔ سامنے دیوار کے عین وسط میں ایک بڑا سا دروازہ پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر کھلتا ہے۔ دروازہ کھلا ہو تو بائیں جانب دھند میں چٹانوں کی ایک قوس سی کہیں اُوپر سے آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے اور مکان کے باہر پتھر کی ایک شکستہ دیوار کے باقیات، کو چھوتی ہوئی بائیں جانب غائب ہو جاتی ہے۔ دروازے کی دائیں جانب دیوار میں اوپر ایک گول سا روشندان ہے —— یعنی ایک بڑا سوراخ۔ حجرے کے وسط میں۔ دروازے کے بالمقابل، تماشائیوں کے قریب انغرے ہے۔ جس کے دائیں بائیں دو چارپائیاں بچھی ہیں۔ بائیں چارپائی کے پائے سے تنباکو کی تھیلی لٹک رہی ہے۔ پاس ہی ہمارے دائیں ہاتھ کی دیوار میں ایک چھوٹا دروازہ ہے جس کے اوپر ایک لالٹین لٹک رہی ہے۔ بائیں ہاتھ ایک اور دروازہ جس کے قریب لکڑیوں کا ایک ڈھیر ہے۔ ان دروازوں میں کواڑ بھی نہیں۔ چھت دھوئیں سے سیاہ ہے اور جگہ جگہ جالا لٹک رہا ہے۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ برتنوں وغیرہ کے لیے تختے لگے ہوئے ہیں جن پر ڈبے اور ریوتیں رکھی ہیں ——

---

[1] پشتو: چولھا، آتش دان

بائیں جانب ایک بڑی سی پٹاری پڑی ہے ۔ پٹاری کے قریب ایک پیڑھا ہے ۔ جو کبھی رنگین تھا ۔ کپڑے کے تکیے میں ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ٹکڑے نظر آرہے ہیں ۔ دائیں جانب ایک چکی ۔

پردہ اٹھنے پر بڈھا دروازے کی چوکھٹ کا سہارا لیے باہر کو منہ کئے کھڑا شام کی سرخی مائل دھند میں دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے ۔

لڑکی — پشمینے — گھٹنوں کے بل بیٹھی انغرے میں پھونکیں مار رہی ہے ۔ لیکن ابھی آگ نہیں بھڑکی اور صرف دھواں اٹھ رہا ہے ۔ باہر ہوا کی سائیں سائیں سنائی دیتی ہے ۔ دروازے کے باہر جو دھند کی وجہ سے مٹیالا سرمئی اور سیاہ ہو رہا ہے ۔ بڈھا جیسے اپنے سر کے اوپر چوکھٹ کا سہارا لینے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے ۔ لیکن چوکھٹ اونچی ہے ۔ بازو ایسے ہی ہوا میں لہرا کر اس کے پہلو میں بے جان لکڑی کی طرح واپس آجاتا ہے اور اس کی آواز سنائی دیتی ہے)

بڈھا :۔ پشمینے — پشمینے بیٹی !

(تماشائیوں کی طرف مڑتے ہوئے آواز میں وحشت)

کہاں چلی گئیں پشمینے —

(حجرے کا جائزہ لیتا ہے اور نگاہیں لڑکی پر آکر پڑ جاتی ہیں ۔ جو انغرے میں آگ سلگا رہی ہے ۔ بڈھا اطمینان کی آہ بھرتا ہے)

پشمینے : بابا ! آگ جلا رہی تھی ۔ میں نے کہا جانے کدھر ہے ۔

(انغرے میں شعلہ چمکتا ہے ۔ لڑکی سر اٹھاتی ہے ۔ دھوئیں کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے ۔ وہ چمکتی ہوئی آواز میں جیسے انغرے میں یک لخت شعلہ لپکا تھا کہتی ہے)

یہیں تو ہوں !

(آواز مدھم پڑ جاتی ہے ۔ تن بہ تقدیر ، راضی بہ رضا) یہیں تو تھی —— مجھے کہاں جانا ہے ۔

(لڑکی پھر الاؤ میں لکڑیاں درست کرنے لگتی ہے)

بڈھا : ارے بُرا مان گئیں بیٹی —

(انغرے کی طرف بڑھتا ہے اور اس کے سر پر آکر کھڑا ہو جاتا ہے)

بڈھے باپ کی بات کا بُرا مان گئیں ۔ پگلی — ناراض ہو گئیں ۔ بہت کام کرنا پڑتا ہے نا تجھ کو ۔ جانتا ہوں ۔ میں خوب جانتا ہوں ۔

پشمینے : (سرو قد کھڑی ہو جاتی ہے ۔ سنجیدہ لہجے میں طنز) باپ جو ہوئے تم !

بڈھا : کاش تیری ماں زندہ ہوتی آج — (لڑکی کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے) بچلنے (لڑکی کی ٹھوڑی کو انگلی سے چھوتا ہے) اُس کے چہرے پر بھی ایسا ہی خال تھا پشمینے۔ گوجی لڑکیاں جب چشمے پر پانی بھرنے آتیں تو پوچھا کرتیں کہ یہ خال تم نے کہاں سے گدوایا ہے۔ ہمارے خال تو بس چکے ہیں اس کے سامنے۔ (ہنسنے کی کوشش کرتا ہے) اور تیرے بھائی کی ٹھوڑی پر بھی ایسا ہی تِل تھا۔ سُنا تو نے پشمینے، بچپن میں ماں کا سایہ۔

(مکان کے باہر روشنی یکایک کم ہو جاتی ہے۔ اور درختوں کی شاخوں میں ہوا کی سائیں سائیں سنائی دیتی ہے۔ لڑکی دروازے کی طرف بڑھتی ہے)

بڈھا : کہاں چلیں بیٹی؟

پشمینے : دروازہ بند کرنے اور میں کہاں جاسکتی ہوں۔ اور کون سی جگہ ہے میرے لیے؟

بڈھا : دروازہ! — اچھا تیری مرضی۔ لیکن تیرا بھائی نہیں آیا اب تک — شام ہو گئی۔

پشمینے : (دروازہ دھائیں سے بند کر کے کھٹکا لگاتی ہے۔ کمرے میں تاریکی بڑھ جاتی ہے۔ لڑکی لالٹین روشن کرنے کے لیے بڑھتی ہے جو دائیں جانب دروازے کے اوپر کھونٹی سے لٹک رہی ہے)

بیس برس سے اسی طرح شام ہو رہی ہے۔ شام کے بعد رات۔ پھر صبح اور پھر شام۔ لیکن وہ اب تک نہیں آیا۔ اب نہیں آئے گا وہ کیسے آسکتا ہے جبکہ تم خود اُس کو ماں کی پائنتی بوڑھے چنار کے نیچے دفن کر چکے ہو۔

بڈھا : (یادیں) بوڑھے چنار کی چھاؤں میں جہاں تیرے دادا کے باپ کا قافلہ اترا تھا —— ٹھیک کہتی ہے تو بیٹی بند کر دے دروازہ۔ میں تو دیوانہ ہو گیا ہوں۔ وہ اب کہاں آئے گا۔ کیسے آسکتا ہے وہ۔ یہاں کیسے آسکتا ہے وہ۔

پشمینے : (لالٹین جلا کر فرش سے اٹھاتی ہے اور اپنے چہرے کے برابر لا کے بتی اونچی کرتی ہے اُس کا چہرہ مایوسی کی تصویر ہے) جس طرح میں یہاں سے نہیں جاسکتی۔

بڈھا : (اپنے خیالات میں محو) تیرا باپ واقعی پاگل ہو گیا ہے پشمینے۔

(اپنے سر اور کندھوں کو جھٹکتا ہے)

پشمینے : (بڈھے کی چادر کے نیچے کندھے سے لٹکتی ہوئی توڑے دار بندوق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ بوجھ بھی اتار دو۔ اتنا بوجھ کون ہو سکتا ہے کہ تمہارے راستے سے گذرے گا۔ جان بوجھ کر موت کے منہ میں آئے گا؟؟

بڈھا : —————— تو ٹھیک کہتی ہے لڑکی (بندوق اتارتا ہے) وہ جانتے ہیں کہ میرا نشانہ کبھی نہیں چوکا اس بندوق سے (بندوق کو کندھے سے لگا کر دروازے کی طرف شست باندھتا ہے) تیرے پردادا کی بندوق سے میرا نشانہ کبھی نہیں چوک سکتا۔ (بندوق کندھے سے اتار کر لڑکی کے سپرد کرتا ہے) یہیں۔ اسی وادی میں شیر مارا تھا میرے دادا نے۔ (غصہ اور بے بسی) لیکن میں بدبخت اپنے بیٹے کے قاتلوں کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ ایک آدمی بھی اُن کا نہیں مار سکا۔ جنھوں نے اس غریب کو خون میں نہلا دیا تھا اور کہا تھا کہ حادثہ ہو گیا، اتفاق سے ہاتھ جا پڑا لبلبی پر —— ترلورا!

قاتل میرے بھائی کے۔ میرے بیٹے کے قاتل ـــ (اُس کے ہونٹوں سے کف بہہ نکلتا ہے) خونی!!

شمینے : (بندوق کو کونے میں کھڑا کرکے لوٹتی ہے) بیٹھ جاؤ اب آگ کے پاس۔ سردی بڑھ گئی ہے۔ (بڈھے کو چارپائی پر بٹھا دیتی ہے) نسوار کی ڈبیہ کہاں ہے تمہاری (تکیہ اٹھاتی ہے)۔ یہ رہی ـــ

(بائیں دروازے کے قریب پڑے ہوئے مٹکے سے کیتلی میں پانی انڈیلتی ہے اور دیوار کے ساتھ لگے ہوئے تختے سے ڈبہ اتار کر چار کی پتی ڈالتی ہے اور کیتلی کو آگ پر رکھ کے اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے)

بڈھا : (آگ میں ٹھوکنے ہوئے) شمینے۔ کیا تجھ کو بھی یقین آتا ہے اس قصّے کا کہ یہ حادثہ تھا۔ غلطی سے ہاتھ جا پڑا لبلبی پر۔ اور بندوق چل گئی۔

شمینے : ہو سکتا ہے۔ ہو جاتا ہے یوں بھی ہوتا آیا ہے۔ اُن کو ہم سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔

بڈھا : تربور کا مطلب ہی دشمن ہے بیٹی۔

شمینے : ضروری نہیں ـــ دوست بھی ہو سکتا ہے۔ ایک ہی دادا پردادا کی اولاد۔ کیا گنوایا تھا ہم نے اُن کا۔ کوئی آدمی مارا تھا؟

بڈھا : نہیں ـــ

شمینے : جائداد چھینی تھی؟

بڈھا : نہ!

شمینے : کوئی رشتہ چھوڑ دیا تھا۔

بڈھا : اونہہ ہونہہ۔

شمینے : تو؟

بڈھا : بس یہی تو بات ہے۔ انھوں نے تیرے بھائی کو بھی مار ڈالا (انکشاف) شبیر کو نہیں مار سکے تھے۔ وہ میرے دادا کی طرح۔ پڑپوتے کو مار ڈالا ـــ حاسدوں نے کہ ہم شبیر کے شکاریوں کے شکاری ہیں۔

شمینے : (ایک ہلکا سا طنزیہ قہقہہ لگاتی ہے)

بڈھا : ہاں۔ ہاں۔ اپنی بزدلی کا انتقام لیا انھوں نے۔ یہ حادثہ نہیں تھا سازش تھی سازش۔

شمینے : یا وہم ـــ!

بڈھا : (صدمہ) وہم؟

شمینے : کہ تربور دشمن ہوتے ہیں۔

بڈھا : یہ ہمارا ایمان ہے بیٹی۔ ان پہاڑوں چٹانوں اور چناروں کا ایمان۔ کوہِ سفید کی چوٹیوں پر کبھی نہ پگھلنے والی برفوں اور کُرم کی موجوں کا ایمان ہے۔

شمینے : کہ دادا کی اولاد کو دشمن سمجھو اُن کے لہو سے چراغاں کرو۔ اُن کی ہڈیوں کی مٹی سے اپنے حجروں میں لیپ کرو اور زیرِ جو

کو جھکاؤ۔ یہ ایمان ہے ہمارا۔ ہاں ہمارا ایمان ہے ہمارا۔ ہاں ہمارا ایمان ہے کہ کراہتے رہو، سلگتے رہو، جلتے رہو۔ چناروں کی طرح۔ قافلوں کے راستوں میں چھوڑی ہوئی لکڑیوں کی طرح کوئلہ ہو کر رہ جاؤ۔ بھسم ہو جاؤ پندار کے تنور میں۔ نسلی برتری کے نشے میں حیوان بن جاؤ۔ بچوں کی طرح دشمنی کے بہلانے تراشو، انتقام کے انتظار میں بڑھاپے کو دیوانگی کی آگ میں جھونک دو۔ اور (المیہ) اور جوانی کو بڑھاپے کی برف کے نیچے سرد کر دو۔ یہ ایمان ہے ہمارا — (بلو وجہ کانپ جاتی ہے جیسے سردی ہے۔ لکڑیاں الاؤ میں چٹخنکتی ہے۔ باہر دور سے بادل گرجنے کی آواز آتی ہے۔ دروازے کی جھریوں اور روشن دانوں سے ہلکی ہلکی بجلی چمکتی ہے)

بڈھا : (چیخ کر) میری بندوق پشمینے!

پشمینے : کس لیے؟

بڈھا : یہ آوازیں نہیں تو نے؟

پشمینے : بادل تھا۔

بڈھا : اوہ — میں نے کہا نقارہ ہے لشکر آیا ہے۔

پشمینے : اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ہیں۔

بڈھا : (حیرت سے دیکھتا ہے۔ دفعۃً ہوا کی سائیں سائیں۔ آبشار کی آواز)

پشمینے : (رومان، درحسرت، بہ ہوا، سرو درختوں کی سرگوشیاں، چناروں کے تالیاں پیٹنے کی آوازیں۔ آبشار کا نغمہ۔ اور کوئی آواز سنائی نہیں دیتی ہیں۔ (چند ساعت یہ آوازیں بھرپور سنائی دیتی ہیں اور پھر ہوا یکایک بند ہو جاتی ہے اور جھینگر کی آواز سنائی دیتی ہے) اور یہ جھینگر! بڈھے چنار کے تنے کا جھینگر (تاسف) بھسم ہو جائے گا الاؤ میں۔ (شکوہ) اور کوئی آواز بھی سنی تم نے —

(دروازے کی جھریوں اور روشن دانوں سے بجلی کے لشکارے اور پھر کوند لپکنے کی آواز)

بڈھا : بہت ڈرتی تھی تیری ماں بجلی سے۔ آنکھیں بند کر لیتی تھی لحاف اوڑھ کر۔ بابا فرید گنج شکرؒ کی امان مانگا کرتی تھی۔ جب تک آسمان صاف نہیں ہو جاتا تھا۔ اور۔ اور کیا مجال جو گھر کے باہر قدم رکھ جائے کہا کرتی تھی کہ پکڑ کر لے جاتی ہے بجلی —— سن رہی ہے پشمینے؟

پشمینے : سن رہی ہوں۔

بڈھا : (ہنستے ہوئے) اور کہتی تھی، کہا کرتی تھی کہ ان پہاڑوں ہی میں تو رہتی ہے بجلی۔ اس تکونی چوٹی کے پاس۔ غاروں میں چھپی رہتی ہے۔ سنا تم نے بچے۔ میرا مطلب ہے پشمینے۔ کیسے کیسے قصے گھڑ رکھے ہیں لوگوں نے۔ ہاں ابھی اور سنو۔ کہتے ہیں بھائی بہن ماموں بھانجی اگر ایک حجرے میں سوئے ہوں تو بجلی ضرور گرتی ہے۔

پشمینے : اور باپ بیٹی پر نہیں گرتی —

(دروازے کی جھریوں اور روشندان کے سوراخ سے بجلی کا چوندھیا دینے والا لشکارا جس میں لڑکی اور بڈھے چہرے لاشوں کی طرح زرد اور نیلے نظر آتے ہیں)

بڈھا : قصے ہیں قصے! تو تو نہیں مانتی ہے نا۔ ان حصوں کو پشمینے (بجلی کا لشکارا اور کڑکا) اولے پڑیں گے (بڈھا چھت کی طرف دیکھتا ہے) برف گرے گی۔

پشمینے : کرنے دو منظر ہی بدلے گا۔ کچھ تو ہو گا۔ کچھ تو ہونا چاہیئے! یہ دھند تو ہٹے گی۔ یہ دھواں تو ہٹے گا۔ (لمبی سانس لیتی ہے۔ بے رحم چٹانوں کا سرمہ۔ سر سفید ہو گیا۔ (چٹیا کو ہتھیلی پر رکھ کر جیسے سفید بال دیکھتی ہے اور پھر فیصلہ کن انداز میں۔ تن بتقدیر) ہو جائے گا۔ نہیں ہوا تو۔

(لاپروائی سے چٹیا کو پیچھے پھینک دیتی ہے۔ ہوا کی سائیں سائیں اور پتوں کی کھڑکھڑاہٹ سنائی دیتی ہے)

بڈھا : سو پھر جاگ اٹھی پشمینے۔

پشمینے : سوئی کب تک۔

بڈھا : بھلا کہتی ہے تو۔ او نگھ گئی ہو گی۔ میری طرح۔

پشمینے : سو جاؤ نا اب! سو کیوں نہیں جاتے؟ نیند کا سامان کر دوں۔

(چارپائی سے اٹھتی ہے اور برابر کے کمرے میں غائب ہو جاتی ہے اور قہوے کی ایک پرانی پیالی لے کر لوٹتی ہے۔)

یہ لو۔

(پیالی کو بڈھے کے ہاتھ میں تھما دیتی ہے اور کیتلی اٹھا کر اس میں سے قہوہ انڈیلتی ہے بڈھا متوقع نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ لڑکی کیتلی کو پھر انگرسے میں رکھ دیتی ہے۔ کونج کی طرح دونوں بازوؤں سے اپنی چادر پھیلاتی ہے۔ اُس کی قمیص میں جگہ جگہ پیوند لگے ہیں۔ اور گریبان کے گرد شیشوں کی جگہ خالی نشان باقی رہ گئے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ اترن ہے۔ وہ اپنے تعویزوں کے گچھے جھٹکے سے ایک طرف جھٹک دیتی ہے اور گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک ڈبیہ نکالتی ہے۔ جھجکتی ہے۔ اس کی ہتھیلی پر سبز رنگ والی ڈبیہ کا ڈھکنا کھلتے وقت شعلے کی طرح چمکتا ہے۔ بڈھے کی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں۔ وہ کانپتی ہوئی انگلیوں سے ایک گولی اُٹھا کر قہوے میں ڈالتا ہے لڑکی ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔ بڈھا ہاتھ بڑھاتا ہے لیکن ڈبیہ ٹنخ سے بند ہو جاتی ہے)

بڈھا : (کھسیانی ہنسی) یہ نہ ہوتی تو آدمی کیا کرتا پشمینے۔ کیسے بھلاتا غم کو، درد کے احساس کو کس طرح شل کرتا؟

پشمینے : (حقارت سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے) میں کیا جانوں مجھے کیا معلوم۔

(اُس کے سر سے چادر پھسل کر نیچے گر پڑتی ہے)

بڈھا : (افیون گھولتا ہے) مجھے یاد آ گئی، تیرے ان تعویزوں کو دیکھ کر۔ تیری ماں بڑی عقیدتمند تھی۔ اُسے پیروں فقیروں سے جہاں کوئی آیا پہنچا ہوا۔ سیدھی دوڑی کہ تعویز لاتی ہوں پشمینے کے لیے۔

پشمینے : اور ایک روز پشمینے بھی تعویز بن گئی۔ ماں کی یادوں۔ بھائی کے مزار کا باپ کے گلے کا تعویز۔ انتقام کا بازو بند۔ یادوں کی انگشتری کا نگینہ۔ خاندان کے گریبان کا گرد آلود۔ زنگار خوردہ آئینہ جس پر کوئی چیز درست نظر نہیں آ رہی (قریب قریب چیخ کر) دبی جا رہی ہوں میں ان تعویذوں کے بوجھ تلے (زیادہ۔ سر ہلاتے ہوئے) گردن نہیں ہل رہی ہے میری۔ سر نہیں اٹھا سکتی۔ میں اس وزن کے باعث۔ (طنز آمیز) بڑی محبت تھی میری ماں کو مجھ سے بہت چاہتا ہے میرا باپ مجھے۔

بڈھا : ایک ہی بیٹی ہو جس کی۔ اکیلی (ہچکی لگاتا ہے)

پشمینے : اکیلی!۔

بڈھا : (وقفہ) نظر سے بہت ڈرتی تھی تجھے ماں تیری۔

پشمینے : (چادر کو فرش سے اٹھاتی ہے اور اپنے گرد اس اہتمام سے لپٹتی ہے کہ سوائے چہرے کے جسم کے سبھی حصے چھپ جاتے ہیں) فکر مت کرو۔ کسی کی نظر نہیں لگے گی تمہاری لاڈلی کو۔

(لڑکی اندھیرے کی طرف منہ کئے اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کے چہرے پر شعلوں کا عکس پڑ رہا ہے)

بڈھا : (ہچکی لگاتا ہے) (وقفہ) (جھینگر کی آواز بلند ہوتی ہے۔ ہوا کی سرگوشیاں اور دور بادل کی گڑگڑاہٹ) وہ نہیں آیا ابھی؟

پشمینے : آ گیا تو ڈر جاؤ گے۔ مار ڈالو گے اسے۔

بڈھا : (توقف۔ ہوا کا شور۔ دروازہ پھڑپھڑاتا ہے۔ نشہ آلود نگاہوں سے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے) تیرا بھائی۔

پشمینے : (بیزار) سو رہا ہے بڑے چناروں کی چھاؤں میں۔

بڈھا : ہوں!

پشمینے : تم بھی سو رہو۔ اب کوئی نہیں آنے والا۔ کوئی نہیں آنے گا۔

بڈھا : اور جو آ گیا اور دروازہ بند پایا۔۔۔

پشمینے : کہہ تو دیا۔ اب یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔

بڈھا : اور آ گیا تو؟

پشمینے : دھند کے بگولوں، درختوں کی آہوں، مردوں کے سایوں کے سوا اور کون آ سکتا ہے یہاں۔ (بھیڑیوں کی آواز آتی ہے) بھوکے بھیڑیوں کی آوازوں کے سوا۔ (بجلی چمکتی ہے) موت کی چشمکوں کے علاوہ۔

بڈھا : (نیم بے ہوشی) کیا کہا بیٹی؟

پشمینے : کچھ نہیں۔

بڈھا : میں نے کہا، مجھ سے کچھ کہا ہے شاید۔

پشمینے : سو رہو اب! سو جاؤ۔

بڈھا : اور۔۔۔ تو۔۔۔ تو۔۔۔ تو نہیں لیٹے گی تجھے (چونک کر) پشمینے میرا مطلب ہے تو بھی تو سو جانا! بیٹی۔

پشمینے : سونا ہی تو ہے عمر بھر کا۔ (بڈھے کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) سوتے میں جاگنا اور جاگتے میں سونا۔ جینا نہ مرنا۔

بڈھا : (وقفہ۔ چند ساعت کی مکمل خاموشی اور پھر طوفان اور ژالہ باری کا شور) طوفان ؟
پشمینے : شاید تب تھا۔

(روشن دان سے تڑ تڑ اولے گرتے ہیں)

بڈھا : گھاس جل جائے گی۔
پشمینے : دودھ سوکھ جائے گا گائے بھینسوں کا۔ اور آدمیوں کے بچے بھوک سے بلکیں گے۔ کچے بھٹے جل جائیں گے اور پکی بالیں ٹوٹ کر مٹی میں گر پڑیں گی اور آندھیاں اُن کے سنہری دانوں کو اڑا کر دوسرے کھیتوں میں جا پھینکیں گی۔ جہاں نرالے بادل ان کی آبیاری کریں گے۔
بڈھا : اور انگوروں کے خوشے !
پشمینے : بھوکی بکریوں کے تھنوں، بیمار ماؤں کی چھاتیوں کی طرح سوکھ جائیں گے اور اُن کی رگیں سیاہ سنپولیوں اور کالے کیچوؤں کی طرح بل کھا کر رہ جائیں گے۔

(طوفان کا شور۔ چند اولے بڈھے کی چارپائی کے پاس پڑے ہوئے مٹکے پر گرتے ہیں
جیسے رباب پر بے ربط مضرابیں پڑ رہی ہوں)

بڈھا : (چہرہ چمک اٹھتا ہے ہاتھ بڑھا کر گھڑے کے کنارے کو انگلی سے بجاتا ہے) ٹنگ ٹکور ـــ

(اس مضمون کا یہ ٹپہ گنگناتا ہے)

فصلیں میرے بالوں کی طرح سنہری ہو گئیں ــ آ میرے محبوب کٹائی کا موسم آ گیا۔

(لڑکی غیر شعوری طور پر اپنے سنہرے بالوں کو ہتھیلی پر رکھ کر دیکھتی ہے۔ اور اپنے خیالات میں گم ہو جاتی ہے۔ اس کا چہرہ دبی ہوئی خواہشات کا آئینہ دار ہے۔ بڈھا گنگناتے ہوئے چپ ہو جاتا ہے اور اسی ٹپے کے الفاظ نسوانی آواز میں ابھرتے ہیں۔ جیسے ہوا کے جھونکے آ رہے ہوں۔ ٹپہ جب دوبارہ گایا جا چکتا ہے تو بڈھے کے ہونٹ پھر ہلتے ہیں اور اس مضمون کا ٹپہ گنگناتا ہے۔ میں لونگوں کی شاخ ہوں اے مسافر آ اور میرے سائے میں سستا۔ لڑکی مضطرب ہو کر اٹھ کھڑی ہوتی اور ٹہلنے لگ جاتی ہے۔ نسوانی آواز پھر اس ٹپے کو اٹھاتی ہے اور وہ ایک بار دہراتی ہے)

بڈھا : (لڑکی ٹہلتے ہوئے اس کے قریب آ جاتی ہے۔ بڈھا چونک کر اس سے مخاطب ہوتا ہے) بخملئے !
پشمینے : (تیز) میں پشمینئے ہوں بیٹی بخملئے کی۔
بڈھا : (صدمہ اور نیم بیداری) ہا ! ہو۔ او۔ وہ ــ کتنے ٹپے یاد تھے تیری ماں کو۔ اور لوبے سندروں کی کھیتی تھی۔ شاخ تھی۔ ندی تھی بخملئے ــ قصے اور بدلے۔ موسیٰ خاں گل مکئی آدم خان درخانئی۔ پشمینئے بیٹی کیا تو بھی جانتی ہے کہ ان کی قبر پر جو درخت لگا ہے اگر اس کی لکڑی سے مضراب بنائی جائے تو رباب بجانا آ جاتا ہے اور یہ محبت کی تاثیر ہے۔

پشمینے : (چونک کر) مجھ کو کیا معلوم! ۔ (حسرت سے) میں کیا جانوں؟

بڈھا : (دانستہ) مجھلے کی طرح تیرے بھائی کو بھی موسیقی سے بے پناہ محبت تھی اثر خون کا۔ جب وہ چشمے کے کنارے رباب لے کو بیٹھتا تو لڑکیاں پانی بھرنا بھول جاتی تھیں۔ (لڑکی کانپ جاتی ہے) رباب کہاں ہے اُس کا۔

پشمینے : (پٹارے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) پٹارے میں خود ہی تو رکھا تھا اگلے روز۔

بڈھا : (بہ دقت اٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ جیسے گھٹنے کا مریض ہو پٹارے کی طرف بڑھتا ہے اور دیوار کا سہارا لیتے ہوئے پٹارے پر جھک جاتا ہے پٹارے کا ڈھکنا اتارتا ہے۔ پٹارے کے اوپر جھکا ہوا لمبا سانس لیتا ہے اور پٹارے سے ایک پرانی قمیص نکالتا ہے اور سونگھ کر مسکراتے ہوئے بیٹی کی طرف دیکھتا ہے)۔ مجھلے کی قمیص پشمینے۔ خوشبو اُس کے بدن کی۔ (دوبارہ ناک کے قریب لاتا ہے اور ایک لمبا سانس لیتا ہے۔ چند لمحے حسرت آلود نظروں سے دیکھتا ہے اور واپس رکھ دیتا ہے۔ پھر رباب نکالتے ہوئے بچوں کی طرح خوشی کے عالم میں) مل گیا۔ میرے والد نے خریدا تھا۔ پشاور سے ہاں۔ جتنا پرانا ہوا اتنا سُریلا۔ اور یہ سیپ کا کام۔ بادام اور خوبانی کے شگوفے اور تیرے بھائی کی مضراب گل نغمہ تھی، گل نغمہ۔ مرغِ زریں مست ہو کر پہاڑی چوٹیوں سے اتر آتے تھے۔ (بھروی ماتم) مگر اب تو صرف نالہ رہ گیا ہے۔

پشمینے : (طنز) بدلہ گائیں گی یہ سوکھی آنتیں۔

بڈھا : (اپنے خیالات میں گم) بیچ بیچ (تاروں پر ہاتھ پھیرتا ہے تار ایک ایک کر کے اپنا اپنا سر دکھاتے ہوئے ٹوٹ جاتے ہیں)

پشمینے : سر پٹخنے سے ہوا اب بیٹھے۔ (بڈھا حیرت سے لڑکی کی طرف دیکھتا ہے۔ وقفہ۔ رباب کو واپس پٹارے میں رکھتا ہے اور ایک خنجر نکالتا ہے)

بڈھا : (خنجر کو نیام سے باہر نکال کر) تیرے دادا کی کمر سے علیحدہ نہیں ہوتا تھا کبھی کون جانے کس وقت زور آوروں سے مقابلہ ہو جائے اور بندوق دھوکا دے جائے۔ بارود ہی تو ہے نم ہو گئی تو بے کار۔ لیکن دست بدست لڑائی ہو تو خنجر!! زنگ لگ گیا۔ جانے کس چیز کی جلا دی جاتی ہے۔ اس کو جب تک آدمی کے خون سے نہ دھلتا رہے وقتاً فوقتاً زنگ لگ جاتا ہے۔ پتھر پر گھسنے سے بھی نہیں اترتا اور خون کا ایک قطرہ بھی چھو جائے تو نئے چاند کی طرح چمک اٹھتا ہے۔

پشمینے : نہیں۔ خون کے اس ایک قطرے، معصوم انسان کے خون کے بس ایک قطرے سے تو تیرے پہ آیا ہوا سورج بھی گہنا جاتا ہے۔

بڈھا : (دہشت آلود نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھتا ہے اور کانپتی ہوئی انگلیوں سے آنکھوں پہ سایہ کرتا ہے) میں بھی کہوں اندھیرا کیوں ہے اتنا (خوف سے) گہن لگ رہا ہے، سورج کو (لڑکی سے) تو ٹھیک کہتی ہے بیٹی اب کیا ہو گا؟؟؟

پشمینے : بند کر دو یادوں کے اس پٹارے کو اور سو جاؤ۔ (اٹھ کر آتی ہے اور خنجر کو نیام کر کے پٹارے میں دفن سی کرتی ہے اوپر خوب زور سے ڈھکنا بند کر دیتی ہے) ایسا بند کر دوں کہ پھر نہ کھلے۔ اُٹھو اب۔ (بڈھے کو اٹھاتی ہے۔ ہوا کا شور) سردی بہت بڑھ گئی ہے۔

بڈھا : وہ جو باہر سردی کھا رہا۔۔۔

پشمینے : کھانے دو۔ یہاں انتڑیے سرد ہوا جا رہا ہے۔ جس پہ ہم نے پہاڑ سی رات کاٹنا ہے۔ اور نہیں اس کی پڑی ہے جو نہیں ہے۔

بڈھا : (دو سا ڈکار آتا ہے) اور، اور

پشمینے : (بڈھے کو چارپائی پر لٹاتے ہوئے) ضرور نہیں پھنکا ابھی کہ مُردے چلے آئیں گے اٹھ کر تمہاری خاطر یا پھر اتنا بیزار کون ہو گا زندگی سے کہ آپ سے آپ تمہارے وہم کی گود میں آن گرے گا۔ (طنز) تمہارے دادا کی بندوق کے منہ میں چلا آئے گا گردن رکھ دے گا اس کے خنجر کی دھار پر کہ آؤ بیٹے کے قتل کا انتقام لے لو۔ (اس کو لحاف اوڑھاتی ہے) قتل جو کہ قتل نہیں تھا حادثہ تھا تمہارے اپنے بیان کے مطابق پہاڑ سے پھسل کر کھڈ میں گر جانے کی طرح کا حادثہ۔ بدقسمتی تھی۔ فاقوں اور دباؤں سے دم توڑنے کی طرح۔ بڑھتے چاند کے گھٹنے۔ ستاروں کے ٹوٹنے۔ دن کے ڈھلنے، قحط سالی، ٹڈی دل، سیلاب، زلزلے اور آگ کی طرح (لمبا سانس) مقدر تھا۔ سیہ بختی تھی، تمہارے باپ بننے اور میری پیدائش کی طرح (طوفان کی آواز بلند ہوتی ہے) لو اب سو جاؤ۔ اور خواب کے ان چند لمحوں، بے ہوشی کی اُن ساعتوں کو غنیمت جانو جن میں درد اور غم کا احساس بھی سو جاتا ہے (تھپکتے ہوئے) سو جاؤ۔ سو جاؤ۔

بڈھا : تم بھی تو سو جاؤ۔

پشمینے : سو جاؤں گی میں بھی۔ (اپنے بستر پر لیٹ جاتی ہے) سو ہی جاؤں گی ایک دن (اپنے آپ سے) ایک دن جس کے بعد کوئی دن نہیں آئے گا۔ صرف رات ہی رات ہو گی۔ رات اور نیند۔ نیند جس سے مجھے کوئی نہیں جگائے گا۔ کسی بڈھے کا دم مجھے راتوں کو قاتل یا مقتول کا انتظار دیکھنے پر مجبور نہیں کرے گا۔ اور کوئی زندہ کسی مردے کی خاطر اپنا دروازہ کھلا نہیں چھوڑے گا

(طوفان کی آوازیں جو چند لمحوں تک جاری رہتی ہیں۔ یکایک دروازہ پٹنے کی آواز آتی ہے)

بڈھا : (چونک کر) پشمینے! دروازہ پشمینے (کہنی کے بل بیٹھ جاتا ہے۔ پشمینے خاموش رہتی ہے۔ دروازے پر پھر دستک ہوتی ہے) کوئی ہے پشمینے۔

پشمینے : (شک و شبہ) ہوں (بستر سے اٹھتی ہے اور دروازے کی جھریوں سے جھانکتی ہے۔ باہر بجلی چمکتی ہے۔ دستک۔ باپ کی طرف دیکھتے ہوئے) کوئی ہے۔

بڈھا : کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ اس سے پوچھو۔

پشمینے : (دروازے کی طرف بڑھتی ہے) کون ہو تم اور کیا چاہتے ہو اس وقت۔

مسافر گل : (دروازے کے باہر اُس کی آواز طوفانوں کے شور میں بڈھے کو سنائی نہیں دے سکتی) پناہ۔ پناہ۔ بزرگوں کے واسطے پناہ۔

پشمینے : (بڈھے سے) پناہ چاہتا ہے بزرگوں کے واسطے۔

بڈھا : پناہ؟ (بجلی کڑکتی ہے۔ بڈھا ہوشمند انسانوں کی طرح بستر پر بیٹھ جاتا ہے) ٹھیک ہے۔ انتقام لینے کی طرح پناہ دینا بھی ہمارا ایمان ہے پشمینے اس زمین اور آسمان کا ایمان بیٹی (افتخار) بیٹے کے قاتل کا بیٹا بھی آ جائے تو بھی پناہ دینا ہو گی اس کو۔ وہ بھی مہمان ہو گا دوسرے مہمانوں کی بہ نسبت زیادہ عزت کی جائے گی اُس کی (تحکمانہ) دروازہ کیوں نہیں کھولتیں پشمینے۔ مہمان کھڑا ہے تمہاری دہلیز پہ۔

(ہوا کے دباؤ سے دروازہ نہیں کھلتا لڑکی اپنا پورا وزن ڈالتی ہے اور کھٹکا کھول دیتی ہے۔ کواڑ پٹ سے کھل جاتے ہیں اور دیواروں کے ساتھ ٹکراتے ہیں۔ ہوا سے لڑکی کی چادر اُڑ جاتی ہے اور اولوں کا ایک جھونکا کمرے میں گھستا ہے۔ باہر بجلی چمک رہی ہے۔ دروازے میں بیس بائیس برس کا ایک جھکا ہوا نوجوان نمودار ہوتا ہے۔ یہ منظر گل ہے۔ اس کے اور پشمینے کے خدوخال میں کچھ عجیب پر اسرار سی مشابہت نظر آتی ہے۔ لڑکی دروازے کے پٹ بند کرنا چاہتی ہے۔ لیکن ہوا کے سامنے زور نہیں چلتا۔ نوجوان اپنی بانہیں پھیلاتا ہے اس کے ہاتھ لڑکی کے ہاتھوں کے قریب ٹکتوں پر نظر آتے ہیں۔ اور لڑکی قریب قریب اُس کے سائے میں چھپ جاتی ہے)

بڈھا : (جو اس سارے منظر کو بت بنے بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ اپنی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ جیسے جالا سا آگیا ہو اور چیخ اٹھتا ہے) کدھر ہو تم پشمینے۔ (نوجوان اور پشمینے ایک وقت جیسے رقص کی حالت میں باہیں پھیلاتے ہوئے گھومتے ہیں۔ لیکن اُن کی تنی ہوئی گردنیں جھک جاتی ہیں اور بازو جھکے ہوئے غلاموں کی طرح بے جان سے ہو کر پہلو میں لٹکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بڈھا بیٹی کو دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتا ہے) اوہ۔ میں نے کہا جانے کہاں چلی گئی ہے۔

پشمینے : (تن بہ تقدیر) یہیں تو تھی۔ مجھے کہاں جانا ہے (حسرت) میں کہاں جا سکتی ہوں۔ کس کے ہاں جانا ہے مجھ کو۔۔۔

(لڑکا اپنی گردن گھما کر چند لمحوں کے لیے پر اسرار نگاہوں سے پشمینے کی طرف دیکھتا ہے۔۔۔

۔۔۔۔۔۔ پشمینے کی آنکھیں بھی غیر ارادی طور پر اس کی آنکھوں سے ملتی ہیں۔ جیسے ایک دوسرے سے متعارف ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یکایک طوفان کی آواز پھر ابھرتی ہے۔ نگاہوں کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے)

منظر گل : (سینے پر ہاتھ رکھتا ہے اور چہرے پر انتہائی درد و کرب کے آثار نمودار ہوتے ہیں) اوہ یہ ٹھنڈا درد۔ یخ بستہ خنجر۔ موسم کی کمان کا تیر۔ پناہ اس بے رحم موسم سے پناہ!

(طوفان کا شور ابھرتا ہے نوجوان لڑکھڑاتا ہوا کراہتا ہوا پشمینے کی چارپائی پر گر پڑتا ہے۔ طوفان کا شور اور تیز ہو جاتا ہے۔ پشمینے بت بنی کھڑی ہے۔ اس کی نگاہیں گویا نوجوان کے ساتھ چپک کر رہ گئی ہیں۔ اس کے ہاتھ پاؤں شل محسوس ہوتے ہیں) (وقفہ)

بڈھا : پشمینے!۔۔ دیکھ کیا رہی ہے لڑکی؟

پشمینے : (وارفتگی) دیکھ رہی ہوں۔ کیا دیکھ رہی ہوں میں (یکایک دفعتاً بانہوں سے اپنا سینہ ڈھانپ لیتی ہے) چادر کہاں ہے میری۔

بڈھا : پگلی ہو گئی ہے لڑکی۔ وہ کراہ رہا ہے درد سے۔ سانس گھٹ رہا ہے اس کا۔ اور تجھے چادر کی پڑی ہے۔ ٹھنڈ لگ گئی ہے بیٹا اس کو۔ بے ہوش ہوا جا رہا ہے تیرا بھائی۔

پشمینے : (چیخ کر) نہیں۔ یہ بھائی نہیں ہے میرا۔ یہ بھائی نہیں ہو سکتا میرا۔ مہمان ہے موسم سے پناہ لینے آیا ہے۔

بڈھا : تو ۔۔ تو ۔ منہ کیا دیکھ رہی ہو اُس کا۔ بھیگے کپڑے کیوں نہیں اتار دیتی اُس کے ۔ وہ ٹھٹھر رہا ہے ۔ غریب کا خون جم رہا ہے اُس کا ۔۔ ٹھہر میں خود آتا ہوں ۔۔ یہ لڑکیاں اگر ایسے کام کر سکتیں تو آدمی بیٹوں کے انتظار میں بڈھا ہی کیوں ہوتا۔ راہ تکتے تکتے اُن کی آنکھیں کیوں سفید ہو جاتیں (چارپائی کی پٹی کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ چہرے پر درد و کرب اور پھر بے بسی کے آثار پیدا ہوتے ہیں) نہیں ۔ (گھٹنوں پر ہتھیلیاں مارتا ہے) غم بیٹھ گیا جوڑوں میں ۔ اور پھر یہ افیم ۔ لیکن اس کے بغیر جینا بالکل ہی دوبھر ہو جاتا ۔۔

(پشمینے فرش سے چادر اٹھا کر سر ڈھانپتی ہے اور تختے سے قینچی اتار کر چارپائی کی طرف بڑھتی ہے جہاں نوجوان اوندھے منہ لیٹا ہوا ہے ۔ پشمینے نوجوان کی قمیص کاٹتی ہے ۔ قینچی کی آواز سے بڈھا چونک پڑتا ہے ۔ اور اسے پھر موقع کی نزاکت کا خیال آتا ہے ۔ سیکنڈ بعد جس میں پشمینے مہمان کی قمیص کاٹ دیتی ہے ۔ بڈھا چیخ اٹھتا ہے)

شیر کی چربی! شیر کی چربی کا مرہم پشمینے! کہاں ہے وہ شیشی؟ (چٹکی بجاتا ہے) بس یوں چلتی ہے درد کو شیر کے گردوں اور دل کی چربی ۔ کدھر ہے وہ مرہم ۔

پشمینے : کہیں خود ہی تو رکھا تھا پار سال ۔ انہی دنوں ۔ جب کوچیوں کا قافلہ اترا تھا ۔ چشمے کنارے ۔

(کوچیوں کے رقص کی موسیقی ابھرتی ہے ۔ لہریں آتی ہیں اور لوٹ جاتی ہیں)

بڈھا : وہ ناچ رہے ہیں پشمینے سُنا تونے ۔

(طوفان اور اولے)

پشمینے : زمین کے دف پر برف کے زنگولے

بڈھا : (مضحکہ خیز) یا قربان! (ہوا کا شور ابھرتا ہے اور پھر مکمل خاموشی کی حالت) کیا بات تھی وہ کوچیوں کی؟ ہاں وہ شیر کی چربی کا مرہم (اپنے سر پر دھول مارتا ہے) کس قدر خراب ہو گیا ہے میرا حافظہ ۔ یہیں کہیں تو رکھی تھی وہ شیشی ۔ پار سال جب کوچی آئے تھے یہیں کہیں ۔

(خنجری پر یہیں کہیں کے ہم وزن بول تین بار ابھرتے ہیں پھر ایک خلا جاتا ہے جس میں لڑکی کے چہرے پر خوف دہراس اور عزم کے ملے جلے جذبات کا پتہ چلتا ہے ۔ اس کے اندر خنجری کی آواز پھر گونجتی ہے اور لڑکی بگولے کی طرح گھومتی ہوئی تلاش کا رقص شروع کرتی ہے ۔ برتن گرتے ہیں ۔ شیشیاں ٹوٹتی ہیں ۔ مٹکے پھوٹتے ہیں غرض کمرے کی ہر چیز تہ و بالا ہو جاتی ہے ۔ آخر کار پشمینے اسی طرح گردش کرتی ہوئی سم پر آ کر باپ کے سامنے رک جاتی ہے)

پشمینے : (محاسبہ) کدھر ہے وہ مرہم؟

بڈھا : (سوچتے ہوئے) یہی تو میں بھی سوچ رہا ہوں بیٹی ۔ بھرا ہوا تھا مرتبان سوغات سمجھ کر تھوڑا تھوڑا کر کے لے گئے لوگ ۔

بس اتنا سا رہ گیا تھا میں نے چھوٹی شیشی میں ڈال دیا اور پار سال جب کوچی آئے تھے اور چشمے کے کنارے جشنِ مہتاب منایا تھا انھوں نے ———

پشمینے : مہمان بے ہوش پڑا ہے اور یہاں قصے ہی ختم نہیں ہوتے۔ کہاں رکھی تھی آخر وہ شیشی؟

بڈھا : تم نے ڈھونڈ لیا اچھی طرح؟

پشمینے : کونہ کونہ۔

بڈھا : (طوطے کی طرح دہراتا ہے) کونہ کونہ (اپنے سر پہ دھول مارتا ہے اور یکدم چونک اٹھتا ہے) وہ کونہ بھی دیکھا تم نے چکی کے پاس۔

پشمینے : کچھ نہیں ہے وہاں۔

بڈھا : ہے وہیں۔ لیکن تم کو نظر نہیں آئے گا (شرارت آمیز بچوں کی سی ناٹکانہ ہنسی) جادو کا کھیل ہے بس۔

پشمینے : مہمان مر رہا ہے اور تمہیں مسخرہ پن سوجھ رہا ہے۔ مجنون ہو تم! (بجلی کڑکتی ہے)

بڈھا : (موقع کی نزاکت کا احساس! یکایک سنجیدہ ہو جاتا ہے) مہمان۔ (نظریں نوجوان پر ٹھہر جاتی ہیں) مجنون! شیر کی چربی کا مرہم! (ڈکٹیٹرانہ انداز میں لڑکی سے مخاطب ہوتا ہے) اُس پتھر کے نیچے دیکھا تم نے لڑکی یا کھڑی باتیں ہی بناتی رہو گی (لڑکی کرنے کی طرف لپکتی ہے جس کے پاس ایک پتھر پڑا ہوا ہے) مہمانوں کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے تمہارے زمانے میں۔ ٹھنڈک لگ گئی ہے اس غریب کو۔ علاج ہونا چاہیئے اس کا۔ چاہے ہمیں اس کی خاطر اپنے دل کی چربی کیوں نہ اتارنی پڑے۔

(لڑکی پتھر اٹھا کر ایک طرف پھینکتی ہے اور گڑھے سے شیشی نکال کر اُسے چند سیکنڈ یوں دیکھتی ہے جیسے جوہری کسی نایاب ہیرے کو دیکھتا ہے۔ ڈھکنے کو کھولنے کی کوشش کرتی ہے۔ بڈھے کے چہرے پر کامرانہ تبسم نمودار ہوتا ہے)

کیوں ملا ہے کہ نہیں (بچپن) دیکھا کتنی حفاظت سے رکھتا ہوں میں چیزوں کو۔ سو روپے تولہ بھی نہیں ملے گی شیر کی چربی۔ صرف ایک شیر تھا ان پہاڑوں میں۔ اور اس کو مارنے والا ایک مرد پیدا کیا تھا کیسراں کی ماؤں نے تیرے باپ کے باپ ———

پشمینے : (بات کاٹتی ہے) یادوں کا قبرستان بنا رکھا ہے زندگی کو۔ مُردوں کی حکومت ہے اس گھر پر! یہ بھالا تیرے دادا کا ہے وہ ڈھال تیرے نانا کی ہے۔ تیرے پردادا نے اس بندوق سے شیر مارا تھا۔ تیرے بھائی کا رباب ہے یہ۔ پہاڑوں سے پریاں اُتر آتی تھیں اس کی آواز سن کر۔ نونگوں کا یہ ہار تیری ماں کا ہے اُس کے بدن کی خوشبو آتی ہے اس سے۔ مُردے! سب مُردے!!! موت کے پر پھڑ پھڑا رہے ہیں اس گھر پہ۔ کوئی آتا ہے۔ نہ جاتا ہے۔ راستہ کاٹ کر نکل جاتے ہیں کہ یہاں ایک دیوانہ بڈھا اپنے مرے ہوئے بیٹے اور اس کے مبینہ قاتلوں کا انتظار کر رہا۔ اور ایک نوجوان بوڑھیا اپنی موت کی راہ دیکھ رہی ہے۔ جب وہ چشمے پر پانی بھرنے جاتی ہے تو عورتیں انگلیاں اٹھاتی ہیں۔ اور کہتی ہیں کہ یہ اس دیوانے کی بیٹی ہے۔ دیوانی! (اپنے آپ سے) ہو نہیں تو ہو جاؤں گی۔ چند دن کی بات ہے بس جو اس سے پہلے مر نہ گئی مر نہ گئی اُس سے پہلے (ڈھکنا کھل جاتا ہے۔ اور ذو معنی انداز میں جیسے اپنے آپ سے سوال کرتی ہے) درد دُور ہو جائے گا

اس سے ؛

(لمبا سانس جیسے فیصلہ نہیں کر سکی۔ جواب نہیں ملا اپنے سوال کا۔ انگلی سے مرہم نکالتی ہے اور آگ پر گرم کر کے نوجوان کے سینے پر مالش کرتی ہے۔ باہر طوفان اور تیز ہو جاتا ہے۔ روشندان سے بجلی چمکتی ہے۔ ہوا تیز ہو جاتی ہے اور لالٹین کی بتی کپکپا کر بجھ جاتی ہے۔ کمرا تاریک ہو جاتا ہے۔ صرف تنغرے میں ہلکی ہلکی چنگاریاں نظر آتی ہیں۔ طوفان ختم ہو جاتا ہے اور چند سیکنڈ کی مکمل خاموشی کے بعد تاریکی میں ایک ہاتھ تنغرے سے ایک سلگتی ہوئی لکڑی اٹھاتا ہے اور تاریکی میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے لکڑی کا سلگتا ہوا سرا آپ سے آپ فضا میں کہیں جا رہا ہے یہ مشعل نوجوان کے چہرے کے قریب آکر رک جاتی ہے جو یکایک روشنی کی ایک شعاع سے نہایا ہوا نظر آتا ہے۔ روشنی کی اس بازگشت میں بڈھے اور لڑکی کا چہرہ بھی دکھائی دیتا ہے لڑکی مالش کرتے کرتے چارپائی کی پٹی پر سر رکھے سو رہی ہے۔ بڈھے کے چہرے پر روشنی کپکپا رہی ہے جیسے پتے ہوا سے ہل رہے ہوں۔ کھنچی ہوئی آنکھیں خواب کی آئینہ دار ہیں۔ لہجے میں زیر و بم کی آویزش ہے)

بڈھا : ہے تو وہی۔

آواز : (بے رحم) ناک ایسی ہی خمدار تھی اُس کی۔

بڈھا : لیکن پیشانی —

آواز : مگر ہونٹ؛ خم کہاں ہے ان ہونٹوں کا

بڈھا : ہاں! سنہرے گھنگھریالے۔ وہی تو ہے۔ میرا بیٹا! نذر گل۔

آواز : (زہرخند) انجیر کا پھول دیکھا ہے۔ کبھی انجیر کا پھول؟ (ایک ایک لفظ الگ الگ) تیرے بیٹے کی ٹھوڑی پر تو خال تھا دیوانے۔ تیری نجلئے۔ اپنی ماں کی ٹھوڑی کا خال!

(کہیں دور بجلی گرتی ہے۔ بڈھے کا چہرہ پھر تاریک ہو جاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اُس کی مشعل بھی بجھ جاتی ہے۔ اندھیرے میں پھر طوفان کا شور ابھرتا ہے اور ایکدم ڈوب جاتا ہے روشندان میں طلوع سحر کا اُجالا نمودار ہوتا ہے اور کمرہ روشن ہو جاتا ہے۔ دروازے کی جھریوں سے دھندلی روشنی کی شعاعیں فرش پہ کھلے ہاتھ کی انگلیوں کی طرح پھیلی محسوس ہوتی ہیں۔ روشنی میں جس کا بڑا منبع اس وقت روشن دان سے ایک دھندلا سا آبشار منظر گل پہ گرتا ہے پشمینے سامعین کی طرف منہ کئے پٹی پر سر رکھے سو رہی ہے اس کا ہاتھ نوجوان کے سینے پر ہے جیسے مالش کرتے کرتے اونگھ گئی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر تبسم ناچ رہا ہے۔ جیسے کوئی سہانا خواب دیکھ رہی ہے۔ یکایک اس کی آنکھ کھلتی ہے۔ وہ اپنا ہاتھ کھینچ لیتی ہے۔ تبسم غائب ہو جاتا ہے

انگڑائی لیتے ہوئے اٹھتی ہے۔ نوجوان بھی جاگ جاتا ہے۔ باہر سے ڈیل کے نغمے کی آواز آتی ہے)

(نغمہ)

(گلنے کی آواز دور چلی جاتی ہے)

منظر گل : کوچی!

پشمینے : (جو دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے) لکڑیاں چُن رہا ہے۔ ایندھن بسوڑھا۔

منظر گل : برف کا مارا مسافر۔

پشمینے : چلا جائے گا کہیں۔ کل کا سورج نکلنے سے پہلے۔ بجھی ہوئی آگ ٹوٹی ہوئی طنابیں چھوڑ کر۔ بہت رکا تو ایک سحر اور اس کے بعد پھر وہی چناروں کی سینہ کوبی) اور کنواری چوٹیوں کے بین (بڈھے کے خراٹے ابھرتے ہیں۔ پشمینے ادھر دیکھتی ہے اور قدرے توقف کے بعد لیکن اسی سانس میں) افیون کے خواب۔ برزخ کے سائے (رباب سے نظریں ہٹاتی ہے اور مافعانی لہجے میں نوجوان سے مخاطب ہوتی ہے۔ درد کا کیا حال ہے تمہارے؟

منظر گل : (پشمینے کے چہرے کو دیکھنے میں محو ہے) درد!

پشمینے : ٹھنڈ لگی ہے۔ پوری بات بھی نہ بتا سکے کہ کیا ہوا۔ لڑکھڑانے گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

منظر گل : بس موسم کا بے حد ممنون۔ احسانمند۔

(روشندان سے گرنے والا روشنی کا آبشار کچھ اس طرح سرکتا ہے کہ ان کے چہروں پر نقاب سا تن جاتا ہے)

پشمینے : (جیسے سمجھ نہیں سکی) ہونہہ!

منظر گل : ایسا ہی موسم تھا۔ شاید جب کائنات وجود میں آئی تھی سبے خبری کی ایسی ہی ساعت تھی جس سے خیر کے چشمے پھوٹے تھے بے ہوشی کے ایسے ہی لمحوں میں —

پشمینے : (طنز۔ بات کاٹتی ہے) تم شعر بھی کہتے ہو مہمان۔

منظر گل : کیرمان، پارہ چنار اور سکوزان کی دوشیزاؤں کے تمام گلے اور ان گائے نغمے اس رباعی کے سامنے جو اس وقت میری نظروں کے سامنے ہے۔ گونگوں کی بولی ہیں۔

پشمینے : ایسی باتوں سے میرے کان ناآشنا ہیں مہمان مجھے نہیں معلوم کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔

منظر گل : خوش نصیب ہیں وہ ہونٹ جو شیلے میں پہلا سُر پھونکتے ہیں۔

پشمینے : (مضطرب) مہمان!

منظر گل : اچھوتی بانسری میں گیت جگانے والا سانس۔

پشمینے : (بات کاٹتے ہوئے) مجھے خوف محسوس ہوتا ہے۔ مہمان کہ یہ سوئے ہوئے سُر اگر جاگ گئے، دبے ہوئے شعلے اگر بھڑک اٹھے تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔

منظر گل : اُجالا۔

پشیمنیے : نہیں نہیں، تم بتا نہیں سکتے۔ تم نہیں جان سکتے۔ مت چھیڑو ان تاروں کو۔ اس آگ کو مت کریدو ورنہ۔

منظر گل : ورنہ ؟

پشیمنیے : چناروں کو آگ لگ جائے گی۔ اجنبی چیزوں کی لو بیں چراغوں کی طرح بھڑک اٹھیں گی۔ کوہ سفید کی کنواری برفیں پگھل جائیں گی۔ اور ہم تم، یہ سب کچھ سب غرق ہو جائے گا۔ یا پھر اس جاگی ہوئی بھڑکتے ہوئے اندھیرے کے خلا کو پر کرنے کے لیے وہ جھکڑ چلے گا، وہ بگولا بلند ہو گا کہ اس چھت ان کواڑوں کو اڑا کر لے جائے گا۔ اور خالی در اندھی آنکھوں کی طرح دیدے پھاڑے گھورتے باقی رہ جائیں گے۔

منظر گل : (دفعۃً مایوس) اچھا تو میں جاتا ہوں (اٹھنے کی کوشش کرتا ہے) کاش میں یہاں نہ آیا ہوتا۔ رات کے طوفان نے مجھے اندھا کر دیا ہوتا کہ میں تمہارے دروازے کی پر اسرار روشنی دیکھ کر ادھر نہ چلا آتا۔ بلکہ کسی کھڈ میں کسی چشمے کی گہرائیوں، کرم کی آغوش میں جا گرتا (ٹھنڈا سانس) مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ تمہارے اندھیرے میں برف کا تودہ چمک رہا ہے۔ ٹھنڈی آگ کی پرچھائیاں ناچ رہی ہیں۔ سرد مہری کی سنائیں! کاش اس درد نے جو میرے سینے میں اٹھا تھا، مجھے یہاں آنے کی مہلت ہی نہ دی ہوتی اور میں کہیں اوبوں کی قبر میں اطمینان کی نیند سو جاتا۔ اور لوگ کہتے کہ یہ جوانا مرگ ———

پشیمنیے : بس بس۔ چپ ہو جاؤ خدا کے لیے۔

منظر گل : (جملہ مکمل کرتے ہوئے) ٹھنڈ سے مر گیا جوانا مرگ۔ آگ کی خیرات نہ ملی اس کو۔ اندھیرے کی چنگاری بھی نہ ڈالی کسی نے اس کے کشکول میں مہمان نواز پٹھانوں کے گھر سے۔

پشیمنیے : چپ ہو جاؤ۔ خدا کے لیے میں کہتی ہوں (روشنی کی چادر سرکتی ہے۔ بڈھے کے خراٹے خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ کروٹ لیتا ہے۔ نوجوان روشنی کے آبشار کے پیچھے چھپ جاتا ہے)

بڈھا : گلبلئے!

پشیمنیے : چناروں کے نیچے سو رہی ہے گلبلئے۔

بڈھا : (جیسے جھٹکا سا لگتا ہے۔ اُچک کر بیٹھ جاتا ہے) اوہ۔ پشیمنیے! کیا کروں پچیس برس اس کا میرا ساتھ رہا۔

پشیمنیے : اتنی ہی مدت۔ تھوڑی کم اس کو گذرے بھی بیت چکی ہے۔

بڈھا : (ان سنی) صبح اٹھتے ہی پکارتا تھا اس کو (نقل) شیرینہ چائے گلبلئے! (واقعاتی لہجہ) چادر بن گئی بیٹی؟ (ادھر ادھر دیکھتا ہے نظریں روشندان پر جاتی ہیں) ارے سورج روشن دان میں آگیا اور تو نے ابھی آگ بھی نہیں جلائی۔ کیا ہو گیا ہے سب کو۔ (مایوسی) دروازہ بھی نہیں کھولا اب تک (اندیشہ) لوٹ نہ گیا ہو وہ کہیں دروازہ بند پا کر۔

پشیمنیے : (دروازے کی طرف بڑھتی ہے) پھر وہی خواب۔ جانے کب ٹوٹے گا ان کا طلسم۔ کونسا دن آئے گا، کونسا سورج نکلے گا۔ (دروازہ کھولتی ہے۔ گلابی روشنی کا بند ٹوٹ پڑتا ہے۔ دہلیز کے باہر اولوں کا ڈھیر لگا ہے۔ منظر اب تک کھڑا ہے۔ وہی پہاڑ چناروں کی قوس وغیرہ ہلکی بنفشی روشنی میں بنایا ہوا)

بڈھا : (اولوں کے ڈھیر کی طرف اشارہ کرتا ہے) سنگِ سرخ کی یہ قبر کس کی ہے پشمینے، میرے دروازے کے سامنے۔

پشمینے : ہوگا کسی کی حسرتوں کا مزار۔

منظر گل : تربت کسی شہید کی۔

بڈھا : (چونک کر دروازے سے نظر ہٹاتا ہے) یہ کس کی آواز تھی پشمینے، کون بولا تھا یہ؟

منظر گل : مہمان

بڈھا : ہونہہ؟

پشمینے : طوفان سے پناہ لی تھی جس نے رات

(روشن دان سے آتی ہوئی روشنی اب براہ راست نوجوان پر پڑتی ہے)

منظر گل : جو اولوں سے بچ کر انگارے چننے بیٹھ گیا۔ اب جا رہا ہے الغوزے کی راکھ سینے پر لے۔

بڈھا : (بات سے بات یاد آتی ہے) اکسیر ہوتی ہے اکسیر۔ یہ جوگی سنیاسی اسی لیے تو محفوظ رہتے ہیں سردی سے کڑکتے جاڑے۔ سُن کر دینے والی ہواؤں سے! اور یہ جٹا دھاری راکھ کی بس ایک تہہ سے تن ڈھانپے بیٹھے ہیں۔ آنکھیں بند کئے۔ تمہاری طبیعت اب کیسی ہے مہمان؟

منظر گل : (بے دلی) اچھا ہوں۔ مہربانی۔ اور چلتا ہوں اب (سینے پر ہاتھ رکھتا ہے)

بڈھا : نہیں نہیں۔ درد ہے ابھی۔

منظر گل : (زہر خند) کوئی بات نہیں۔ اچھا تو (اٹھنے کی کوشش کرتا ہے)

بڈھا : نہیں، نہیں، نہیں! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میں بڈھا ہوں۔ غریب ہوں لیکن پٹھان ہوں۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تمہیں بیماری کی حالت میں گھر سے نکال دوں۔ جبکہ درد ابھی موجود ہے۔

منظر گل : یہ تو اب عمر بھر کا ساتھی ہے بابا۔ کہتے ہیں ایک بار ورم آجائے پھیپھڑے کی جھلی پر تو مکمل آرام کبھی نہیں آتا۔ ایک پھانس سی ضرور رہتی ہے۔ کہیں نہ کہیں۔ عادی ہو جاؤں گا میں بھی (لمبا سانس) چلوں اب۔

بڈھا : بٹہ لگا کے میرے نام پر کہ بڈھے نے بیمار مہمان کو گھر سے نکال دیا تو ڈھیر نہ کر دوں گا۔ نہیں نہیں، اولوں کے اس انبار میں اس الغوزے کے نیچے نہ گاڑ دوں گا — میری بندوق پشمینے! (چند ساعت لڑکی کو غور سے دیکھتا ہے) لیکن تم چناری شاخ کی طرح ہمارے سر پہ کیوں لہرا رہی ہو۔ سانس تھم گیا بڈھے باپ کا اور ابھی تک قہوہ بھی دم نہیں ہوا۔ ماں تیری تو پیالی ہتھیلی پہ لیے پائنتی بیٹھی نظر آیا کرتی تھی صبح جب آنکھ کھلتی تھی میری۔ اور تجھے مہمان کا بھی دھیان نہیں ہے۔ بیمار ہے بے چارہ۔ جلدی کر آگ جلا قہوہ بنا۔ اور دیکھ شہد تو ہوگا اُس چھتے کا جو تو نے اخروٹ کے پیڑ سے توڑا تھا۔ اُس رات اور ہاں اخروٹ اور بادام، کشمش تھوڑی اور کیا ہوگا۔ کیا کچھ مل سکے گا اور؟

پشمینے : جو کی روٹی۔

بڈھا : اور؟

پشمینے : نمک ۔۔

منظر گل : (پشمینے کی طرف دیکھتا ہے) جب میں بچہ تھا ابھی تو نمک کی ڈلی جیب میں ڈالے پھرا کرتا تھا۔ بچھڑا ہے بچھڑا۔ یہ تو گھر کے لوگ کہا کرتے جب دیکھو نمک چاٹ رہا ہے۔ (ہنستا ہے پشمینے کے چہرے پر نظریں گاڑے ہوئے) نمک! (قدرے توقف ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہے) نمک!

بڈھا : نمک۔۔ اور کیا مل سکے گا پشمینے۔

پشمینے : انجیر۔۔

بڈھا : انجیر۔ (یاد۔ لمبا سانس) انجیر۔۔ انذر گل۔۔

پشمینے : (دو اتفاقی) دیکھا نہیں کسی نے آج تک۔

منظر گل : ہما کی طرح۔

بڈھا : ان پہاڑوں پر ہوتا ہے کہیں۔

(باہر دیکھتا ہے)

منظر گل : سنا ہے بس۔ دیکھا نہیں کسی نے۔

پشمینے : قصے۔ سب قصے!

منظر گل : فرضی افسانے۔

پشمینے : بچوں اور بوڑھوں کو بہلانے کے لیے لمبی راتوں کا سامان

(پُرسوز نسوانی آواز میں ذیل کا نغمہ ابھرتا ہے۔ لڑکی آہ بھرتی ہے۔ منظر گل کی نگاہیں اُسے حسرت سے دیکھتی ہیں۔ بڈھے کے چہرے پر ایک سایہ سا تیرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وقفہ۔ نغمہ ذرا ڈوب جاتا ہے)

بڈھا : (جب میں نغمہ کبھی ڈوبتا ہے کبھی ابھرتا ہے) پانی بھرنے جا رہی ہیں کیرو ان کی بیٹیاں۔ اسی چشمے پر ملی تھی مجھے تخلیے جب وہ منگلے کی سنگت میں گاتی تھی تو چشمے کے شفاف پانی کی سطح پر بلبلے ناچنے لگتے تھے اور مرغ زریں پہاڑوں سے اترا آتا تھا ـــــ مجھے باہر دھوپ میں بٹھا دے بیٹی۔ سانپ صبح کی دھوپ سو بیماریوں کا ایک علاج ہوتی ہے

پشمینے : اور بڑھاپا سو بیماریوں کی ایک بیماری۔

بڈھا : (دلاز ہو جاتا ہے) میری لاٹھی پشمینے۔ لاٹھی کدھر ہے میری (ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ بندوق پر نظر پڑتی ہے) وہ رہی (بندوق اٹھا کر لاٹھی کی طرح ٹیکتا ہوا آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ دروازے میں پہنچ کر مڑتا ہے۔ روشنی میں اس کا سایہ اندر تک پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ بڈھا چونک پڑتا ہے) یہ کون ہے پشمینے؟ بندوق لیے کون کھڑا ہے دروازے میں۔

منظر گل : (گھبرا کر ـــ مدد کے لیے لپکتا ہے) کہاں؟ کدھر؟

بڈھا : (اپنے سائے کی طرف اشارہ کرتا ہے) وہ ۔ یہ!

پشمینے : بڑھاپے کا سورج۔ ماضی کے سائے۔

(نوجوان بوکھلا جاتا ہے اور سینے پر ہاتھ رکھے اپنی چارپائی پر لوٹ آتا ہے)

بڈھا : صبح کے وقت شام کے سائے پشمینے۔

پشمینے : جانے وہ دن کب آئے گا جس دن کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ جس دن بچپن کو جوانی، جوانی کو بڑھاپے اور بڑھاپے کو موت کا۔ کسی کو کوئی سایہ نظر نہیں آئے گا (بڈھے کو بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے) آؤ دھوپ میں بٹھا آؤں تمہیں ——

(بڈھے کو باہر بٹھا کر ابھی کمرے میں داخل ہی ہوتی ہے کہ آواز آتی ہے)

بڈھا : پشمینے۔ (لڑکی وہیں رک جاتی ہے جیسے ایک دم بت بن گئی ہو) نسوار کی ڈبیہ پشمینے! (بڈھے کی چارپائی سے ڈبیہ اٹھا کر باہر جاتی ہے اور واپسی پر ابھی دہلیز سے دو ہی قدم اندر آئی ہوتی ہے) پشمینے! چلم بھی چلم (حقہ اور تمباکو کی تھیلی وغیرہ لے کر باہر جاتی ہے پہلے کی طرح ابھی انغرے کے پاس ہی پہنچ پاتی ہے۔ بڈھا چیختا ہے) پشمینے! (لڑکی پھر بت بن جاتی ہے) چادر پشمینے چادر۔ شنہ چادر۔ شنہ چادر۔ شنہ چادر

(آواز دب جاتی ہے جیسے کوئی بچہ بلکتا بلکتا چپ ہو جائے۔ پشمینے انغرے میں رات کی بجھی ہوئی لکڑیاں چنتی ہے۔ راکھ میں چنگاریاں تلاش کرتی ہے اور جھک کر پھونکیں مارنا شروع کرتی ہے۔ نوجوان بھی چارپائی سے اتر کر دو زانو بیٹھ جاتا ہے اور آگ جلانے کے لیے پھونکیں مارتا ہے)

پشمینے : جانے دو جی۔ بالوں میں راکھ پڑ جائے گی تمہارے (نوجوان ان سنی کر دیتا ہے) لکڑی گیلی ہے اور تم بیمار ہو، کمزور ہو۔ ٹھنڈ لگ چکی ہے تمہیں۔ دور رہو۔

منظر گل : (بات کاٹتا ہے) انغرے کی چنگاریاں میرے درد کو چن لیں گی پشمینے۔

(پھر پھونک مارتا ہے۔ لکڑیوں سے دھواں اٹھتا ہے۔ سر بلند کرتے ہوئے آنکھیں ملتا اور مسکراتا ہے)

پشمینے : بہت کڑوا ہوتا ہے گیلی لکڑی کا دھواں۔

منظر گل : دھواں اٹھے گا تو شعلہ بھی بھڑکے گا۔ (پھر پھونکتا ہے۔ آگ بھڑک اٹھتی ہے) بھڑکے نہیں تو چنار، چنار نہ ہوگا۔

پشمینے : چناروں کی آگ سخت خوفناک ہوتی ہے۔

منظر گل : کیا تمہارے قبیلے میں یہی دستور ہے کہ مہمان کو بات بات پر اجنبیت کا احساس دلایا جائے۔

پشمینے : میں معافی چاہتی ہوں مہمان۔

منظر گل : میں نے بزرگوں سے سنا ہے کہ میزبان وہی اچھا ہے جو مہمان کو اس بات کا احساس نہ ہونے دے کہ میں کسی غیر کے گھر میں ہوں اور اس کو دوسرے کے گھر کو اپنا سمجھنے پر مجبور کر دے۔

پشمینے : لیکن جس گھر پر ایک بڈھے اور اس کے مردوں کا قبضہ ہو اس کو کوئی کیسے مہمان کے سپرد کر سکتا ہے۔

منظر گل : تو مہمان اپنا گھر تمہارے سپرد کرتا ہے۔ اس کا سب کچھ — اس کے صحن میں سیب کا درخت۔ انگور کی بیل اور اس میں سنہری شہد کے چھتے گھر کے باہر سیاہ گلاب کے تختے جن پر نیلی پروں والی تتلیاں ناچتی ہیں۔

پشمینے : اور کیا مہمان؟

منظر گل : تمہارے بالوں جیسی سنہری کلی اور آنکھوں سی شربتی گندم کی بالیوں کے کھیت۔

پشمینے : اور کچھ؟

منظر گل : اور — اور کھونٹے سے بندھی سفید گائے جس کو چھونے سے میٹھے دودھ کی دھاریں بہہ نکلتی ہیں۔

پشمینے : اور؟

منظر گل : بالوں سے نرم جھاگ سے ملائم اون کے بڑوں کا ریوڑ۔

پشمینے : کچھ اور — ؟

منظر گل : اور اس کا انغوزے جو منوں لکڑیاں پھنکنے کے باوجود سرد پڑا ہے اور جس کے نرم اور روشن کرنے کے لیے کسی کے ہاتھوں کا انتظار ہے (باہر سے بڈھے کی آواز آتی ہے)

بڈھا : پشمینے؟

پشمینے : (پشمینے کے ہاتھ سے پانی کی کیتلی جسے وہ آگ پر رکھنا چاہتی ہے۔ چھوٹ جاتی ہے اور آگ سے دھواں اٹھتا ہے۔ لڑکی اپنا ہاتھ بڑھاتی ہے) یہ ہاتھ جو کٹ پتلی کے ہاتھوں کی طرح غیر مرئی دھاگوں سے بندھے ہوئے ہیں۔

منظر گل : گوڈر کا دھاگہ

بڈھا : (صرف آواز) آج قہوہ نہیں ملے گا پشمینے؟ (دروازے میں نمودار ہوتا ہے) مگر تیرا کوئی قصور نہیں بیٹی جوانی بڑھاپے کو کب تک برداشت کر سکتی ہے آخر۔ ایک بڈھے کے بجائے، بچوں کی دیکھ بھال کی عمر ہوا کرتی ہے یہ جس سے تو گذر رہی ہے۔ کاش تیری ماں ہوتی۔ اس وقت تیرا بھائی جو میرے بڑھاپے کے بوجھ کو سنبھال لیتا۔ اور میں تیرے بوجھ سے سبکدوش ہو سکتا۔ تیرا بھائی۔ بھائی تیرا ——— آتا ہی ہوگا۔

(پنج کی طرف سے منہ موڑ کر آنکھوں کا سایہ کرتا ہے۔ جیسے راستہ دیکھ رہا ہے — اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا دیوار کی طرف بڑھتا ہے اور آنکھ سے اوجھل ہو جاتا ہے)

منظر گل : (رحم) بہت بڈھا ہو گیا ہے اب تمہارا باپ۔ اب اسے —

پشمینے : (بات کاٹتی ہے) مر جانا چاہئے یہی کہنا چاہتے ہو تم؟

منظر گل : (گھبراہٹ) نہیں نہیں۔ آرام کی ضرورت ہے اس کو۔

پشمینے : لحد کے سوا اسے اور کہیں آرام نہیں مل سکتا۔ زندہ ہی کب ہے یہ زندوں میں نہ مردوں میں۔ موت ہی زندگی کا پیغام لائے گی اس کے لیے۔ جہاں نہ گھلنے ہوگی نہ اندر گل۔ نہ پشمینے۔ بس موت کے سوا اور کوئی علاج نہیں اس کا مرا۔

منظر گل : (اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیتا ہے) نہیں! ایسی باتیں مت کرو پشمینے، تم نے ابھی زندگی کا دیکھا ہی کیا ہے۔

پشمینے : جو کچھ میں دیکھ چکی ہوں۔ جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں۔ خدا تمہارے بوڑھوں کو بھی نہ دکھائے۔

بڈھا : (جیسے انسانی اضطراب کے عالم میں ہاتھ لہراتے ہوئے۔ دروازے کے سامنے سے گزرتا ہے۔ قدم میر سے بیٹے کے ہمراہ —
(نوجوان اور پشمینے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ وقفہ۔ بڈھا پھر سامنے سے گزرتا ہے۔ پیشانی پر ہاتھ رکھے نشیب کی طرف بڑھتا ہے) آیا نہیں ابھی۔

پشمینے : خواب۔ آرزوؤں کے کھنڈروں کا خواب۔ بھلا ہو کہ کچھ تو تھا۔

منظر گل : تعمیر کی بات کرو پشمینے۔ نئی شاخ۔ نیا نشیمن۔ (پشمینے حیرت سے اس کی طرف دیکھتی ہے۔ موسیقی کا ایک ریلا) سے افق! (یا ہر روشنی رنگ بدلتی ہے۔ جیسے آتش بازی چھوٹ رہی ہو۔ دونوں اس طرف دیکھتے ہیں۔)

پشمینے : (جیسے خواب سے بیدار ہوتی ہے) سورج کہاں آ گیا اور کتنے کام پڑے ہیں ابھی۔ جائیے کیا سوچنے لگے تم۔
(باقی سب روشنیاں بجھ جاتی ہیں۔ وقت کی روشنی بھی پراسرار اندھیرے میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ سپاٹ لائٹ پشمینے پر پڑتی ہے۔ جوان کا صرف خاکہ سا نظر آتا ہے۔ پشمینے اس کے گرد گھر کے کام کاج کا رقص شروع کرتی ہے۔ چشمے سے پانی بھرنے، مٹکی اٹھانے، لکڑیاں چننے، آٹا پیسنے، آگ جلانے اور روٹیاں پکانے کے انداز۔ سب کے سب رقص سے ادا کیے جاتے ہیں۔ آخری گردش میں وہ انگارے کے پاس جیسے تھک کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس کی آنکھوں میں خواب کی سی کیفیت ہے۔ روشنی تیز ہو جاتی ہے اور بڈھا چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا ہے)

منظر گل : تھک گئیں، بہت تکلیف دی ہے میں نے تمہیں۔

پشمینے : تکلیف! آنا ہی کون ہے ہمارے ہاں۔ مجھے کس بات کی تھکان ہو گی۔ جیسے کوئی سے (رک کر مشکراتے ہوئے) بھائی بہن سنبھالنا پڑتے ہیں چھوٹے چھوٹے۔ پہلے تو کیا تھا۔ کام سے کام۔ گھر بار کے کام کاج سے، عورت کبھی نہیں تھکتی (طنزیہ) عورت اب مجھے تو کام ہی کیا ہے۔ میں ہوں۔ میرا باپ ہے اور اس کے خواب ہیں تو کبھی کبھی جب کچھ نہ کرنے سے تھک جاتی ہوں تو سامنے پہاڑوں میں گھومنے نکل جاتی ہوں۔ اور ایک چوٹی سے دوسری چوٹی کی طرف بڑھتی ہوں لیکن وہ چوٹی جس پر میں پہنچنا چاہتی ہوں، قریب آ کر ہمیشہ دور چلی جاتی ہے اور جس طرح خواب میں ہر چیز دھند کی بنی ہوتی ہے۔ بخارات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کوئی چیز ہاتھ نہیں آتی حسرت کے سوا۔ بس بادلوں میں چہرہ چھپا کر رہ جاتا ہے۔ اس وقت جی میں آتا ہے کہ پہاڑ سے کود کر اپنی اذیت کو ختم کر دوں۔ لیکن ہمت نہیں پڑتی۔

منظر گل : اب کے جب تم اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے پہاڑ کی چوٹی سے کودنا چاہو گی تو کسی کے بازوؤں کو اپنا منتظر پاؤ گی۔

پشمینے : اپنے بازوؤں کے سوا میرا بدن کسی جسم سے آشنا نہیں مہمان۔ مجھے ڈر ہے وہ بھی اس وقت اپنے بازوؤں کو آگے سے ہٹا لے گا اور پھر مجھے جہنم تک میں پناہ نہیں ملے گی۔

منظر گل : تمہیں میری بات کا اعتبار نہیں آ رہا پشمینے — !!

پشمینے : اتنی عمر مردوں کی محفل میں گذارنے کے باعث زندوں سے میرا ایمان اٹھ گیا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سب مردہ ہیں۔ مردوں کے سایوں نے آ دبوچا ہے یہ وادی۔ اس کی پُراسرار غاروں میں تربور رہتے ہیں کمانیں تانے چلے چڑھائے، خنجر بکف، بندوقیں بغل میں دبائے، آنکھ نیچے شست باندھے۔ لبلبی پر انگلی رکھے پتھروں کے نیچے پیچھے انتظار کر رہے ہیں کہ کب کوئی گذرے اور کب انتقام نہیں (بنتی ہے) مرے مردوں کا شکار کھیل رہے ہیں

منظر گل : یہ دنیا اتنی بڑی نہیں ہے پشمینے۔

پشمینے : شاید ایسا ہی ہو۔

منظر گل : تم نے دیکھا ہی کیا ہے اس چار دیواری، ان پہاڑوں کے سوا۔ باہر نکلو اور دیکھو کہ دنیا کتنی حسین ہے۔ وہاں لوگ ہنستے ہیں۔ گاتے ہیں ناچتے ہیں عورتیں سنگھار کرتی ہیں اور بچے کھیلتے ہیں۔

پشمینے : (خیالات میں گم۔ چونک پڑتی ہے) کیا کہا؟

منظر گل : بچے کھیلتے ہیں اور کودتے ہیں۔ مائیں خوش ہوتی ہیں۔

پشمینے : مضطرب اپنی لمبی چٹیا کو انگلی کے گرد بل دے رہی ہے۔ دفعتاً لمبا سانس لیتی ہے اور سینہ پر فیصلہ ساتی ہے) میں تمہارے ساتھ چلوں گی مہمان۔

منظر گل : (جیسے اعتبار نہیں آ رہا۔ گھٹنوں کے بل پشمینے کے سامنے بیٹھ جاتا ہے) پشمینے

پشمینے : (نیچے تلے معنی خیز وقفوں کے بعد) ہاں۔ ہاں۔ ہاں !!!

منظر گل : مجھے اپنی خوش قسمتی پر ناز ہے پشمینے۔

پشمینے : (احتیاط) آہستہ بولو۔ وہ سن رہے ہوں گے ۔۔۔۔

منظر گل : کون پشمینے؟

پشمینے : وہ جن کا اس گھر پر قبضہ ہے۔ بہت باپ کا۔ دادا اس کا۔ جملے میری ماں۔ اور جانی میرا اندر گل۔ مُردے اور وہ (باپ کی طرف اشارہ کرتی ہے)

منظر گل : سو رہا ہے غریب۔ افیون کے لحافوں میں لپٹا سو رہا ہے۔

پشمینے : سوتے میں جاگتا ہے اور جاگتے میں سوتا ہے۔ ایک پل ادھر سے اُدھر نہیں ہونے دیتا مجھ کو۔ کہاں گئی پشمینے۔ کدھر ہو پشمینے؟ کہاں چلیں پشمینے؟ — اب جا رہی ہے پشمینے۔ کل ہوا سے باتیں کرے گا۔ جب پشمینے کو نہیں پائے گا تو جتنا ہوں۔ (رُک جاتی ہے)

منظر گل : کیا پشمینے؟

پشمینے : (عزم) نہیں۔ کچھ نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ اب نہیں رُک سکتی پشمینے (بھیڑیوں کی آواز آتی ہے) یہ آوازیں سنیں تم نے؟

منظر گل : (غور سے سنتا ہے) گیدڑ ہوں گے!

پشمینے : نہیں بھیڑیے! پر ہم سے کیا۔ ایک عمر ہو گئی ان کو اس دروازے کے باہر بھونکتے ہوئے۔ تھوتھنیاں اٹھائے منہ کھولے۔ دانت نکالے اپنی لال لال آنکھوں سے اندھیرے میں دروازوں کی جھریوں سے گھورتے ہوئے ڈرتی ہوں ان سے آج تک نہیں ڈری۔

منظر گل : اور ڈر رو گی بھی آج میری موجودگی میں۔

پشمینے : ہاں یہی تو میں کہتی ہوں۔

منظر گل : (احسامند۔ جذباتی۔ باہیں پھیلائے اُسے اپنی آغوش میں بھینچ لینے کے لیے لپکتا ہے) پشمینے۔

پشمینے : (یہاں کچھ لگے الف کھڑی ہو جاتی ہے) نہیں ابھی نہیں۔ وہ دیکھ رہے ہوں گے مردے۔ (بھیڑیوں کی آوازیں اور قریب آجاتی ہیں، بہت قریب آگئے۔

منظر گل : پر ہم سے کیا؟

پشمینے : ہاں۔ ہم سے کیا۔ میں ڈرتی ہوں ان سے۔ یہ تعویذ نہیں دیکھے تم نے (چادر کھول کر تعویذ دکھاتی ہے) یا رب اچھا تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر لائی تھی میری ماں کہ ڈسے نہیں لاڈلی۔ (ہار میں سے ایک ہار علیحدہ کر کے دکھاتی ہے) یہ نہیں دیکھے تم نے — ناخن۔ شیر کے ناخن۔

منظر گل : (دلچسپی اور حیرت) شیر کے ناخن!

پشمینے : (تلخی) تعویذ! (حقارت) میرے بزرگوں کی بہادری کے تمغے۔

منظر گل : ہونہہ!

پشمینے : شکار کھیلا تھا میرے باپ کے دادا نے۔ اب تک کھیل رہا ہے۔

منظر گل : (بوکھلاہٹ) زندہ ہے اب تک؟

پشمینے : یہیں کہیں گھوم رہا ہو گا (معنی خیز وقفہ) اس کا سایہ۔ یا اونگھ گیا ہو گا شاید (باپ کی طرف دیکھتی ہے) ناخن اسی کے مارے ہوئے شکار کے۔ پوتی کے سینے میں گڑے ہوئے ہیں۔ ہر وقت گلے پہ رہتا ہے۔ پنجہ شیر کے تدبیر — یہ! (شیر کے ناخنوں کا ہار توڑ کر اچھالتی ہے) یہ رہے (آگ میں پھینکتے ہوئے) ناخن شیر کے (بڈھے کے خراٹے بند ہو جانے میں وقفہ)

منظر گل : (بوکھلاہٹ میں ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے) میرے خاندان میں بھی مارا تھا شیر کسی نے۔

بڈھا : (خواب آلودہ آواز کروٹ لیتے ہوئے) کس نے مارا تھا شیر۔

منظر گل : میرے خاندان میں کسی نے۔

بڈھا : (بیٹھ جاتا ہے) یہ کون ہے پشمینے۔

پشمینے : مہمان!

بڈھا : (سر کو جھٹکا دیتا ہے۔ آنکھیں ملتا ہے) ہوں مہمان۔ سنو مہمان یہ بات پھر مت کہنا کسی سے۔ لوگ ہنسیں گے ورنہ کہ یہ کون آگیا نیا شکاری شہر کا۔ ہاں سمجھے۔

منظر گل : میں نے یہ تھوڑی کہا ہے کہ شیر کا شکار میں نے خود کیا ہے۔

بڈھا : تو۔ اور کیا کہہ رہے تھے تم؟

منظر گل : (وضاحت) میرے خاندان میں کسی نے، بزرگوں میں سے۔

بڈھا : قصے۔ قصے۔ سب قصے! بچوں کو بہلانے کے لیے قصے گھڑتے رہتے ہیں لوگ نا کہ۔ تاکہ بزدلی بھاگ جائے اُن کی سمجھے! ہاں۔ (حقہ اپنی طرف کھینچ کر دیا سلائی جلاتا ہے، اور چلم میں رکھ کے کش لگاتا ہے) ہوں!۔ بہادر ہو جائیں تاکہ بہادری کے قصے سُن سُن کر (دفعۃً۔ چھوٹا سا کش) لیکن اس کے باوجود کبھی کبھی کسی خاندان میں سچ مچ کا بہادر بھی پیدا ہو جاتا ہے کوئی۔ اور اس کا قصہ۔ اس کی بہادری کی کہانی، ساری قوم، سارے ملک، کل دنیا، سب آدمیوں کل کائنات کی کہانی بن جاتی ہے۔ نہیں سمجھے؟ (حقے کا ایک اور کش) لیکن بات کہاں سے چلی تھی اندر گل۔

پشمینے : اندر گل نہیں۔ مہمان ہے یہ!

بڈھا : اوہ! (لڑکی سے) کھانا کھایا مہمان نے؟ ہاں، ہیچ حال کیا ہے تمہارا مہمان؟

منظر گل : اچھا ہوں (پشمینے کی طرف دیکھتا ہے) بہت اچھا ہوں۔

بڈھا : (فخریہ) دیکھا اس مرہم کا اعجاز اور وہ شیر جس کی چربی سے یہ مرہم بنا تھا میرے دادا نے مارا تھا (چارپائی کے نیچے سے بندوق نکالتا ہے) اس بندوق سے۔ ہوں! سمجھے!! لیکن تم بھی تو کچھ کہہ رہے تھے کہ جانے کس نے شکار کیا تھا شیر کا!

منظر گل : میرے قبیلے میں کسی نے بزرگوں میں سے۔

بڈھا : خوب! لیکن کھول کر سن لو۔ اس وادی میں صرف ایک ہی شیر تھا جس کو مارنے والا صرف ایک آدمی پیدا ہوا تھا۔ میرا دادا۔ یعنی اس لڑکی کا پر دادا ——— ہے کوئی رشتہ ہمارے ساتھ تمہارے اُس شکاری کا؟ کس کے بیٹے ہو تم۔ کیا نام ہے تمہارے باپ کا۔

منظر گل : (بوکھلاہٹ) رحمن گل۔

بڈھا : اور اس کا باپ؟

منظر گل : رحیم گل

بڈھا : (جیسے کچھ یاد آ رہا ہے) رحیم گل۔ ہوں! اور اس کا باپ؟

منظر گل : نام یاد نہیں آ رہا اس وقت۔ ضرورت ہی نہیں۔ دراصل جاننے کی۔

بڈھا : (طعنہ) اور تم پختون ہو۔ پختون کہتے ہو تم خود کو۔

پشمینے : ایک ہم ہی تو رہ گئے۔ پختون کیہ وان میں۔ گل کو پوچھو کہ بابا آدم کون تھے۔

بڈھا : (سنجیدہ) پختون! (نوجوان ہنستا ہے)

پشمینے : اور پختون کی اولاد؟

بڈھا : وہ بھی پختون!

پشمینے : تو ؟
بڈھا : (غصہ، خفگی) تو چپ ہو جا لڑکی ! اس کے باپ کے دادا کا نام جاننا چاہتا ہوں میں۔
پشمینے : کس لیے ! کیوں ؟
بڈھا : معلوم ہو جائے گا یہ بھی۔ معلوم ہو جائے گا (نوجوان سے) رہتے کہاں ہو تم۔
منظر گل : اس وادی کے پہلو میں۔ جہاں سیب کے باغ ہیں۔
بڈھا : قبیلہ ؟
منظر گل : خم خیل۔
بڈھا : نام تمہارا۔
پشمینے : کے مرتبہ پوچھو گے ؟
بڈھا : (چیخ کر) تو چپ ہو جا لڑکی۔ (نوجوان سے) ہاں۔
منظر گل : (سہم کر) منظر گل۔
بڈھا : (ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے لیکن اپنے آپ سے) رحیم گل کے بیٹے۔ رحمن گل کا لڑکا منظر گل ! (اضافہ) پردادا کا نام کریم گل تھا تمہارے۔ اور تم نے ٹھیک کہا تھا کہ میرے خاندان میں بھی شیر مارا تھا کسی نے۔
پشمینے : اور تم جو کہتے تھے۔
بڈھا : (بات کاٹتا ہے) میں اب بھی وہی کہتا ہوں جو پہلے کہتا تھا۔ اور یہ بھی ٹھیک کہتا ہے۔ کریم گل میرے دادا حیم گل کا بھائی تھا۔
منظر گل : (خوشخبری۔ پشمینے کی طرف دیکھتے ہوئے) ہم ایک ہیں آخر ؟
بڈھا : ہاں۔ لیکن تربور۔ حاسد۔ دشمن۔ قاتل جس کے باپ نے میرے بیٹے کو اس بے ختم کر دیا کہ شیر کے شکار ہونے کا شکار کس (لڑکی سے) اب پتہ چلا۔ اب آیا سمجھ میں کہ میں اس کا شجرہ نسب کیوں جاننا چاہتا تھا۔
پشمینے : وہم ہے سب وہم۔ انہوں کی گودوں پلے خواب۔ انتقام کے قصوں سے بسی کے مجرد اور نا کام آرزوؤں کی خوابگاہ کے سائے۔ خواب سب کے سب ! افسانہ۔ پیاز کی طرح جس کے پرت اتارے گئے تو حقیقت یہ نکلی کہ اخیر کے پھول کی طرح تمہارے بیٹے اور میرے بھائی میں ہی اندر گل کا بھی کوئی وجود نہیں اندر گل کا۔
بڈھا : چپ ہو جا گستاخ لڑکی۔ خواب تھا اندر گل ؟ تیرا بھائی خواب تھا، خواب تھا وہ جوانا مرگ ؟
پشمینے : جس کا کوئی وجود نہیں تھا شاید۔ جو خیال کی گود میں پیدا ہوا۔ اور تصور کی گود میں قتل ہو گیا۔
بڈھا : لیکن اس کا انتقام حقیقت ہو گی۔

(دیوار سے وار کھڑا ہو جاتا ہے۔ قہقہہ لگاتے ہوئے بندوق اٹھاتا ہے)

پشمینے : (کود کر نوجوان اور بڈھے کے درمیان کھڑی ہو جاتی ہے) مہمان کو مارو گے اپنے گھر میں بیمار مہمان کو مارو گے۔ جو

تمہارے یہاں پناہ لینے آیا ہے۔ تم پختون ہو؟ اسی پختون وتے پر ناز ہے ہم تم کو۔ پختون ہو تم — !

بڈھا : (بدستور) پختون ہو تم؟ اسی پہ ناز ہے تم کو۔ (آوازیں انہی دو جملوں کو بار بار دہراتی ہیں۔ ان کی رفتار تیز ہوتی جاتی ہے۔ تیز اور بلند۔ بڈھا چیختی چیختی نگاہوں سے اپنے چاروں طرف دیکھتا ہے۔ آوازوں کا شور اتنا بلند ہو جاتا ہے کہ بڈھا کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر چیخ مارتا ہے۔ آوازیں خاموش ہو جاتی ہیں۔ بڈھا نوجوان کے قدموں میں گر پڑتا ہے۔ (وقفہ) نوجوان بڈھے کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتا ہے۔ وقفہ۔ جس میں بڈھا ٹکٹکی باندھے لڑکے کو دیکھتا ہے) تم آ گئے بیٹا۔ میں نے پہلے ہی کہا تھا تیری بہن سے کہ دروازہ کھلا رکھنا۔ آتا ہی ہو گا تیرا بھائی۔

شیمینے : (تردید) یہ بھائی نہیں ہے میرا۔ منظر گل ہے یہ۔

بڈھا : کیا نام بتایا تو نے بیٹی۔

شیمینے : منظر گل۔ مہمان ہمارا۔ تربور جن کی رگوں میں میرے دادا کے باپ کا لہو بہہ رہا ہے۔ در اس وادی میں چناروں کی چھاؤں تلے پہلا خیمہ گاڑنے والوں کی اولادوں کے جوان لہو کی ندیاں۔ پھر ایک دوسری کو پکار رہی ہیں کہ آؤ ایک ہو جائیں۔ یہ دو لہریں اس بڑی لہر میں تبدیل ہو جانا چاہتی ہیں۔ جس کا کام گرم ہے (وقفہ۔ چاروں طرف قدرے حیرت آلود لیکن عزم آفریں نگاہ دوڑاتی ہے) میں جا رہی ہوں بابا۔ تربور کے ساتھ جا رہی ہوں۔ اس کا تعزیہ سر د پڑا ہے۔

بڈھا : تجھے معلوم ہے کہ تو کیا کر رہی ہے لڑکی۔

شیمینے : مجھے خوب معلوم ہے۔ مردوں کے استبداد کے خلاف بغاوت۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ ان کے آئین کے مطابق میری سزا موت ہونی چاہیئے اور میں بھی جانتی ہوں کہ وہ میرا پیچھا کریں گے۔ وہ مجھ سے زیادہ سبک رفتار ہیں۔ اور ہر قدم پر وہ میرا راستہ روکیں گے۔ ان کی کفن پوش لاشیں اپنی کھوکھلی کھوپڑیوں اور بے نور آنکھوں سے مجھے اندھیرے سویرے ڈرائیں گی۔ اچھی طرح جانتی ہوں میں کہ خم خیل کے پرانے دیوتاؤں سے منہ موڑا ہے میں نے۔ لیکن میں ان سے نہیں ڈرتی۔ میں موت سے بھی نہیں ڈرتی۔ میں اس بیغور سے یا اس طعنے سے بھی نہیں ڈرتی کہ یہ مجزوہ ہے قطعاً نہیں ڈرتی میں کسی چیز سے نہیں ڈرتی (بھیڑیوں کی آواز بلند ہو کر ڈوب جاتی ہے) میں بھیڑیوں سے بھی نہیں ڈرتی جو کتوں کی طرح مجھ پہ لپکیں گے۔ میرے تندرست سرخ خون کے ایک ایک قطرے کو چاٹنے کے لیے اپنی زبانیں نکالے ہانپتے ہوئے آئیں گے۔ میرے پیچھے بھونکیں گے مجھ پر کتوں کی طرح۔ لیکن میں جا رہی ہوں — آؤ تربور — آؤ میرے آقا آؤ۔ آج تک مردوں نے ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھا ہے۔ لیکن اب کوئی ہمیں علیحدہ نہیں کر سکے گا۔

منظر گل : (ہاتھ بڑھاتا ہے) آؤ شیمینے۔

بڈھا : کیا تم سچ مچ جا رہی ہو بیٹی۔

شیمینے : میں دریا کی وہ لہر ہوں جو کبھی نہیں رک سکتی۔ تھم گئی تو سیلاب آ جائے گا یا پھر تعفن پیدا ہو جائے گا۔ وبائیں پھوٹ

پڑیں گی۔ زمین کا سینہ مینڈکوں، جونکوں، گھڑیالوں اور ناقابلِ بیان مخلوق سے پٹ جائے گا۔ جو آدم کی نسل کو زندہ نگل جائے گا۔ چاٹ لے گی۔ خون چوس لے گی اس کا اور ہڈیوں کا چونا بننے کے لیے غاروں میں دفن کر دے گی —— نہیں میں نہیں رک سکتی۔ میں جا رہی ہوں،

(نوجوان کا ہاتھ تھامے کھلے دروازے سے باہر اندھیرے میں غائب ہو جاتے ہیں

بڈھا بت بنے کھڑا نگاہوں سے اُن کا تعاقب کرتا ہے۔ یکدفعہ)

بڈھا : (معمولی آواز جیسے پشمینے کہیں قریب ہی ہے) پشمینے! کدھر چلی گئیں پشمینے (وحشت) پشمینے بیٹی —— (پہلے دائیں دروازے میں اور پھر بائیں دروازے میں پکارتا ہے) پشمینے!

(آخر کار بڑے دروازے کی طرف بڑھتا ہے۔ اس کی آواز جھینگروں کی آواز میں مخلص ہوتی ہے جیسے وہ بھی پشمینے پشمینے پکار رہے ہیں)

پردہ

منزل

شکیلہ اختر

ملٹری ہیڈ کوارٹر سے ارجنٹ کال پاکر جنرل زاہدی جب ریسیور کو اپنی جگہ پر رکھنے لگا تو اس کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ کراچی میل کے حادثے میں ایک لاش کی شناخت کے لیے اس کو فوراً بلایا گیا تھا۔ لاش کے گلے میں لوکٹ کے اندر سے جنرل زاہدی سے ملتی جلتی ایک تصویر برآمد ہوئی تھی۔ کسی مردہ عورت کے گلے سے اس کی تصویر کا نکل آنا کیسی عجیب بات تھی! اور جنرل زاہدی کے لیے بھی سوہان روح بن رہا تھا۔

آئے دن کے حادثوں نے ایک تو ایسے ہی دہشت پھیلا رکھی تھی، اب اُس پر سے بجائے اُس کے عاشق کی تصویر، خواہ مخواہ اُس کے سر پر تھوپی جانے والی تھی۔ جنرل زاہدی نے اپنے پائپ میں تمباکو کی چٹکی بھری، دیاسلائی کی ایک تیلی سے اسے پائپ میں جمایا اور پھر آہستہ سے سلگا کر ایک گہرا کش لگایا۔ وہ غریب آج کس مصیبت میں پڑ گیا تھا، اچھا خاصا دن، نجانے کس چکر میں گزارنا پڑے گا، ناگواری اور بیزاری کی خاصی جھلک اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہی تھی، آخر مجبور ہو کر اس نے اپنے گنجے ہوتے ہوئے سر پر فیلٹ ہیٹ جما لی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک پہلی رونق کی یاد باقی تھی، اور تھکی ہوئی آنکھوں میں پہلی سی تازگی کی تھوڑی جھلک نظر آ رہی تھی۔ چڑچڑے اور اکتائے ہوئے انداز سے جب وہ اپنی ملٹری جیپ اسٹارٹ کر چکا تب پائپ کا ایک گہرا کش لیتے ہوئے اچانک اس کے جسم میں ایک تھرتھری سی آئی — محاذ پر، گھمسان کی رن پڑتی، وہ اس طرح سے کبھی نہ گھبرایا تھا، شاید نوجوانی کے گرم خون کے ابال نے ان قیامت خیزیوں کو اتنا محسوس نہ ہونے دیا تھا۔ اور اب، صرف ایک لاش پہچاننے کے خیال ہی سے اس کو دہشت ہو رہی تھی۔ ہسپتال کے بڑے احاطے میں جب وہ جیپ سے اتر کر آفس میں داخل ہوا تو انچارج نے بڑے افسوس اور معذرت بھرے لہجے میں جنرل کا استقبال کیا۔ اس وقت اس کی تشریف آوری ایک غمناک حادثے کے سلسلے میں ہوئی تھی۔

آفس سے نکل کر جب وہ انچارج کے ساتھ چلتا ہوا مردہ خانے میں پہنچا تو خوف اور ٹھنڈک سے اس کے پیر کانپے جا رہے تھے، انچارج کئی لاشوں سے گزرتا ہوا ایک ایسی میز کے پاس آکر رک گیا۔ سفید چادر کو اٹھا کر کچھ دیکھنے کی جنرل میں ذرا بھی ہمت نہ تھی۔

انچارج نے بتایا کہ ریل کے حادثے کو چار دن گزر چکے ہیں، یہ عورت زخمی صورت میں ہسپتال لائی گئی تھی۔ اس کے جسم سے اتنا خون نکل گیا تھا کہ کسی وقت بھی اس کو ہوش نہ آ سکا۔ اس کے جسم میں خون پہنچانے کی کوشش بھی کی گئی مگر اس کے خون کا نمبر بلڈ بینک

ہیں سنٹرل ہسپتال حادثے کے مریض کچھ اتنے زیادہ تھے کہ اتنے زخمیوں کے بیچ کوئی اپنا خون بھی او فر نہیں کر سکتا تھا،

انچارج نے بڑے افسوس بھرے لہجے میں کہا کہ اس خاتون کے مرنے کے بعد اس کے گلے میں لوکٹ کے اندر سے آپ کی تصویر پائی گئی، اگر مرحومہ کو ہوش آ جاتا اور وہ آپ کا پتہ بتا سکتیں تو ہم اس سے پہلے آپ کی خدمات حاصل کر کے شاید ان کی جان بچا سکتے ـــــ یہ کہتے ہوئے اس نے لاش کے چہرے پر پڑی ہوئی چادر کو ہٹا دیا ـــــ دن کے وقت، ہائی پاور کا بلب جلتے رہنے سے بھی زاہدی نے تنے کی طرف جھک کر لاش کو دیکھا۔ چہرہ زعفران کے سوکھے ہوئے پھول کی طرح زرد اور نڈھال تھا۔ حسرت بھری آنکھیں جیسے کسی کے انتظار میں تھوڑی سی کھلی رہ گئی ہوں ـــــــ زاہدی ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

”میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ میرے گھر والوں، عزیزوں یا دوستوں میں سے بھی یہ کوئی نہیں ہے۔“ زاہدی نے بڑے سکون اور خوشی کی ایک لمبی سانس کھینچی۔

”اچھا۔ وہ لوکٹ کہاں ہے؟ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں“ جنرل کے لہجے میں غرور بھری اکتاہٹ تھی۔

آفس روم کی منجمد کر دینے والی سردی میں بھی خواہ مخواہ کی دردسری اس کو ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ انچارج نے بڑے احترام سے کاغذ کا ایک پیکٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ جنرل زاہدی نے میز کے نیچے آ کر بڑی بے فکری کے ساتھ پیکٹ کھولا۔ سونے کی پتلی سی زنجیر اس کی انگلیوں کے بیچ سے نکل کر نیچے جھولنے لگی۔ لوکٹ بڑی آسانی سے کھل گیا۔ جنرل زاہدی نے آنکھوں کے قریب لا کر لوکٹ کو دیکھا۔ یہ تصویر بھی اس کی اپنی نہ تھی۔ مگر اس سے ملتی جلتی ضرور تھی۔ اتنی چھوٹی سی تصویر میں ہر ایک خط و خال کو سمجھنا آسان بھی تو نہ تھا۔ اس نے کمرے کے سارے بند دریچوں کو کھلوا دیا۔ دن کی روشنی اور جلتی ہوئی لائٹ میں ایک بار پھر اس نے بڑے غور سے اس تصویر کو دیکھا۔ اور لوکٹ انچارج کے ہاتھ میں یہ کہتے ہوئے واپس دے دیا ”آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرا اس کیس سے کوئی واسطہ نہیں“ جنرل نے اپنی گھنی بھوئیں سکیڑتے ہوئے بڑی بیزاری سے کہا ـــــ انچارج نے ایک بھرپور نظر زاہدی پر ڈالی اور دھیمے لہجے میں بولا ”جناب ذرا اس تصویر کو الٹ کر دستخط کو بھی ملاحظہ فرما لیں“ جنرل زاہدی کو فوراً ہی اپنی اس چوک کا احساس ہوا اور اس نے ذرا دقت کے ساتھ لوکٹ کے فریم میں سے تصویر نکال لی۔ اس نے تصویر الٹی تو ایک لمحے کے لیے چونکا۔ تصویر کی پشت پر بس اتنا ہی لکھا ہوا تھا ”تمہارا اپنا زاہدی“ ـــــ ایک بار اس نے تصویر کو پھر سے الٹ کر بڑے غور سے دیکھا۔ اور اچانک ایک بھولی ہوئی کہانی اس کے حافظے میں ابھرتی چلی گئی۔

اسے یاد آ گیا کہ ”یہ تصویر کمیشن ملنے سے پہلے ٹریننگ کے زمانے میں اس کے کچھ دوستوں نے جھانسی میں کھینچی تھی“

وہ تیزی سے چلتا ہوا لاش کے قریب واپس آیا۔ اور لاش کی ڈھکی ہوئی صورت پر سے چادر ہٹا کر چہرہ کو بائیں سے دائیں طرف پھیر کر بڑی بے قراری سے کوئی نشان ڈھونڈنے لگا۔ آخر اس کی نظر دائیں رخسار سے نیچے لبوں کے قریب، ایک بڑے سے کالے رنگ کے تل پر جم کر رہ گئی۔ یکایک اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، اور اس نے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لاش کے چہرے کو سیدھا رکھ کر، بڑے احترام اور عقیدت کے ساتھ اپنے سر کو اس کے آگے جھکا دیا۔ اس کے چہرے پر رنج و غم کے ایسے اثرات چھائے تھے جیسے دل و دماغ کی ساری رگیں ایک ہی دفعہ جھنجھنا کے ٹوٹ جائیں گی۔ وہ بڑی مشکلوں سے اپنی چیخ کو روک سکا اور آنسوؤں کے سیلاب آپ ہی آپ اس کی آنکھوں سے امڈتے چلے آئے۔ جنرل زاہدی نے اپنی دکھی اور غم سے بوجھل آواز میں انچارج کو بتایا

کہ "یہ لاش اس کی ایک عزیزہ کی ہے اور ایمبولنس کار میں وہ جنرل کی کوٹھی پر پہنچا دی جائے۔

آتش روم سے اس مردہ خانہ میں ایمبولنس کار کے آنے تک، جنرل زاہدی نے اتنا وقت کیسے گذارا تھا اس کا اسے کچھ پتہ نہ چلا۔ لاشوں سے بھرے ہوئے برف کے ایک سرد کمرے میں ایک لمبی سی میز پر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی، اپنے شباب میں کھل اٹھنے والی کلی کو، برسوں کے بعد ایسی بے بسی کی حالت میں اس طرح سے مرجھائے ہوئے دیکھنے کی اُسے توقع نہ تھی —— اس نے بڑی بے کسی کے عالم میں دریچے سے نظر آتے ہوئے نیلے آسمان کو دیکھا، اور اس کا دل رو پڑا۔ "خدایا — میرے گناہوں کی ساری سزا، ایک ہی دفعہ کیوں اتنی سنگین مل گئی ہے ؟ الٰہی —— زندگی کا سارا درد ایک ہی بار میری روح میں اس طرح سے کیوں بھر دیا گیا ہے ؟"

انچارج نے زاہدی کے غم کا اندازہ لگاتے ہوئے بڑے افسوس بھرے لہجے میں بتایا کہ "مجروحین کے سامانوں میں سے ایک سوٹ کیس کے اندر کچھ کاغذات اور ایک پاسپورٹ بھی ملا ہے۔ پاسپورٹ میں صرف کراچی کا ویزا لیا گیا ہے اور ایک ڈائری میں جناب کا پورا پتہ نوٹ کیا ہوا ہے۔" اُس نے اپنے بیگ کے اندر سے ایک انڈین پاسپورٹ اور ایک چھوٹی سی ڈائری نکال کر زاہدی کو دکھائی۔ جنرل نے وہ دونوں چیزیں لے لیں، اب اس کو کسی اور پتہ نشان کی ضرورت نہ تھی۔ کالے سے تل نے پہلے ہی اُسے اپنا سارا اتہ پتہ دے دیا تھا۔

زاہدی ایمبولنس کار سے لاش کو اسٹریچر پر رکھ کر اتنے اہتمام سے اپنے بیڈ روم میں لایا کہ جیسے ساری زندگی وہ اسی بے جان مہمان کا انتظار کرتا رہا ہو۔ اس نے دوسرے کمروں سے تازہ پھولوں کے گلدستے لا لا کر اسی کمرے میں سجا دیئے۔ کھڑکیاں کھول دیں اور ریشمی پردوں کو کھینچ کر برابر کر دیا۔ زاہدی کے پیروں میں تھرتھراہٹ تھی، پھر بھی وہ بڑی تیزی سے سارے کام خود اپنے ہاتھوں سے کرتا جا رہا تھا۔ جنرل کے ملازم حیرت زدہ بڑی خاموشی کے ساتھ اس کے پیچھے پیچھے حکم کے منتظر کھڑے تھے۔ انھوں نے ہسپتال کے قلیوں کو اسٹریچر پر ایک بیمار مہمان کو لاتے ہوئے دیکھا تھا۔ مگر خوبصورت گلدستوں کو دور سے دیکھ کر صاحب کے بیڈ روم میں آج انھیں بڑی رونق معلوم ہو رہی تھی، جنرل زاہدی کو پھولوں سے کمرے کو سجا کر بھی قرار نہیں آ رہا تھا وہ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے اس طرح سے سارے گھر میں گھوم رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے راستے سے بھٹک گیا ہو۔ وہ کسی ایسی چیز کو پا لینا چاہ رہا تھا جو اس کو کہیں نہیں مل رہی تھی، وہ اتنا تھک گیا تھا کہ جگہ جگہ اس کو بیٹھنے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

آخر اس نے ایک دراز میں سے بہت سی موم بتیاں نکالیں اور اپنے بیڈ روم میں اپنی مسہری کے سرہانے ایک چھوٹی سی میز پر ان سب موم بتیوں کو ایک ہی ساتھ جلا کر روشن کر دیا۔ بڑی آہستگی سے اس نے لاش کے ڈھکے ہوئے چہرے پر سے چادر ہٹائی اور بڑے پیار سے اس بے جان زرد چہرے کو ایک بار پھر سے دیکھا۔ اس نے اپنی گرم گرم ہتھیلی سے بڑے احترام اور محبت کے ساتھ اس کی ٹھنڈی پیشانی کو چھوا۔ اپنا ہاتھ بڑے پیار سے اس کی ادھ کھلی آنکھوں پر پھیرتا رہا، اس کی تھرتھرائی ہوئی انگلیاں گال پر سے پھسلتی ہوئی، اُسی کالے تل پر آ کر ٹھہر گئیں، زاہدی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ایک جھیل بھر گئی تھی، اس کا چہرہ درد و غم کے طوفان میں جیسے پھٹا جا رہا تھا، یکبارگی اُس کے ضبط کی ساری قوتیں ختم ہو کر رہ گئیں، وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کر روتا ہوا لاش کے چہرے پر جھک گیا، اس نے اپنی کانپتی ہوئی باہوں کو اس بے جان جسم کے گرد ڈال دیا اور بڑی بے تابی سے چاہا کہ اس ٹھنڈی پیشانی، اُن مردہ آنکھوں اور سرد لبوں کو ایک بار جی بھر کے پیار کرے، اُس کالے تل کو وہ اپنی آنکھوں سے لگا لگا کر چومنا چاہ رہا تھا۔ یہی تو اس کی محبت کا کعبہ تھا، اسی کالے تل کے گرد تو زندگی بھر اس کی روح طواف کرتی

رہی تھی۔ اسی سہمے ہوئے سیاہ مقدس تل کو چومنے کے لیے تو وہ ساری عمر ترستا رہا تھا۔ اسی پیارے تل کی یاد میں اس نے جھوٹا تل بنا کر اس کو پیار کرنا چاہا تھا، اور اب مرنے کے بعد ایسی بے چارگی کی حالت میں وہ اپنے کعبے کی عظمت کو مٹا نہ سکتا تھا۔ وہ تو اپنے خوابوں، خیالوں اور تصوروں میں بھی ہمیشہ سے اسی سیاہ تل کا احترام کرتا آیا تھا —— اس نے اپنی لرزتی ہوئی انگلیوں کو وہاں پر سے ہٹا لیا۔ ایک بار پھر بڑے پیار اور حسرت سے لاش کو دیکھا اور پھر اس کو چادر سے ڈھانپ کر کمرے کے در کا پردہ گرا کر باہر برآمدے میں آ گیا۔

اس کی سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے؟ سنسان دوپہر کی دھوپ اس کے احاطے میں اُداس پڑی تھی اور وہ اپنی پوری وردی پہنے، بے حد غمگین حالت میں اکیلا، آنکھیں بند کئے کرسی پر پڑا تھا۔ آج اس کی زندگی کا یہ دوسرا حادثہ تھا۔ پائپ کا ایک کش لیتے ہوئے اس کو یاد آ گیا کہ اٹھارہ سال پہلے وہ پٹنہ ہسپتال کا نیا نیا ہاؤس سرجن بنایا گیا تھا۔ ایک دن کئی دوستوں کے ساتھ سینما جانے کے لیے وہ لفٹ سے ابھی اتر کر آ ہی رہا تھا کہ بڑے صاحب کے دستخط سے، چپراسی نے اس کو کورٹ کا وہ کال بک دیا جس میں ڈاکٹر ناتھ نے ایک ایمرجنسی کیس کے لیے ان ڈاکٹروں میں سے جلد سے جلد کسی ایک ڈاکٹر کو بلایا تھا جنھوں نے ہسپتال کے مریضوں کو اپنا اپنا خون دینے کے لیے اپنے نام پیش کئے تھے۔ اس وقت دوسرے ڈاکٹروں کا کوئی پتہ نہ تھا۔ چپراسی کئی جگہ سے ناکام ہو کر واپس آ گیا تھا۔ خون آوفر کرنے والوں میں ایک اس کا اپنا نام بھی تھا، اور اس وقت سینما جاتے جاتے چپراسی نے وہ کال بک اس کو تھما دیا تھا۔ سینما کا پروگرام ختم کرتے ہوئے اس کو بڑا افسوس ہوا۔ دوستوں کی بڑی اچھی پارٹی مل ملا کر فلم دیکھنے کو جا رہی تھی۔ اپنے دوستوں کو بڑے دکھ کے ساتھ رخصت کر کے جب وہ اسی چپراسی کے ساتھ کورٹ کی طرف جانے لگا تو اس کو بے وقت کے مریض اور ڈاکٹر دونوں پر غصہ آ رہا تھا۔ "اپنی مرضی سے کوئی دو گھڑی، اچھا وقت بھی نہیں کاٹ سکتا ہے۔" ڈاکٹر ناتھ بڑی بے صبری سے خون آوفر کرنے والے کسی ڈاکٹر کا انتظار کر رہا تھا، درخت سے ٹکر لگ جانے کی وجہ سے کار کے حادثے کا ایک کیس آ گیا تھا، موٹر ڈرائیو کرنے والے نوجوان لڑکے کی دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں، اس کو سرجیکل کیبن میں داخل کر دیا گیا تھا اور دوسری یہ لڑکی تھی جس نے سر اور گردن کے زخموں سے اتنا زیادہ خون بہہ گیا تھا کہ فوری طور پر اس کے جسم میں خون دینے کی ضرورت پڑ گئی تھی۔ صرف ایک ڈرائیور ہی بچ سکا تھا جس نے ہسپتال میں فون کر کے ایمبولنس مانگی اور اب انھیں کسی طرح سے یہاں لا سکا تھا۔ ناہدی کو اس سارے تفصیل سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اتنے بڑے اسپتال میں قریب قریب ہر ہفتہ ہی ایسے کیس آتے تھے —— وہ تو اپنے آپ پر جھلایا ہوا تھا کہ انسانی خدمت کا جذبہ اگر پیدا نہ ہوتا تو کتنے مزے میں وہ بھی اپنے دوستوں کے ساتھ الفنسٹن میں بیٹھا ہوا فلم "زندگی" دیکھتا۔ اور سہگل کے گانے کانوں میں رس گھولتے رہتے۔

ڈاکٹر ناگیشر نے انجکشن کی سوئی اس کے ہاتھ کی رگ میں چبھوئی اور وہ سرنج میں بلبلوں سے بھرے ہوئے اپنے تندرست لال لال خون کو نکلتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اتنا خون کتنے دنوں میں بنا ہوگا۔ اس کو ڈاکٹر ناگیشر پر غصہ آنے لگا جو بلڈ بنک میں خون کا کافی اسٹاک رکھتے ہوئے بھی ہر گھڑی خدائی خدمت گاروں کی تاک میں لگا رہتا تھا، اور یہ بھی فطرت کا اک مذاق ہی تھا کہ اس کا خون مریضہ کے خون کے نمبر سے مل گیا تھا۔ تین سو سی سی خون اس کے جسم سے کھینچ لیا گیا، اس نے اپنی کہنی کے سامنے والے نمایاں رگ پر اسپرٹ سے بھیگی ہوئی روئی کا پھاہا دابتے ہوئے مسہری پر پڑی ہوئی بیہوش لڑکی کو مڑ کر دیکھا جس کے سر اور گردن کی سفید پٹیوں کے اوپر تک خون کے

دیجے پڑگئے تھے، ڈاکٹر نے کچھ دیر تک ریسٹ کرنے کو ایک آرام کرسی پر اس کو بٹھا دیا اور وہ خاموشی کے ساتھ بیٹھا بیٹھا بیہوش لڑکی کے جسم میں اپنی رگوں کا خون جانے کا تماشا دیکھتا رہا۔ سفید بوتل میں اس کا سرخ خون لٹک رہا تھا اور ربڑ کی پتلی نلکی سے گزرتا اور شیشے کی نلکی سے بار بار جھلکتا ہوا اس کے اپنے خون کا ایک ایک ٹپکتا ہوا قطرہ لڑکی کے سفید ہاتھ میں چبھی ہوئی سوئی کے ذریعہ ایک ایسے جسم میں داخل ہو رہا تھا جس کو وہ جانتا تک نہ تھا۔ لڑکی کا چہرہ بہت ہی بھولا اور معصوم سا تھا، اس کے گورے رنگ کے خاموش چہرے پر اس کے الجھے ہوئے سیاہ بال زاہدی کو بڑے اچھے لگے۔ اس کے ساکت لبوں پر کبھی کبھی تھرتھراہٹ کی ایک ہلکی سی لہر آجاتی تھی اور بند آنکھوں کی لمبی لمبی سی جھکی ہوئی سیاہ پلکوں پر بھی دبے پاؤں زندگی کی ایک آہٹ محسوس ہونے لگتی تھی، کمرے کے اندر گہرا سناٹا چھا رہا تھا اور ڈاکٹر ناتھ بڑے غور سے نبض کو تھامے سانس کی حرکت کو دیکھ رہا تھا —— بڑی ادا سی کے ساتھ آہستگی سے مریضہ کا ہاتھ تکیہ پر رکھتے ہوئے ڈاکٹر ناتھ نے کہا :۔

"نبض ڈوبتی جا رہی ہے۔ کورامن کا ایک انجکشن اور لگا کر دیکھئے۔ اور آکسیجن بھی جلدی لگایا جائے۔"

نرس نے ڈاکٹر ناتھ کی جھکی ہوئی آنکھوں کو دیکھا اور آکسیجن سلنڈر لانے کے لیے تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

اچانک زاہدی نے اپنے دل کے اندر سے ایک ٹیس اٹھتی ہوئی محسوس کی، اس نے بڑے خلوص کی نظر سے بے ہوش پڑی ہوئی لڑکی کو دیکھا، اور اس کی دلی خواہش ہوئی کہ خدا کرے یہ بچ جائے۔ اس کی موت زاہدی کے خون کی شکست تھی، اور اپنی بھی قربانی کو وہ اس طرح سے ضائع ہوتا ہوا دیکھنا نہ چاہتا تھا ——

کورامن کا انجکشن دیا گیا، آکسیجن سلنڈر سرہانے رکھ کر ربڑ کی نلکی کے ساتھ لگی ہوئی قف کو لڑکی کی ناک کے قریب رکھ کر نرس اک اسٹول پر بیٹھ گئی۔ گرم پانی کی کئی کئی تھیلیاں اس کے پیروں پر اوپر اور نیچے رکھ دی گئی تھیں، اور قطرے قطرے کرکے زاہدی کا خون اس کی رگوں میں جا رہا تھا۔

لڑکی زندگی اور موت کے جھولے میں جھول رہی تھی —— ڈاکٹر ناتھ جا چکا تھا، زاہدی نے کوچ کے اس کمرے میں موت کی سرد اور غمناک خاموشی کو چھلتے ہوئے محسوس کیا اور وہ ہسپتال کے اس احاطے سے باہر نکل آیا —— چلتے چلتے اس کو خیال آیا کہ ۳۰۰ سی سی خون نکل جانے کے بعد اس کے جسم میں تھوڑی سی کمزوری آ گئی ہے۔ مگر اچانک اپنے خون کی سرخی سے بھی کہیں زیادہ اس کو اس معصوم چہرے کی یاد آگئی جو اس دنیا میں بس تھوڑی دیر کا مہمان تھا —— اپنا خون دے کر بیکار میں اس نے اپنی طبیعت پر غم کا ایک بار لیا تھا —— الفنسٹن میں سہگل کے گانے سن سن کر اس کے دوست جھوم رہے ہوں گے اور ایک وہ تھا جو اداس قدموں سے اپنے اکیلے کمرے کی طرف بے مقصد چلا جا رہا تھا۔ کمرے کے اندر آ کر زاہدی نے جب لائٹ جلائی تو اندھیرے کمرے میں اجالے کو دیکھتے ہوئے اس کو خیال آ گیا کہ زندگی بھی اسی روشنی کی طرح صرف ایک لہر ہی تو ہے، اور کنکشن کا کٹ جانا ہی موت کی تاریکی ہے، پھر اس کی نگاہوں میں کوچ کا کمرہ نمبر ۵ گھوم گیا، جہاں کے بیڈ پر ایک مدھم سے جلتے ہوئے بے تیل کے چراغ کو بجھانے کے لیے عزرائیل کی بے رحم انگلیاں بڑھتی آ رہی تھیں۔ اور جب سوئچ دب جائے گی تو ان جھکی ہوئی پلکوں کی زندگی کا رینگتا ہوا وہ سایہ بھی کبھی محسوس نہ ہوگا۔ اور پھر کبھی اس کے لبوں پر حیات کی ایک ہلکی سی تھرتھراہٹ لوٹ کر نہ آئے گی۔

زاہدی نے تکیہ میں منہ کو چھپا کر سو جانا چاہا —— انجکشن والی جگہ میں ہلکی سی چبھن ہو رہی تھی۔ اور اتنی تھوڑی سی تکلیف

بھی اس کو بے کل بنا رہی تھی۔ اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر وہ کروٹوں پر کروٹیں بدلتا رہا۔ آج نہ دیکھی جانے والی فلم کو دیکھنے کا پروگرام بناتا رہا۔ اپنے وارڈ کے مریضوں کے حالات پر غور کرتا رہا۔ اور کافی دیر کے بعد جب اس نے گھڑی دیکھی تو ابھی صرف دس ہی بجے تھے۔ وہ اپنی مسہری پر سے جھلا کر اٹھ بیٹھا، کمرہ بڑا ویران لگ رہا تھا۔ اور سامنے لیبر روم کے پاس سے رونے اور بین کرنے کی کئی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اسی طرح سے سلیپنگ سوٹ پہنے، قریب ہی اوپر کے ڈیوٹی روم میں چلا گیا۔ فون میں کوئج کا نمبر ملایا اور ڈرتے ڈرتے وہاں کے انچارج ڈاکٹر سے کمرہ نمبر ۵ کی خیریت دریافت کی، ڈاکٹر کی جگہ پر نرس نے اس کا کال ریسیو کیا اور اپنی روزمرہ کی طرح سرد آواز میں اسے بتایا کہ "پانچ نمبر کی پیشنٹ ابھی تک جی رہی ہے۔ آکسیجن دیا جا رہا ہے۔ پلس کچھ بہتر ہے"

زاہدی نے خوشی کی ایک گہری سانس لی۔ اس نوجوانی کے عالم میں اس کا خون اتنا کمزور نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ ایک دھان پان سی لڑکی کو بھی نہ بچا سکے۔ اور اگر یہ آج کی رات کٹ گئی؟ زاہدی نے زندگی میں پہلی بار رات کی تاریکی میں ستاروں بھرے بلند آسمان کو بڑی لجاجت سے دیکھا اور بہت بڑی طاقتوں والے خدا کے آگے خلوص دل سے ایک اجنبی معصوم لڑکی کی زندگی کو بچا لینے کی دعا مانگی ——— پھر جب وہ کمرے میں واپس آیا تو اس کو محسوس ہوا کہ وہ بھوکا ہے، میز پر تولیہ سے ڈھکا ہوا ٹھنڈا کھانا کھانے کو اس کا جی نہ چاہا ——— اور وہ رات ابھی کٹنے کی دعا کرتے کرتے بے خبر سو گیا ———!

دوسرے دن اس کے جسم کے اندر شاید ۳۰۰ سی سی خون کی کمی پوری ہو چکی تھی۔ اسی لیے نمبر ۵ کمرہ کی مریضہ کے لیے اس کو کوئی خاص پریشانی باقی نہ رہی، ابھی وہ اپنے وارڈ کے مریضوں سے نبٹ ہی رہا تھا کہ اس کو کاٹج کی پھر ایک سلپ ملی۔ وہاں کے ڈاکٹر انچارج نے اس کو لکھا تھا کہ اپنے دوسرے ساتھی کو یہاں بھیج دو، اس لڑکی کو ابھی اور خون دینے کی ضرورت ہے۔"

زاہدی کو خوشی کی ایک جھرجھری سی آئی "ارے ابھی وہ لڑکی زندہ ہے" خون آفر کرنے والے ڈاکٹروں میں ڈاکٹر کمار اسی وارڈ کے دوسرے حصے میں انچارج تھا، زاہدی کمار کو سلپ بھیجتے بھیجتے رک گیا۔ اور جونیئر ڈاکٹر کو اپنے وارڈ کا کام جلدی جلدی بتا کر وہ سیدھا کاٹج کی طرف چل گیا۔ ڈاکٹر ناگیشر تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ ساری رات اس نے اسی کمرے میں آکسیجن اور انجکشن کے چکر میں جاگتے ہوئے گذاری تھی۔ اور ابھی پھر ڈھائی تین سو سی سی خون دینے کی ضرورت باقی ہی رہ گئی تھی۔ زاہدی نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ناگیشر چونک پڑا۔

"کوئی ہرج نہیں ڈاکٹر ——— نوجوانی کے عالم میں اتنے بہت سے خون بنتے رہتے ہیں۔"

سسٹر جوزف نے بڑی تنکھیی نظروں سے زاہدی کو دیکھا؛ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آئی اور اس نے ناز سے تیوری بدل کر زاہدی کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیا۔ زاہدی مسکراتا رہا، اور ناگیشر کو چھیڑ چھیڑ کر مریض لڑکی کی خیریت پوچھتا رہا۔ لال لال خون کی ایک ایک کرکے گرتی ہوئی بوندیں، شیشے کی نلکی سے چھلکتی ہوئی زاہدی کو آج بڑی اچھی لگ رہی تھیں، اس کو اسی بات کی خوشی تھی کہ ایک ڈوبتے ہوئے دل میں زندگی کی طاقت بخشنے والا صرف اسی کا اپنا خون تھا۔ زاہدی نے کمارسے ذہنی رقابت محسوس کرتے ہوئے آج بھی اپنا ہی خون پیش کیا تھا ——— اس کو ہمیشہ سے اپنی صحت پر ناز تھا اور اس طرح سے اس کی نگاہیں اپنے او فر کیے ہوئے خون کا کمال دیکھنا چاہتی تھیں ——— لڑکی ابھی تک بے ہوش تھی، اس کا ڈرائیور حادثے کی خبر دینے کو گھر گیا ہوا تھا۔ سرجیکل وارڈ کے کیبن میں نوجوان لڑکے کی پسلیوں پر پلاسٹر لگ چکے تھے۔ ہسپتال کے ٹکٹ میں ہسٹری لکھاتے ہوئے ڈرائیور نے بتایا تھا کہ یہ دونوں بچے

میجر شعیب کے بیٹے علی گڑھ یونیورسٹی میں لڑکا بی۔ ایس۔ سی کر رہا تھا اور لڑکی سیکنڈ ایئر میں تھی، چھٹیوں میں آتے ہوئے اپنے ایک عزیز کے یہاں بنارس میں یہ دو دن کے لیے ٹھہر گئے تھے، اور اسی عزیز کی گاڑی لے کر اپنے والد سے ملنے، اپنے گھر رانچی جا رہے تھے کہ پٹنہ سے دو میل پرے کا یہ حادثہ پیش آ گیا۔ اتنی ساری تفصیل ناگیشر سے سن کر زاہدی نے بڑی افسردہ نظر لڑکی پر ڈالی۔ لڑکی کے چہرے کی زرد جلد کے نیچے سے شفقی رنگ کا آسیج ایک ہلکا سا سایہ بھی جھلک رہا تھا۔ اس کی گھنے سیاہ پلکوں پر زندگی کے آثار واپس لوٹ رہے تھے، اور سوکھے لبوں پر کپکپاہٹ بڑھ گئی تھی ——— زاہدی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ایک لمبی سی انگڑائی لی "بھلا میجر صاحب کے گھر میں اس کے خون کی یہ سرخی اور زندگی کی یہ گرمی کاہے کو کبھی یاد رکھی جانے گی"۔ اور یہ سوچتے ہوئے زاہدی نے اپنے آپ کو بڑا چھچھورا محسوس کیا ——— کتنی جلدی وہ اپنی اجرت لینے کو تیار ہو گیا تھا! ——— اور تو خاص بات کیا ہوتی؟ ——— ڈاکٹر ناگیشر کے ساتھ وہ سرجیکل کیبن میں اس لڑکے کو بھی دیکھ آیا تھا۔ ان دونوں ستم رسیدہ بھائی بہنوں سے اس کو ایک ہمدردی ہو گئی تھی ——— تیسرے دن اپنی وارڈ میں جانے سے پہلے ہی وہ بالکل غیر ارادی طور پر کوبج میں پہنچ گیا، کمرے کے اندر پردے کے پیچھے سے بھاری قدموں کی آہٹ کو اس نے پہلے ہی سے محسوس کر لیا تھا جب وہ کمرے کے اندر پہنچا تو ایک ادھیڑ سے بھاری بھرکم ملٹری افیسر نے اپنے اکھڑ لہجے میں مٹھاس پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا کہ وہ ڈاکٹر زاہدی سے مل کر اس کی انتہائی مہربانی کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ رات ہی ڈاکٹر ناگیشر سے زاہدی کی پرخلوص خدمتوں کی اس کو خبر مل چکی تھی۔ میجر شعیب کو جس وقت یہ معلوم ہوا کہ یہی ڈاکٹر زاہدی اس کا محسن ہے تو [illegible] کے طور پر اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اس وقت ان ساری باتوں کے درمیان اجلے بستر پر اجلی چادر میں لپٹی ہوئی کمزور سی مریض لڑکی، بڑی نحیف اور اجنبی نظروں سے زاہدی کو تکتی جا رہی تھی۔ زاہدی کو اس کی بند آنکھوں سے یہ کھلی ہوئی آنکھیں بہت زیادہ اچھی لگیں۔ آج ان آنکھوں میں بیگانہ پن کے باوجود زندگی کی چمک تھی۔ اور اس روشنی میں ان لرزشوں اور حرکتوں میں، خود زاہدی کے اپنے خون کے ذرے جگمگا رہے تھے، اسی وقت اس نے دائیں طرف کے گال پر اس کے ہونٹ کے قریب ایک سیاہ تل کو بھی دیکھ لیا تھا، اور اس کی آنکھوں کی طرح وہ سیاہ تل بھی اس کو بے حد پسند آیا تھا۔ اس روز سارا دن، اس کے خیالات اسی ایک کالے سے تل کے گرد گھومتے رہے تھے زاہدی کو اسی دن لڑکی کا نام بھی معلوم ہوا تھا۔ اور بڑی بڑی خوبصورت آنکھوں اور سیاہ تل کے ساتھ اس کو مریض لڑکی کا نام بھی بہت ہی پیارا لگا تھا۔

میجر شعیب سے ہاتھ ملا کر جب وہ لوٹنے لگا، تب عینی نے اپنی کمزور آواز میں زاہدی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنے کانپتے ہاتھ کو اٹھا کر اس کو سلام کیا تھا۔ زاہدی خوشی میں جھوم جھوم اٹھا۔ اس کے چلنے کے انداز تک سے خوشی پھوٹی پڑتی تھی، سفید چمکیلے خوبصورت اور سڈول دانتوں پر مسرت کی کوندلپکی جا رہی تھی اور تڑپتے ہوئے ہونٹ آپ ہی آپ مسکرائے جا رہے تھے۔ کوبج سے اپنے وارڈ تک کے اتنے لمبے راستے کو وہ صرف عینی کی بیمار نرگسی آنکھوں اور سیاہ تل کو یاد کرتے ہوئے طے کر رہا تھا کہ اچانک کسی نے اس کو ٹھوکا دیا ———

"ڈاکٹر زاہدی، سسٹر چیرزفم سے بہت ناراض ہے، تم نے کوبج کی ایک پیشنٹ کیلئے سسٹر کا انسلٹ کیا ہے۔ وہ تم سے روٹھی ہوئی تھی، تو تم نے ذرا سا، اس بچاری کو منایا بھی نہیں۔ کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر زاہدی، اب اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھنے لگا ہے اور وہ بھول گیا ہے کہ پنچھی اپنے پر نکلنے کے بعد اڑ جایا کرتے ہیں،" اس وقت زاہدی کی مٹھی میں جب دو چار جھڑے ہوئے پروں کے پر

اور کچھ نہ ہوسکا تو، پھر ہم ہی کام آئیں گے۔"

نیلی بیٹی والی اسٹاف میری نے اپنے چہرے پر خوشی سے دکھ کا اثر پیدا کرتے ہوئے جوزف کا پیغام زاہدی کو سُنا دیا۔ راستہ چلتے، اس طرح سے، محبت کا شکوہ سنتے ہی زاہدی کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا۔

"مس میری! سسٹر جوزف سے کہہ دینا کہ اس وقت اُس نے میری انسلٹ کی ہے۔ ابھی تک اُس نے صرف میرے خلوص کو دیکھا ہے میرے دوسرے پہلو کی اس کو خبر نہیں۔ ہاں اتنا اور کہہ دینا کہ اپنے آئینہ میں وہ سب کی صورت اپنی جیسی نہ سمجھے۔"

یہ کہہ کر زاہدی، بڑی تیزی سے اپنے وارڈ کی طرف مڑ گیا۔ اس کا موڈ اس وقت میری نے خواہ مخواہ خراب کر دیا تھا۔ سسٹر جوزف کو حد سے زیادہ سر چڑھانے کا یہی نتیجہ تھا۔ اور سر پہ بٹھانے کی ساری ذمہ داری زاہدی کی اپنی تھی۔ زندگی کو ہنستے کھیلتے گزار دینے والا کھلنڈرا زاہدی اپنے میٹھے بول اور اپنی صبیح رنگت سے لڑکیوں میں بہت ہر دلعزیز تھا اور لڑکیاں اس پاپلر اسٹوڈنٹ کی بڑی قدر کیا کرتی تھیں۔ کالج اور ہسپتال کے اسی احاطے میں وہ آٹھ برسوں سے قوس قزح کے سات رنگوں میں ہنستا، کھیلتا، ڈوبتا اور تیرتا چلا جا رہا تھا کبھی بھی اس پر جذباتی کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی۔ وہ کھیل کو بس کھیل ہی کی حد تک رکھنا چاہتا تھا، کہ اچانک سسٹر جوزف کی ڈیوٹی اس کے وارڈ میں لگ گئی، اور آہستہ آہستہ بلی کی چال چلتی، قدم قدم پہ رُک رُک کر، دور دور سے اپنی سانس کی خوشبو سنگھا سنگھا کر ایک دفعہ وہ زاہدی پہ چھا کر رہ گئی تھی۔ اور رفتہ رفتہ زاہدی کی ٹائی کے سارے رنگ مس جوزف اپنی پسند اور اپنے پیسوں سے لانے لگی ٹائی کا پھندہ زاہدی کے گلے میں کسنے لگتے جب پوری طرح سے سخت ہو چکا تب وہ ٹائی مس جوزف کے ہاتھوں میں ایک لگام بن کر رہ گئی۔ زاہدی کا پہلا وجود مٹ چکا تھا۔ اس کے قدموں کے نیچے پھیلے ہوئے وہ سارے راستے بھی مٹ چکے تھے، اب وہ سر کو جھکائے بس ایک ہی راستے پر چل رہا تھا جس کی منزل جوزف تھی — گہرے سانولے رنگ کی چالاک سسٹر، جس کا چہرہ لمبوترا تھا، آنکھیں شیرنی کی طرح چمکتی رہتی تھیں اور جس کی کالی کالی سوکھی ٹانگوں پر اُجلا اُجلا اونگا۔ یہ پیرن لٹکتا رہتا تھا۔ وہ بڑی ایکٹنگ کے ساتھ باتیں کرنے کی عادی تھی۔ اور اپنے وارڈ میں رعب جماتے جماتے اس کو اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ میری ہستی سب سے بلند ہے اور اب نرسز کوارٹر میں، دو دن کی چھٹی لے کر بے سُدھ پڑی وہ مسلسل روتی چلی جا رہی تھی — کہ اس کے منہ پھیر لینے پر زاہدی نے اس کو منانے کی کوشش کیوں نہیں کی تھی، پھر کسی پیشنٹ کے مرنے یا جینے سے زاہدی کو اتنا لگاؤ کیوں پیدا ہو گیا تھا۔ ور ۶۰۰ سی سی خون اتنی آسانی سے تو نہیں بنا کرتا ہے جن کو غیروں پر اس طرح سے لٹایا جائے۔" زاہدی کو رتی رتی کی خبر ہو رہی تھی، مگر اس کے گرد تنا ہوا جال کہیں کہیں پر سے اب کمزور ہو چکا تھا۔

جاتے جاتے میجر شعیب نے زاہدی سے اپنے دونوں بچوں کی دیکھ بھال کی گذارش کی تھی۔ ڈاکٹر ناگینہ نے بھی میجر صاحب کو اس بات کا یقین دلا دیا تھا کہ وہ اور زاہدی دونوں مل کر جہاں تک ہو سکے گا خیال رکھیں گے۔

زاہدی کی ڈیوٹی وہاں نہیں تھی، پھر بھی وقت نکال نکال کر وہ بڑی پابندی سے آتا رہا۔ اس کو اس فرض کے ادا کئے بغیر تسلی بھی نہ ملتی تھی — جینی اکیلی، کمرے میں خاموش پڑی رہتی، اس کا گھر یہاں سے بہت دور تھا اور پٹنہ میں ان کی جان پہچان کا بھی کوئی نہ تھا۔ میجر شعیب کے آنے پر اس کے دو ایک رشتہ دار بنارس سے آکر اس سے مل کے جا چکے تھے، اب اس ویران کمرے میں زاہدی کے سوا اور کسی کا انتظار نہ تھا۔ زاہدی کے لیے اس کمرے میں کوئی ایسی کشش بھر گئی تھی، جو اس کی روح میں رنگ و نکہت اور شیرینی بکھیر گئی تھی۔

مسٹر جوزف کی ضد میں وہ کیا سے کیا بنتا جا رہا تھا۔ نمبر ۵ کمرہ کے در پر پڑے ہوئے بلو رنگ کے پھولدار پردے کو اٹھا کر جب وہ اندر داخل ہونے لگتا تو ایک عجیب سی خوشی کی لہر اس کے سارے جسم میں دوڑ جاتی تھی، اور اس کو خیال آجاتا کہ ایک جسم سے نکل کر دوسری رگوں میں جانے ہی خون — پھر خون نہیں رہتا، وہ مقناطیس کی ایک کشش بن جاتا ہے۔

زاہدی اپنے کاموں میں بے چین بے چین سا رہنے لگا۔ اپنے وارڈ کے مریضوں اور ان کے سارے بکھیڑوں میں اب اس کو کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی، تھکا ہارا جب وہ نمبر ۵ کمرہ کا بلو پردہ اٹھانے لگتا تب اس کو ہوش آجاتا کہ وہ کہاں آگیا ہے! پردہ اٹھاتے اٹھاتے پھر وہ جھجک جاتا اور اس کے قدم آگے بڑھنے سے رک جاتے مگر ایک پھیکی سی ہنسی خود بخود اس کے ہونٹوں پر آجاتی تھی ——— یہ اچانک! ——— بلا تمنا کیسے ایک نیا راستہ اس کی زندگی میں کیوں آگیا تھا؟ ——— !

ایک دن بھری دوپہر میں وہ اپنے کمرے کے اندر پلنگ پر پڑا بہت سی جانی اور انجانی باتوں کو سوچ رہا تھا کہ اس کے دروازے پر آہستہ سے دستک کی آواز آئی اور اس نے توجہ دیئے بغیر اندر آجانے کی اجازت دے دی۔ پاؤں کی ہلکی آہٹ کو سن کر اس نے سر اٹھا کر دیکھا، مس جوزف اپنی ڈیوٹی پر سے وہی اوٹنگ اُجلا سا ایپرن پہنے چلی آرہی تھی۔ زاہدی نے اسی طرح لیٹے ہی لیٹے ایک تکیہ کو اپنے سینے سے چمٹا لیا اور اپنا چہرہ نیچے جھکا کر بے پروائی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی طرف دیکھنے ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سچ مچ کافی ناراض ہے ———

مس جوزف بڑی بے خوفی سے ایک کرسی گھسیٹ کر زاہدی کی مسہری کے قریب بیٹھ گئی۔

”ڈاکٹر زاہدی۔ ان دنوں بڑی لمبی لمبی باتیں کرنے لگے ہو، میں تو اب تک تمہارا ایک ہی خلوص کا پہلو دیکھتی آئی ہوں، مگر سنا ہے کہ تمہارا کوئی دوسرا رخ بھی ہے جسے میں ابھی تک نہیں جانتی تھی۔ کیا میں تم سے یہ پوچھ سکتی ہوں کہ ہم دونوں کے درمیان یہ تیسرا کون حائل ہو گیا ہے۔“ مس جوزف بڑی کھنکتی ہوئی صاف آواز میں بولی۔

”میں اس سلسلے میں تم سے کسی قسم کی گفتگو کرنا پسند نہیں کرتا، بس اتنا جان لو، کہ میں اب تک اندھیرے میں پڑا تھا۔ آخر کبھی تو آنکھ کھلنی ہی تھی ——— اب سمجھ لو کہ وہ وقت آگیا ہے۔“ زاہدی بڑی لاپروائی سے بولا۔

”اب تمہارا منہ اس لائق ہی نہ رہا کہ میری باتوں کا کوئی جواب بھی دے سکو۔ بھرتی کی ایک پیشنٹ لڑکی کے لیے تم نے میرا انسلٹ کیا ہے۔ جیسا منہ ویسا مصالحہ، اب کہیں جا کے پتہ چلا کہ تم کتنے پانی میں ہو۔“ مس جوزف کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے تھے اور اس کے چہرے پر نفرت کی تمتماہٹ چھا گئی تھی ——

”یو سٹ اپ“ زاہدی بڑی مشکلوں سے اپنی آواز کو دبائے ہوئے دھیرے سے چلایا ”گٹ آؤٹ“ زاہدی کی آنکھوں سے سچ مچ جیسے آگ کے شعلے نکلنے لگے تھے۔

مس جوزف حیرت زدہ سی رہ گئی۔ اس کی حیران نگاہیں زاہدی کے سانولے چہرے پر غصے کے لال بھبھوکا پن کو تکتی رہ گئیں، اس کو زاہدی سے کبھی ایسی امید نہ تھی۔ وہ اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے بولی: ”ابھی غصے میں یہ بھول رہے ہو ڈاکٹر، کہ تم کس سے گفتگو کر رہے ہو۔ تم کو پچھتانا پڑے گا ——— کسی کی عزت لے کر اس کو اس طرح سے دھتکار دینا کوئی آسان بات نہیں ہے۔“ جوزف کی آنکھوں میں رُکے ہوئے آنسو ایک ہی دفعہ بھر بھرا کے گر پڑے۔

"بس بس اپنی پارسائی کی دھونس مجھ پر نہ جماؤ۔ میں تم سب لوگوں کو بہت اچھی طرح سے جانتا ہوں تمہارے پہلے دوست جیسے نرائن اور ستیش کے ساتھ کھیلتے ہوئے سارے کھیل کون ہے جو نہیں جانتا ؟ اتنے دنوں تک تم نے مجھ کو بدھو بنایا اور میں جان بوجھ کر بیوقوف بنتا چلا گیا۔ دراصل میں لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے بھاگتے اور ان سے کھیلتے کھیلتے تھک گیا تھا۔ اور میری اسی تھکن کو تم نے اپنے لیے میری محبت اور وابستگی سمجھ لیا۔ یہ تمہاری اپنی بھول تھی ——— میرا قصور نہ تھا ——! پھر! اب تم جو یہ دھمکی مجھے دے رہی ہو تو اس کو بھی سن لو۔ کہ جیسے نرائن، اور ستیش کا تم نے پہلے کیا بگاڑ لیا ہے جو اب میرا کچھ بگاڑ سکو گی" ——؟

مسٹر جوزف جس کے رعب سے اس کا سارا وارڈ کانپتا تھا جس کا راؤنڈ ختم ہو جانے کے بعد لوگ کہیں اطمینان کا سانس لیا کرتے تھے۔ اس وقت غصے، ضبط، اور ناکامی پر خودی کانپ رہی تھی۔

"تم انڈین لوگ منہ لگانے کے قابل ہی نہیں تھے، یہ ہماری اپنی ہی بھول تھی"۔ وہ زور سے کرسی کو پیچھے دھکیلتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ زاہدی کو ایک بار نفرت اور غصے کی نظر سے دیکھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی دروازے کے قریب پہنچی ۔ کواڑ کا ہینڈل کھینچ کر کھولا۔ ذرا سا ٹھٹکی، اچانک پیچھے مڑی اور آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی ——

"اچھا ڈاکٹر بائی بائی"۔ اور اس کے بھرے سانولے رنگ کی لہراتی ہوئی انگلیاں دروازے سے باہر نکل چکی تھیں۔

(۲)

عینی کو زاہدی کا انتظار رہتا تھا۔ اس کے آجانے پر اس کا معصوم سا بھولا بھالا چہرہ خوشیوں سے دمک اٹھتا تھا۔ وہ بڑے پیارے انداز سے اس کو بتایا کرتی تھی کہ اس کے چلے جانے کے بعد یہ کمرہ اداس ہو جاتا ہے یہاں تک کہ برآمدے اور صحن کے سبزوں پہ سے گذرتا ہوا وہ نیلا سا راستہ بھی خاموش ہو جاتا ہے۔ اور اس کو وہ اداسی اور سناٹے اچھے نہ لگتے تھے، اور رونے کی کوشش پر بھی اس کو کسی طرح سے نیند نہ آتی تھی۔" یہ سارے الفاظ عینی کے خوبصورت لبوں سے اتنے پاکیزہ طور پر ادا ہوتے تھے کہ زاہدی اپنی خلوص بھری نگاہیں بھی ان ہونٹوں کی لرزشوں پر جمانے کی ہمت نہ کر سکتا تھا۔ اس کو عینی کی آنکھیں اس شفاف، ٹھنڈے اور میٹھے پانی کی جھیل جیسی نظر آتیں، جس میں دیوتاؤں پر چڑھائے جانے والے معصوم کنول کے مقدس پھول کھلتے ہیں، اور جس تجلی سے دیویاں نہاتی ہیں اور انسانوں کے گناہوں کے داغوں کو دھویا جاتا ہے۔ اس نے نسائیت کو اس روپ میں کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ ہنستے اور لپکتے ہوئے شعلوں پر اب تک کھیلتا رہا تھا جس کا مزا شروع میں میٹھا ہوتا تھا اور آخر میں وہ شہد اتنا تلخ اور اتنا کڑوا بن جاتا تھا کہ اس کو پی کر وہ تھوک دیا کرتا تھا، اس کی طبیعت متلا جایا کرتی تھی اور پھر ساری شیرینی اور ساری مٹھاس سے اس کو گھن آنے لگتی تھی ——۔ مگر عینی کے معصوم اور بے داغ لبوں پر ——— نسائیت کے شرمیلے حسن کا اک خمار تھا۔ اور گہری نیند میں سلا دینے والا ایک نشہ تھا۔ اکثر شام کی چائے لیے عینی اس کا انتظار کرتی رہتی، زاہدی کو دیکھتے ہی اس کی آنکھوں کا تقدس، اس کے لبوں کا خمار، اور اس کی پلکوں کے سائے تک مسکرا اٹھتے تھے۔ اور زاہدی کو وہ ننھا سا پیار ازل سے ہی اپنا منتظر نظر آتا تھا۔ وہ جتنی تیزی سے عینی کی طرف کھنچتا جاتا تھا۔ عینی کا مقام اس کی نگاہوں میں اتنا ہی بلند ہوتا جاتا تھا۔ عینی اس کے خیالوں سے بھی بالاتر تھی ——! وہ کسی فرشتے کی معصومیت تھی، وہ جنت کا ایک اچھوتا پیار تھی۔ وہ ایک ایسی وسعت تھی جس کا کوئی اندازہ نہ ہو سکتا تھا وہ ایسی بحر بیکراں بنی تھی جس کا کوئی ساحل نہ تھا، اور اس کا وجود

ہی محبت کا ایک مقدس راگ تھا۔ زاہدی نگاہیں بھر کے اس کو دیکھنے کی ہمت بھی نہ کر سکتا تھا۔ وہ عینی کی آنکھوں سے اپنی آنکھیں ملا کر بات کرنے سے اس لیے ڈر جاتا کہ اس کی روح کے دھبے کہیں اس کی آنکھوں میں ابھر نہ آئیں۔ اس کا ضمیر مطمئن نہ تھا۔ عینی کے آگے اس کو اپنے گناہوں کی تاریکیاں ہی تاریکیاں نظر آنے لگتی تھیں۔ آپ ہی آپ اس کے خیالات عینی کے ذرے ذرے سے وابستہ ہوتے چلے جا رہے تھے۔ اس کی انگلی کی ایک ایک پور میں اسی کی حیات کوند رہی تھی، اور عینی کے جسم میں تیرتے ہوئے خون کی سرخی نے رفتہ رفتہ زاہدی کے دل و دماغ میں یہ کیفیت بھر دی تھی کہ عینی کا جسم اور اس کی روح اس کے بالوں کی لہریں اور اس کی نگاہوں کا پیار سبھی کچھ تو زاہدی کا اپنا ہے۔ وہ اپنے بستر پر آدھی آدھی رات تک جاگتا رہتا، وہ اپنے آپ پر جھلاتا — کہ وہ ایک جھیل کے کنارے کھڑا اب تک پیاسا کیوں تھا؟ — وہ بزدل کیوں بن گیا تھا؟ — جو ابھی تک عینی کی انگلیوں تک کو پیار نہ کر سکا، اور وہ ہر روز کی طرح اپنے دل میں ایک نیا عہد کرتا — اور عینی کی یاد میں تکیہ کو اپنے بازوؤں میں بھینچ بھینچ لیتا۔ اسی تکیے کے اوپر وہ عینی کے ہونٹوں کا تصور چوستا رہتا۔ — اس کے گالوں کی صباحت اور سرخی کو پیار کرتا رہتا، وہ اس کی آنکھوں کی مقدس جھیل سے اپنی صدیوں کی پیاسی روح کو سیراب کرتا — اور پھر اس کو لگتا جیسے اس کے گناہوں کے سارے دھبے دھلتے جا رہے ہیں، مگر — اس کے لرزتے ہوئے ہونٹ تخیل میں بھی عینی کے ہونٹوں کو چومنے کے لیے جب بھی آگے بڑھتے وہ کانپ کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اس کے لبوں میں اتنی پاکیزگی کہاں تھی جو محبت کے اس جلتے ہوئے چراغ پر وہ اپنا ادھورا سا پیار بھی پیش کر سکتا، وہ غصے میں اپنے لبوں کو تکیے پر رگڑ دیتا۔ پھر اس ننھے سے چراغ کی لو میں وہ اپنے لبوں کو جلتا ہوا محسوس کرتا رہتا۔ اور نقلی رنگوں کے اندر سے جھوٹے شہد کی تلخی بھری مٹھاس اس کے لبوں پر سے پگھل پگھل کر گرنے لگتی تھی — اور جب اس جلن اور اس آگ میں سے ہو کر وہ باہر نکلتا تو سارے سطحی اور چھچھلے خیالات اس کے دماغ سے نکل جاتے اور وہ اس بات پر خوش ہو جاتا کہ عینی اس کی گناہوں بھری زندگی میں ایک چاند ہے، اور چاند کی پرستش ہی اس کے گناہوں کی تلافی کر سکتی تھی۔

زاہدی اپنی پچھلی زندگی سے بچھڑ کر رہ گیا تھا — اپنی وارڈ میں طنز بھری ہنسی کو وہ خاموشی سے سہہ لیا کرتا۔ مس جوزف کی آہوں اور آنسوؤں کی خبریں اس کو ملتی رہتی تھیں — مگر ان سارے مکر و فریب سے اب اس کا دل بھر چکا تھا — ! اس کی محفل اجاڑ ہو گئی تھی، اور اپنے دوستوں میں مجنوں کہلانے لگا تھا اور آدھی آدھی رات تک فلیش کھیلنے والا گروپ اب اس کے نام پر صبر کر چکا تھا۔ عینی کو اپنے کمرے کے اندر تھوڑی سی چلنے پھرنے کی اجازت مل گئی تھی، اس کے زخم کافی حد تک بھر چکے تھے مگر کمزوری اب تک باقی رہ گئی تھی، اب وہ اپنے کمرے میں اکیلی رہتے رہتے تھک گئی تھی، ڈیوٹی پر آتی ہوئی اسٹاف اور نرسوں کو پکڑ پکڑ کر وہ اپنے پاس بٹھایا کرتی۔ پھر بھی کوئی کہاں تک اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔ بار بار وہ اپنے ٹائم پیس کو دیکھتی جاتی، صبح چھ بجے سے شام کے چار بجے تک کا انتظار کرنا اس کے لیے بڑا کٹھن تھا۔ اور اتنا پہاڑ سا دن کٹتا کہ تب کہیں زاہدی اس کے پاس آیا کرتا تھا۔ اس کو دور ہی سے آتا ہوا دیکھ کر وہ پھولوں کی طرح نہال ہو جاتی اور اس کی معصوم آنکھیں خوشیوں سے جگمگا اٹھتیں۔ زاہدی سے جب وہ اپنے بھائی کی خیریت سن لیتی تو اس کو بڑا سکون مل جاتا تھا۔ ابھی تک وہ دونوں بھائی بہن ایک دوسرے سے نہیں مل سکے تھے۔

عینی اپنے بھائی، اپنے گھر، اپنے اسکول، اور کالج کی بہت سی باتیں زاہدی سے کیا کرتی تھی۔ اس کے بکس اور الماری میں کتنے جوڑے سوٹ تھے، اور کس کس رنگ سے اس کو پیار تھا وہ سب ہی کچھ زاہدی کو بتایا کرتی تھی، اس کی بہت سی باتوں میں

ابھی تک بچپنا جھلکتا تھا۔ اور یہی معصومیت اور سادگی زاہدی کو تڑپا تڑپا کے رکھ دیتی تھی۔ کہاں وہ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہوئے کھل کھیلا ہوا کھلاڑی۔ اور کہاں یہ اچھوتی، کومل سی کلی، زاہدی کا جی چاہتا کہ وہ اس معصومیت پہ نثار ہو ہو جائے۔ وہ ٹک لگائے اس کی خوبصورت دودھ جیسی شفاف پیشانی کو تکتا رہتا۔ اور اس کو محسوس ہوتا جیسے اس پیشانی کو فرشتے کوثر و سلسبیل سے دھویا کرتے ہیں۔

باتیں کرتے کرتے مینی یکدم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ یہ بھی آپ بھی نجانے مجھے کتنا بکواس کریں گے۔ پھر آپ ہی بتایئے کریں کیا کروں؟ سارا وقت اکیلی اور چپ۔ چپ سی رہتے رہتے میں تھک جایا کرتی ہوں، ایک سال پڑھتے پڑھتے میری آنکھوں میں درد ہونے لگتا ہے۔ یہ دیکھیے۔ گھڑی کا یہ کانٹا چھ کے ہندسے پر سے چار کی گنتی پر جب پہنچتا ہے تب کہیں آپ آتے ہیں۔ انتظار کا کتنا لمبا عرصہ مجھ کو گزارنا پڑتا ہے۔ اسی لیے تو جب آپ آتے ہیں تو میں اپنی خوشی کو چھپا نہیں سکتی۔ پھر وہ بڑے پیار سے اپنی آنکھیں زاہدی کے چہرے پر گاڑ دیتی —— میں جب بھی یہ سوچتی ہوں کہ آپ کبھی میرے گھر پر آئیں گے تو میرا دل خوشیوں سے جھوم اٹھتا ہے۔ میں آپ کو اپنے گھر کی ساری چیزیں دکھاؤں گی —— سب سے پہلے آپ میری ممی کی تصویر دیکھیں گے —— میری ممی! —— ممی بچاری۔ سنا ہے کہ وہ بہت ہی پیاری سی تھیں، بڑی اچھی سی! —— بولتے بولتے وہ اچانک اداس ہو گئی، اس کی آنکھوں کی جوت مدھم پڑ گئی اور لبوں پر ایک ٹھنڈی سی سانس آ کر رہ گئی، پھر اس نے اپنے مدھ بھرے نینوں کو دھیرے سے اوپر اٹھا کر زاہدی کو دیکھا۔ میں نے اپنی ممی کو کبھی نہ دیکھا۔ سنتی ہوں پپا جب علی گڑھ کالج میں پڑھتے تھے تو ممی کے گھر والوں سے ان کا بڑا دوستانہ تھا، ممی ان دنوں لکھنؤ کے کالج میں پڑھا کرتی تھیں۔ پپا نے ان سے اپنی پسند سے شادی کی تھی۔ ممی کا گھرانا آزاد تھا، اور پپا بہار کے رہنے والے تھے، پپا نے جب ممی سے شادی کرنی چاہی تو پپا کے گھر والے بڑے ناراض ہوئے، اسی غم و غصہ میں انھوں نے فوج میں ملازمت اختیار کر لی تھی، اور جب ان کو کمیشن مل گیا تب وہ ممی سے بیاہ کر کے ان کو اپنی نوکری پر ساتھ لے گئے تھے۔ بچارے پپا نے ممی کو بہت خوش رکھنا چاہا مگر ان کے خاندان کے لوگوں نے پپا کا بائیکاٹ کر رکھا تھا، کوئی بھی ملنے نہ آتا، پپا کو تو اس کی رتی بھر بھی پروا نہ تھی مگر ممی کو یہ بات بہت بری لگتی تھی اور وہ اتنی حساس تھیں کہ اس کو اپنی ذلت سمجھ کر ہر گھڑی کڑھتی رہا کرتی تھیں، آخر ان کی صحت خراب رہنے لگی، پپا بڑے فکر مند رہتے اور صرف ممی کی صحت کی خاطر انھوں نے رانچی میں ایک کوٹھی بنوائی، پھر بھی ممی میں گھن لگ گیا تھا وہ ان کو اندر ہی اندر کھوکھلا کرتا چلا گیا۔ بھیا جب پیدا ہوئے تب بھی ممی بیمار ہی تھیں —— پھر جب وہ ذرا سنبھلی ہی تھی کہ میں آ گئی، لیکن میری پیدائش کے بعد جو وہ کمزور ہوئیں تو پھر اچھی نہ ہوئیں۔ میں ایک ہی سال کی تھی جب ممی ہم لوگوں سے جدا ہو گئیں —— ابھی تک پپا جب بھی ان کا تذکرہ کرتے ہیں تو رو دیتے ہیں، وہ جو ہماری کوٹھی ہے نا رانچی میں —— اس کے ایک کمرے میں ممی کے جوتے، ان کی ساریاں، غرارے، سب ویسے ہی سجائے رکھے ہوئے ہیں۔ ممی کی بڑی بڑی رنگین تصویریں بھی اسی کمرے میں ٹنگی ہوئی ہیں۔ اور جانتے ہو؟ —— ممی کے سنہرے بالوں کی لمبی لمبی دو چوٹیاں بھی ریشمی رومال میں پپا نے بڑی حفاظت سے لپیٹ کر رکھی ہوئی ہیں۔ ممی کے برتھ ڈے اور شادی کی تاریخ کے دن پپا اسی کمرے میں بند ہو جاتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو ان کی آنکھیں سوجی ہوئی ہوتی ہیں —— ممی بچاری۔ نجانے کیسی ہوں گی!

مینی پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ایک دفعہ اسی کمرے میں الماری کی درازوں سے میں نے ممی کے کئی خط پڑھ لیے تھے۔ میں جانتی تھی کہ یہ کام میں اچھا نہیں کر رہی ہوں لیکن ممی کو جاننے بوجھنے اور سمجھنے کے لیے میرے پاس اس کے سوا اور کوئی صورت بھی تو نہ تھی۔ ممی کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ اور خط سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بہت ہی جذباتی قسم کی تھیں، ان کو پپا سے

بے پناہ محبت تھی، ممی کے مرنے کے بعد پپا کے گھر والوں نے ہم لوگوں کو اپنانا چاہا اور ملنے ملانے کی بہت کوشش کی لیکن پپا کا دل ان لوگوں سے بہت بیزار ہو چکا تھا، اسی لیے آج تک ہم لوگ اپنے وطن نہیں گئے۔ خاندان کے اکا دکا لوگوں سے بھی کبھار سیر راہے اجنبیوں کی طرح ملاقات ہو جاتی ہے۔ ممی کی دلی تمنا تھی کہ ان کے بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں، پپا بچارے تو ملازمت کے چکر میں پھنسے رہے، ہم دونوں بھائی بہن کو نونٹ کے بعد کالج میں علی گڑھ ہی چلے گئے، ننھیال کے لوگ بھی تھے اور ماموں وہاں کی تعلیم پسند بھی تھی، کالج کی ساری چھٹیاں ہم دونوں پپا کے ساتھ رہ کر ہی گذارتے ہیں۔ اس دفعہ گرمی کی چھٹیوں میں ایجی کا پروگرام بنا تھا، پپا بھی رخصت لے کر آنے والے تھے کہ یہ دیکھیے، آپ کے ہسپتال کا چکر لگ گیا؟ عینی باتیں کہتے کہتے ہنس پڑی۔

زاہدی بت بنا گھنٹوں، سحر زدہ سا، عینی کی باتیں سنتا رہتا، وہ ایک ٹک لگائے اس کی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا، دھیرے دھیرے مسکراتے ہوئے لبوں کی جنبشوں میں کھو سا جاتا تھا۔

(۳)

اور جب وہ رات کو سست قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹتا تو مسہری پہ پڑے پڑے اندھیرے کمرے میں اس کو اپنا گھر یاد آ جاتا ——— چھوٹے سے گاؤں میں مٹی اور کھپریل کا ایک دیہاتی سا مکان اس کی نگاہوں میں پھر جاتا جس کی بڑی بڑی اندھیری کوٹھریوں میں کوئی دریچہ نہ تھا اور جہاں سیلن کی بو ہمیشہ چھائی رہتی تھی۔ زاہدی نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گھر کے دروازے پر کوئی گائے بندھی دیکھی تھی جس کا محض رنگ بدلتا رہتا تھا۔ اس کو اپنا گاؤں اور اپنا گھر کبھی اچھا نہ لگا جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا بستی بھر کی پریشانیوں کو دیکھ کر اس کا دل کڑھنے لگتا تھا۔ سب کے چہرے مرجھائے مرجھائے سے، گردنیں جھکی جھکی سی، صبح اور شام، بس وہی گھسے پٹے روز کے پرانے ڈھنگ اور ایک طرح کی رٹی ہوئی باتیں، منگلے اٹنے سستے ہو گئے تھے کہ کسان، لگان ادا کرنے کے خیال سے کانپ اٹھتا تھا۔ زاہدی اس ماحول میں اکتایا اکتایا سا رہتا، اس چھوٹے سے گاؤں میں صرف اس کے چچا کا گھر ایسا تھا جہاں روز روز کے دلدّر نہ تھے، لال اینٹوں کا ایک مکان بھی انہی کا کچھ اچھا تھا۔ زاہدی کے باپ اور چچا کا مکان اتنا قریب تھا کہ چچا کی اونچی دریچی پر بیٹھ کر زاہدی کے گھر والوں سے بات چیت ہوتی رہتی تھی، اور اس طرح سے دونوں بھائیوں کے گھر کی پستی اور بلندی کا نظارہ بھی ہر گھڑی آنکھوں کے سامنے رہتا تھا۔ گاؤں میں جب بھی کوئی سرکاری افسر آ جاتا تو چچا کے اسی مکان سے گاؤں بھر کی عزت بچ جاتی۔ مگر چچا کی دولت جہاں سے پیدا ہو کر نکلتی تھی۔ زاہدی ہمیشہ اس گلی سے ناک بند کر کے بھاگتا ہوا گذرتا تھا، وہ کچے چمڑے کی کٹائی اور رنگائی کا کام کیا کرتے تھے، خوشحالی صرف چچا کے گھر میں آئی اور چمڑے کی سڑاندھ ساری بستی میں پھیلی رہتی تھی۔ اس دیہاتی ماحول، بیلوں، کھیتوں اور کھلیانوں کی بستی میں زاہدی ایک نرالا ذہن اور دماغ لے کر پیدا ہوا تھا۔ وہ بچپن ہی سے اپنی کتابوں کا رسیا تھا، پڑھنا اور پڑھتے رہنا بس اس کی یہی اک لگن تھی۔ گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی مسجد کے مکتب سے لے کر دو میل دور قصبہ کے اسکول تک سارے ماسٹر حیران کے اس لڑکے کی تیزی اور ذہانت پر حیران تھے۔ زاہدی کے باپ کو پڑھانے لکھانے کا کوئی خاص خیال نہیں تھا۔

وہ بچا رہے تو ہر سال اپنی کھیتی اور بیلوں کی تعداد میں اضافہ کرنا چاہتے تھے تاکہ دل میں چھپی ہوئی چانس ہمیشہ ایک ہی طرح سے کھٹکتی نہ رہ جائے، اور وہ بھی اپنے بھائی کے مقابلہ میں کچھ سمجھے جا سکیں۔

زاہدی گھر کی گائے کا خالص دودھ اور اپنے کھیت کے گیہوں یا ربیع کی موٹی موٹی روٹی کھا کر اسکول کا بستہ سنبھالے جب گھر سے نکلتا تو اس کی چال میں ایک شاہانہ پن آ جاتا تھا، وہ اپنے تین بھائی بہنوں میں سب سے بڑا تھا، اسی لیے اسکول سے واپس آ کر ہمیشہ باپ کی گھڑکیاں سننی پڑتی تھیں — "بابو صاحب، بڑے پڑھنے والے بنے ہیں۔ پاؤں میں بوٹ اور سر پہ انگریزی بال۔ ہونہہ! جیسے لاٹ کلکٹر بنے پھرتے ہیں" باپ کی باتوں کو سن کر کبھی کبھی زاہدی کی سیاہ گھنیری پلکوں پہ آنسوؤں کی شبنم چمک اٹھتی تھی۔ سگھر بھر میں زاہدی کو اپنی ماں سے بڑی محبت تھی۔ جو ہمیشہ اُپلوں کے دھواں سے تھکتے ہوئے آنچل تلے اپنے بیٹے کو بڑے لاڈ سے ڈھانک کر اپنے کلیجے سے لگا لیا کرتی تھی "میرا لال۔ لاٹ کلکٹر نہیں۔ ڈپٹی داروغہ تو بنے گا نا! دیکھو تو میرے بیٹے کی پیشانی سے کیسا اقبال کا ستارہ چمک رہا ہے" ماحول کے اتنے اندھیروں میں ممتا کی ہی ایک کرن تھی جو ہمیشہ اس کا راستہ صاف کر دیا کرتی تھی۔ ماں کی اسی محبت کے سہارے زاہدی کے دل میں ایک تازہ اُمنگ پیدا ہوتی اور گھر میں تنگیوں کے باوجود وہ اپنی تعلیم کو جاری رکھتا چلا گیا تھا۔ چچا کے گھر آنگن کے لوگوں سے روز ہی چھوٹی چھوٹی باتوں پر چخ چخ رہتی تھی۔ نشتروں پر نشتر لگتے رہتے تھے۔ چچا کی صرف ایک بڑی لڑکی اور ایک چھوٹا لڑکا تھا۔ کچے چمڑے کی تجارت سے جہاں وہ اپنے گاؤں میں پیسے والے کہے جانے لگے تھے وہاں دیہات سے باہر جا کر دنیا کی نیچ اونچ بھی وہ اچھی طرح سے جان چکے تھے۔

زاہدی نے قصبہ کے اسکول سے سیکنڈ ڈویژن سے جب میٹرک پاس کیا تو گاؤں بھر کو اس کی بڑی خوشی ہوئی۔ چچا تو پھر چچا ہی ٹھہرے دو بھائیوں کے بیچ میں ایک سب سے بڑا لڑکا تھا۔ چچا نے بھائی پر زور دے کر میلاد کا سارا انتظام اپنے ہاتھوں سے کیا۔ بھائیوں کے پیسے بھی سبھی دو ہوتے ہیں، قصبے کے حلوائی کے یہاں سے کئی پیتل کے تھالوں میں گرما گرم جلیبیاں آ گئیں۔ مردانے اور زنانے میں تمام لیپ پوت کر دری اور چٹائیاں بچھا دی گئی تھیں۔ گاؤں بھر میں، صبح سویرے ہی سے عید بقرعید جیسی چہل پہل لگ رہی تھی، گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے سر شام ہی کام بنی لال، پیلی اور گلابی مخمل کی میلی میلی ٹوپیاں پہنے اتراتے پھر رہے تھے۔ اور گھر کے اندر زمینداریاں گندھانے بچیاں اپنے سروں پر لہریئے اور ننھے ننھے رنگے ہوئے دوپٹے بڑے تقدس کے ساتھ بڑی آب و تاب سے اوڑھے پھر رہی تھیں۔ اندر اور باہر جب گیس کی روشنی چمک اٹھی تو زاہدی کے چچا کے گھر سے ایک ہی ساتھ دو سینیاں خوان پوش سے ڈھکی ہوئی آئیں۔ گاؤں کی ایک بوڑھی عورت نے خوان پوش اٹھا کر دیکھا۔ ایک سینی پر عمدہ قسم کی مٹھائیاں بھری ہوئی تھیں اور دوسری پر کالا تل تھا، ایک پیالے میں سرسوں کا تیل گوٹے سے سجا ہوا ایک امام ضامن اور ایک تعویذ دھرا ہوا تھا۔

گاؤں کی جو پاک صاف بڑھیا وہ سینی لے کر آئی تھی اُسی نے ڈوبتے ہوئے ہاتھوں سے زاہدی کو آنگن کے بیچ کھڑی چوکی پر بٹھا کر پہلے سرسوں کا تیل اس کی پیشانی سے چھوا کر تیل کی کٹوری کو سر کے گرد وارا اور پھر اس تیل کو زمین پر پھینک دیا، پھر باری باری ساری عورتیں چچا کے گھر سے آئے ہوئے کالے تل کو اپنے دونوں ہاتھوں کی چٹکیوں میں لے لے کر زاہدی سے لگاتیں اور اس کے سر کے گرد صدقہ کا پھیرا دے کر ان تلوں کو آنگن میں پھینکتی جاتیں۔ کئی عورتوں کے بعد جب زاہدی کی ماں بیٹے کا صدقہ اتارنے آئی تو اس کے چہرے پر طنز بھری ہنسی ناچ رہی تھی۔ کالا تل جب سب کا سب ختم ہو چکا تو سینی لانے والی بڑھیا نے زور سے بسم اللہ

کہہ کر زاہدی کے دائیں بازو پر امام ضامن باندھ دیا اور بڑے احترام اور عقیدت کے ساتھ تعویذ گلے میں پہنا دیا۔ "نوبی بی ــ اللہ جیتا جاگتا رکھے، چاندی سی بہو بیاہ کر لاؤ۔ اور دادا کا دونوں گھرا جیالا ہو گئے" زاہدی کچھ نہ سمجھا مگر اس کی ماں ساری باتیں بڑی آسانی سے سمجھ گئی تھی۔ ماں کے چہرے سے خوشیاں پھوٹی پڑ رہی تھیں۔ چھوٹے بھائی بہن بھی اپنے اچھے کپڑوں میں اترائے پھر رہے تھے۔ آج مٹی کے مکان میں، گائے بیل کے استھانوں والے گھر میں زاہدی چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ اور بلا تمناکے پیسے والے اونچے گھر کا کالا تِل اس گھر کے بیٹے پر سے نچھاور ہو رہا تھا۔ یہ اللہ ہی کی دین تھی۔ زاہدی کی ماں کا جی چاہا کہ وہ اپنے خدا پر سے صدقے ہو ہو جائے جس نے آج اس کو اتنی بڑی عزت دی تھی۔ اس بچاری کی کیا ہمت تھی؟ چاندی کے جو دو چار زیور تھے سب کے سب میاں کی چوری چھپے کب کے یک لخت کمر پڑھائی میں لگ چکے تھے۔ اب ہاتھ میں چاندی کا ایک چھلا بھی تو نہ رہا تھا ــــ بیٹے کو نظر بھر کر دیکھتے دیکھتے ماں نے ایک بار۔ اینٹوں کے لال رنگ والے پکے مکان کو دیکھا، اور مسکرا پڑی۔ اس کا بیٹا آج سچ مچ راجہ جیسا لگ رہا تھا۔ گھر کے اندر اور باہر میدان میں گیس کی روشنی چمک رہی تھی، گاؤں بھر کے لوگ اُمنڈے چلے آ رہے تھے، ان کے قدموں کی آہٹ اور ملی جلی باتوں کی گونج گھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ گھر کے اندر لال پیلی ہری اور قسم قسم کی ساریوں میں دیہات کی عورتوں کا ایک میلہ سا لگا ہوا تھا، جو کھڑکی اور دروازے پر ہجوم لگائے، بڑی بے تابی سے باہر کی رونقیں دیکھ رہی تھیں۔ میلاد اب شروع ہونے والا تھا۔ اگر کی بتیوں اور لوبان کی خوشبو ہر طرف پھیلتی جا رہی تھی ــ اور در و دیوار پر احترام کا سایہ چھانے لگا تھا۔

اسی میلاد والے دن سے دونوں بھائیوں کے دل مل گئے تھے۔ زاہدی کے چچا نے بڑے خلوص سے بھائی سے آ کر کہہ دیا کہ "زاہدی کے پڑھنے لکھنے میں جتنا بھی خرچ ہو گا وہ میں ادا کروں گا" بڑے بھائی نے آگے بڑھ کر امیر بھائی کو گلے سے لگا لیا۔ اپنا پھر اپنا ہی ہوتا ہے۔

زاہدی بڑے شوق اور انہماک سے پاس کھڑا بھائیوں کے ملاپ کا یہ تماشا دیکھتا رہا۔ بچپن ہی سے چچا کے گھر کی اونچی حیثیت اور بڑائی کا اس پر بہت اثر تھا۔ چچا کی محبت بھری باتوں کو سن کر مارے خوشی کے اس کا دل جھومنے لگا تھا، گاؤں بھر کا سب سے بڑا آدمی اس کا چچا تھا اور وہی چچا اس وقت زاہدی کو اپنی آنکھوں سے لگا رہا تھا۔ زاہدی کو سب سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ چچا کے اس خلوص سے وہ اپنی تعلیم کو قائم رکھ سکے گا۔ زاہدی کو کالج میں پڑھنے کا بے حد شوق تھا۔ آج تک اس نے شہر کی صورت نہ دیکھی تھی۔ دادھیال، ننھیال سب ہی آس پاس دیہات ہی دیہات تھے۔

بچپن ہی سے زاہدی بڑا حساس تھا، میلاد کے بعد جب اس کے گھر میں بڑے آدر مان سے آمنہ کا تذکرہ ہونے لگا تب وہ چچا کی محبت اور اخلاص کی وجہ کو سمجھ سکا۔ زاہدی کے لیے دنیا کی ساری لڑکیاں بس ایک ہی طرح کی تھیں، اس کو کسی لڑکی سے کوئی خاص لگاؤ نہ تھا، پھر بچارے کی اڑان ہی کیا تھی! گاؤں بھر کی سب سے پیسے والے گھرانے کی لڑکی آمنہ خود بخود اس کی زندگی میں آ رہی تھی ــــ زاہدی کو آمنہ کی بڑی بڑی شوخ آنکھیں بہت پسند تھیں۔ سانولے رنگ کی نمکین صورت پر اس کے گداز ہونٹ بڑے جاندار اور رسیلے نظر آتے تھے۔ مگر آمنہ کی ناک میں چاندی کی ڈولتی ہوئی گول نتھنی سے اس کو ہمیشہ سے نفرت تھی، ناک میں وہ ڈولتی ہوئی نتھنی گاؤں کی کنواری لڑکیوں کی عفت مآبی کی نشانی سمجھی جاتی تھی ــــ زاہدی کا اگر بس چلتا تو وہ چاندی کے اس تار کو نوچ کر

بھینک دیتا۔ آمنہ کی ساری ملاحت چاندی کی ایسی گول ٹھنٹی نے خاک میں ملا کر رکھ دی تھی۔ زاہدی سے اب آمنہ کا ہلکا سا پردہ ہو گیا تھا۔ مگر کبھی کبھی گل مہندی والے بھاری بھرکم دروازے کی اوٹ سے وہ چھپ چھپ کر اس کو دیکھ کے مسکراتی، اور مسکرا مسکرا کر چھپ جاتی تھی۔ کبھی وہ اپنے گھر کی دریچی پر بیٹھی زاہدی کے آنگن کو تکتی اور زاہدی کی آہٹ پا کر غڑاپ سے نیچے کو مڑ جاتی۔ زاہدی کا بچپنہ بڑی معصومیت میں بیتا تھا وہ ایک لڑکی کی اس آنکھ مچولی کو پورے طور پر سمجھ بھی نہ سکتا تھا۔

(۴)

دو چار جوڑے اچھے کپڑوں کے ساتھ وہ سائنس کالج میں داخلہ لینے پٹنہ آ گیا، دریائے گنگا کے اس پار بہت دور اس کا چھوٹا سا گاؤں پیچھے چھوٹ گیا تھا۔ جہاز پر چڑھنے کا یہ اس کا پہلا موقع تھا، ساری چیزوں کو دیکھ دیکھ کر اس کی نگاہیں حیران ہوئی جاتی تھیں مگر اس کا دل خوشی سے کھلا جا رہا تھا۔ جہاز سے گنگا کو صرف پار ہی کرنا تھا، برسات کے دن تھے امنڈی ہوئی گھٹائیں ہر طرف چھا رہی تھیں، زاہدی جب دوسرے کنارے پر جہاز سے اترا تو گنگا کے کنارے کنارے بسا ہوا شہر اس کو بہت اچھا لگا۔ ویسے تو شہر اور شہر کی ساری چیزوں کو دیکھ کر وہ حیران ہو تا رہا تھا مگر سائنس کالج کی شاندار عمارت اور اس کی عظیم الشان لیبارٹری کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اب تک اس نے شہر کے بارے میں جتنی باتیں لوگوں سے سنی تھیں یہاں آ کر وہ اس کو کھیل تماشے کی طرح لگنے لگیں۔ وہ شہر کے ہنگاموں اور بھاگ دوڑ سے گھبرایا سا رہتا تھا مگر ساتھ ہی اس کو خوشی ہوتی تھی کہ اس کے گاؤں جیسا یہاں تنگ ماحول نہیں تھا۔ زاہدی پہلی بار اپنے گھر اور اپنی ماں سے جدا ہوا تھا، کئی دنوں تک اس کا دل اڑا اڑا سا رہا، خیالات بھلے بھلے سے رہتے مگر وہ اپنے آنسوؤں کو پیتا رہا، اور اپنے آپ سے لڑتا رہا تھا۔ دیہات سے پہلے پہل شہر میں آنے والے لڑکوں پر جو کچھ دنوں تک بیتتی ہے زاہدی اپنے آپ سے اس کیفیت کا اظہار کرانا نہ چاہتا تھا۔ ہوسٹل میں رہنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہ تھے۔ وہ اپنے چچا کے ایک ملاقاتی کے گھر پر ٹھہرا ہوا تھا، جن کو چچا نے دستی خط بھیجا تھا کہ زاہدی کو کسی ایسے گھر میں رہنے کا انتظام کر دیں جہاں رہنے اور کھانے میں زیادہ خرچ نہ ہو — کئی دنوں کی دوڑ دھوپ کے بعد ایک بیوہ کے مکان میں چار روپیہ مہینہ دے کر ایک کوٹھری میں رہنے کا سامان ہو گیا، مگر کھانے کی مصیبت سر پر پڑی تھی۔ مکان کی مالکہ بڑھیا بیوہ بڑی مشکلوں سے اس پر تیار ہوئی کہ وہ اپنے لیے نے کے ساتھ زاہدی کا کھانا بھی پکوا دیا کرے گی۔ چچا کے دوست نے مطمئن ہو کر زاہدی کا بکس اور بستر بیوہ عورت کے گھر پہنچا دیا اور زاہدی نے خدا کا شکر ادا کیا، اتنے بڑے شہر میں اتنا سہارا بھی کوئی کم نہ تھا۔ مکان کی مالکہ کی خود اپنی رہائش اوپر کی منزل پر تھی، نیچے کا سارا حصہ کرائے پر لگا ہوا تھا۔ زاہدی کے لیے ایک کوٹھری بڑھیا نے اپنی طرف سے دے دی تھی۔

جس گھڑی، زاہدی اس پرانے گھر میں نیا نیا کرایہ دار بن کر آیا تو بڑھیا بن بلائے خود ہی اس کے سامنے آ گئی اور زاہدی کی کوٹھری اپنے سامنے صاف کرانے لگی۔ ایک چوکی پر زاہدی کا بستر بچھوا کر بڑھیا نے اپنے کمرے کے اندر سے ایک پلاسٹک کی میز اور اسی ڈھنگ کی ایک کرسی بھی کوٹھری میں رکھوا دی۔ اور واپس جاتے جاتے ذرا سا ٹھٹک کر بولی۔

"بیٹا، اپنی اس کوٹھری میں ایک صراحی اور گلاس بھی رکھ لو، گھڑی گھڑی پانی پینے کو کہاں جاؤ گے؟ اور بار بار ملنے نہ میں ایک ہی ہے تم کو جب ضرورت ہو تو نوکرانی کو پکار لو۔ پردہ ہو جائے گا۔ تمہارے چچا کے یہ دوست مجیب میاں وقت پر کام آتے رہتے ہیں، اسی لیے میں ان کی بات کو ٹال نہ سکی، اور تم کو اپنے پاس بلا لیا۔ بیٹا زمانہ بہت خراب ہے جوان لڑکی جہاں پر رہتی ہے وہاں کی زمین بوجھ سے دھنسی

رہتی ہے۔ بڑا پھونک پھونک کے قدم دھرنا پڑتا ہے۔ ہاں ذرا کھنکار کر اندر آیا کرو۔

پہلی بار۔ اس پرانے مکان کے ایک تنگ سے برآمدے میں زاہدی کو احساس ہوا کہ اب وہ جوان ہو گیا ہے۔ اپنی آواز کی تبدیلی اور بھاری پن تو وہ بہت پہلے سے جان چکا تھا۔ ایک بار اس کی ماں نے بھی کہا تھا کہ "تیرے گلے میں گھنڈ پھوٹ گیا ہے مگر تو ابھی تک بچے کا بچہ ہی ہے"۔ اس اکیلی اجنبی کوٹھری میں زاہدی بہت دیر تک اپنے بستر پر لیٹا لیٹا اپنی جوانی کے آنے کی خوشی میں چپکا پڑا مسکراتا رہا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں جھپکتی رہیں، اور گھنی پلکیں بار بار جھپکتی رہیں۔ اس کے سانولے چہرے پر خون کی تمتماہٹ دوڑتی رہی اور کانوں میں سیٹیاں سی بجتی رہیں۔ وہ دیر تک طرح طرح کی باتیں سوچتا رہا۔ وہ دیہات کی کھلی ہوئی آزاد فضا میں پلا ہوا ایک گبرو لڑکا تھا بھلا اب وہ کہاں جاتا۔

بڑی سوچ بچار کے بعد زاہدی نے اپنے ضمیر سے سمجھوتہ کر لیا کہ وہ کچھ دنوں تک یہاں رہ کر کسی دوسرے گھر میں چلا جائے گا اور ٹیوشن ملنے کی امید میں بہت سی آرزوئیں اس کے دل میں پلتی رہیں۔ مگر اسی کوٹھری میں پھر وہ رس بس گیا۔ اس نے بڑے سلیقے سے اپنی کتابیں دیوار کی الماری میں سجا دیں۔ بلا وارنش کی ٹیبل پر ایک میز پوش خرید کر بچھا دیا اور بڑھیا مالکن کی تاکید سے ایک صراحی بھی لے آیا جس کو شیشے کے موٹے اور بھدے گلاس سے ڈھانک کر کوٹھری کے ایک کونے میں رکھنے لگا۔ اس کوٹھری میں مچھروں کی ایک فوج آباد تھی۔ گائے بیل کے گوبروں اور بدبو کا تو وہ بچپن سے عادی تھا مگر یہ ڈنک مارتے ہوئے مچھر اس کے لیے بلائے بے درماں بن گئے تھے۔ بیزار وہ اپنی چادر سے لپٹ لپٹا کر سوتا مگر راتوں کو وہ اٹھ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ سارے چہرے اور جسم میں چیچک جیسے، اور پتلے دانے ابھر آتے تھے۔

ایک دن جب وہ پکار اور کھنکار کر اندر جانے لگا تو چھت پر پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ "خالہ، یہاں تو بے انتہا مچھر ہیں، رات رات بھر جاگتا رہتا ہوں۔ پڑھ بھی نہیں سکتا۔ بتائیے کیا کروں؟" اس کی آنکھیں بڑی اداس ہو گئیں۔ اس کا خیال تھا کہ بس ایسی چھوٹی سی کوٹھری میں مچھروں نے بسیرا لیا ہے، اور جگہ ان مچھروں سے محفوظ ہو گی۔

اچانک کمرے کے اندر سے ہنسی کی کھنکتی ہوئی دبی دبی سی آواز سنائی دی۔ بڑھیا بھی زاہدی کی اس معصومیت پر مسکرا پڑی۔

"یہ اپنے شہر کا ایک عذاب ہے بیٹا۔ گنگا کا کرم ہے اور کیا کہوں۔ پٹنے بھر میں یہی مصیبت چھائی ہوئی ہے۔ کیا کرو گے، مسہری کا ایک پردہ خرید لو۔ اور پڑھنے کے لیے مچھر بھگانے والا ہرے رنگ کا جلیبیوں والا پیکٹ لیتے آنا۔ شام کے شام میں تمہاری کوٹھری میں دھونا، لوبان، اور گندھک جلوا دیا کروں گی، بس تھوڑا سکون مل جائے گا۔"

کمرے کی بدرنگ ٹوٹی ہوئی جھلملیوں والے کواڑ سے ٹکرا ٹکرا کر آنے والی ہنسی نے زاہدی کے رگ و پے میں بجلی کی لہر دوڑا دی تھی۔ بڑھیا کہتی ہے کہ جوان لڑکیوں کے بوجھ سے زمین دھنسی رہتی ہے، مگر یہاں تو اتنی پرانی چھت بھی جوں کی توں کھڑی تھی، زاہدی نے دل ہی دل میں سوچا اور رات گئے تک نئی مچھردانی کے اندر لیٹا لیٹا وہ اس ڈھکی چھپی ہنسی کا مزہ لیتا رہا۔ اس کے ساتھ ہی اس کو آمنہ بھی یاد آتی رہی۔ آمنہ کی بڑی بڑی آنکھیں یاد آتی رہیں۔ مگر جب آمنہ کے موٹے موٹے رسیلے ہونٹوں پر چاندی کی ڈلی ہوئی نتھنی اس کو یاد آ جاتی، تو پھر آمنہ کی ساری یاد بدمزہ ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس نے اپنے خیالوں سے آمنہ کی یاد کو جھٹک دینا چاہا۔ اور اسی ٹوٹی ہوئی بدرنگ جھلملی والے کواڑ کے پیچھے چھپی ہوئی ہنسی کو یاد کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ نئی مچھردانی سے باہر مچھروں کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی رہی اور زاہدی کی آنکھیں دھیرے دھیرے نیند سے بند ہوتی چلی گئیں۔

وہ اپنی محنت اور ذہانت سے سائنس کالج کے اچھے لڑکوں میں شمار ہونے لگا تھا۔ قریب قریب اس کو دو ٹیوشنیں بھی مل گئی تھیں جن سے بڑا سہارا ہو گیا تھا۔ چچا کے یہاں سے تو بس گنے چنے ہی روپے آتے تھے۔ کبھی کبھار دس بیس روپے باپ کے یہاں سے بھی آ جاتے۔ اپنی ٹیوشن کے چالیس روپوں سے اب وہ اپنے آپ کو فلیشن ایبل لڑکوں میں اٹھنے بیٹھنے کے قابل بنا سکا تھا۔ دو مہینوں کے روپے جوڑ کر اور درزی کی سلائی کا اُدھار کر کے وہ پہلی بار جو کلٹ رنگ کا سوٹ پہنے جب آئینہ کے سامنے ٹائی باندھنے لگا تو خود اپنا رنگ روپ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ سر پر فلیٹ ہیٹ جما کر اپنی کوٹھڑی میں تالا لگاتے لگاتے اُس نے سوچا کہ اگر اس سج دھج میں اس کے گاؤں کا کوئی آدمی اس کو دیکھ لے تو بھی پہچان نہ سکے گا کہ یہ وہی زاہدی ہے۔ وہ اپنے آپ سے خوش ہوتا ایک خاص پوز سے برآمدے سے نیچے اُترنے کو زینے کی طرف مڑا، تو سامنے ہرے رنگ کی بدرنگ سی چلمن کے اندر سے مہندی لگی انگلیوں کے پور دکھ رہے تھے اور کاجل لگی بڑی بڑی آنکھیں جھپک جھپک کر بڑے ارمان سے جھانک رہی تھیں۔ زاہدی مسکرایا، اور اپنی چابیوں کی لمبی زنجیر کو بڑی بے پروائی سے گھماتا ہوا زینے پر سے نیچے اترتا چلا گیا۔ آج اس کا سوٹ بڑا مبارک ثابت ہوا تھا ———— مگر اس کو پھر خیال آگیا کہ بڑھیا کی یہ پرانی چھینٹ شاید اب جلد ہی دھنسنے والی ہے۔ زاہدی اپنی کلاس میں بھی ان انگلیوں کے لال لال نازک پوروں اور کاجل لگی آنکھوں کو بھول نہ سکا۔

پڑھتے پڑھتے جب وہ تھک جاتا تو اکیلی کوٹھڑی میں شرارت کرنے کو اس کا جی چاہنے لگتا تھا جب تک تھکن کو دور کرنے والا سرور حاصل نہ ہوا کرے بھلا کوئی انسان کیا ترقی کر سکے گا۔ زاہدی یہ سوچ کر مسکراتا اور دستک پر دستک دے کر اپنی بڑھیا مالکن خالہ کے پاس پہنچ جاتا۔ گھر سے آتے ہوئے درجن بھر انڈے، خالص گھی کی لٹیا اور کبھی مکئی اور لونٹ کے ستو کا تحفہ پیش کر دیتا۔ بڑھیا دیہات کی ان خالص چیزوں کو دیکھ کر کھل اٹھتی۔ ”شہر کی زندگی میں بھلا یہ چیزیں کہاں سے نصیب ہوتیں۔ خالہ بچاری تو اب گھل گھل کر خاک ہو چکی تھیں، اُن کے میاں پیشکار تھے۔ اور اسی پیشکاری کی کمائی سے انھوں نے بنا بنایا ہوا یہ مکان خرید لیا تھا۔ دو دو بیٹے ہوئے تو کیا ہوا۔ بس نام ہی نام تھا دنیا میں آنے کا۔ ایک تو بچارہ معصوم آیا اور معصوم ہی چلا گیا، دوسرے کی یادگار ایک لڑکی خالہ کے پاس رہ گئی تھی۔ غریب کو باپ کی صورت بھی یاد نہ تھی۔ اب دو سال ہوئے ماں بھی اللہ کو پیاری ہو گئی۔ اوپر اللہ۔ اور نیچے ایک بڑھیا دادی کے سوا اور کون تھا اُس کا؟۔ اب اللہ۔ اُس کا نصیبہ کھول دے کہ اپنے گھر بار کی ہو جائے“۔ خالہ کی بپتا نے زاہدی کا دل سچ مچ ہی دکھا دیا تھا۔ وہ بچاری اپنے گھر کے ایک حصے میں سر چھپائے بیٹھی تھیں اور باقی مکان کے سارے حصوں میں کرایہ دار آباد تھے اور انہی کرایہ کے پیسوں سے بڑھیا اپنی گزر بسر چلا رہی تھی۔

زاہدی کے دل میں اس گھر کے لئے ہمدردی اور احترام کا ایک جذبہ ابھر گیا۔ جو پڑا نا ہو کر کئی طرف سے جھول گیا تھا۔ جس کی جھلمیاں ٹوٹ ٹوٹ کر لٹک گئی تھیں۔ اور جس کی دیواریں کئی جگہوں سے تڑخ گئی تھیں۔ کئی دنوں تک آتے جاتے ہوئے اُس نے اپنی نگاہوں کو جھکائے رکھا۔ کواڑوں کے پیچھے چوڑیوں کی کھنکھناہٹ سنائی دیتی رہی، چلمن اٹھنے اور گرنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آتی رہیں مگر زاہدی اپنے آپ سے لڑتا رہا۔

گھن کھایا ہوا جھلملی کا ڈنڈا احسانی پوروں کا بوجھ زیادہ دنوں تک برداشت نہ کر سکا۔ جھلملی کے پردوں کو اوپر نیچے کرنے والا ڈنڈا آخر ایک دن چٹخ کر ٹوٹ گیا جھلملی کے ایک دو پٹے بھی ساتھ ہی اکھڑ گئے تھے۔ کالج سے آتے جاتے، اور کبھی شام کی سیر یا ٹیوشن کے لئے جاتے ہوئے، غیر ارادی طور پر، گورے طباق سے پُرکشش چہرے کی جھلکیاں اب بار بار دکھائی دے جاتی تھیں۔ کبھی ہنستا ہوا چہرہ، کبھی تکتی ہوئی آنکھیں، اور کبھی بھنچتے جاتے بے قرار سے ہونٹ "کیا وہ لڑکی ہر گھڑی اسی کے انتظار میں اپنا وقت گذارتی تھی؟" زاہدی کا جوان دل اکیلی لڑکی کی تنہائی پر پسیجنے لگا۔ برآمدے میں سے آنکھیں چراتے جب وہ اپنی کوٹھری میں پہنچتا تو اس کے دل میں خوشی کے لڈو پھوٹتے رہتے تھے۔ یکایک زاہدی کی آنکھیں ہمک اٹھیں لبوں میں بڑی لطیف گدگدی ہونے لگی تھی اور آپ ہی آپ اس کی سانس گرم گرم ہو کر تیز چلنے لگی تھی۔ اسی چھوٹی کوٹھڑی میں لیٹے لیٹے اس کا جسم یکبارگی ٹوٹنے لگتا۔ اور کبھی کبھی بڑی بیتابی سے اس کا جی چاہنے لگتا تھا کہ وہ ان کاجل لگی جھانکتی ہوئی آنکھوں کو قریب سے دیکھے، ان رس سے بھرے ہوئے لبوں اور چمکتے ہوئے رخساروں کو اپنی انگلیوں سے چھو کر دیکھے مگر وہ بے بسی کے عالم میں اپنی کوٹھری کا دروازہ دھڑاکے سے بند کر کے اپنے بستر پر گر جایا کرتا تھا اور دیر دیر تک چوکی پر پڑا پڑا تکئے کو کلیجے سے بھینچ بھینچ لینے پر بھی اس کو تسکین نہ ملتی تھی۔

بھرے بھرے جسم والی آمنہ جو آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کیا کرتی تھی، اس کو دیکھ کر کبھی بھی اس کی ایسی حالت نہیں ہوئی تھی۔ پھر اب اس کو کیا ہوتا جا رہا تھا؟۔ اس کے سارے جسم میں یہ بجلیاں کہاں سے بھر گئی تھیں؟ رہ رہ کر اس کی نگاہوں کے سامنے یہ ستارے سے کیوں چمک اٹھتے تھے؟۔ زاہدی گھنٹوں اپنے آپ کو سمجھنا چاہتا مگر اس کا وجود خود اس کے لئے ایک اجنبی کی طرح لگتا تھا، اور اپنی ہستی الجھے ہوئے دھاگوں کی طرح نظر آتی تھی جس کا کوئی اور چھور سمجھ میں نہ آتا تھا —— اور پھر اس نے تھک ہار کر اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا، ڈوبے یا سنبھلے، وہ اپنی جیون کی کشتی کا پتوار بھرے دریا میں پھینک کر ایک تماشائی بنا بیٹھا تھا۔۔۔

دھیمی دھیمی آواز سے چرچراتے ہوئے کواڑ دھیرے دھیرے کھلنے لگے، زاہدی اب اس لڑکی کی قد و قامت کے ساتھ اس کے لباس کی رنگت کو بھی دیکھنے لگا تھا۔ ایک دن اچانک کاغذ کی ایک موٹی سی پڑیا اس کے آگے دھپ سے آ کر گری۔ زاہدی نے جھک کر اٹھا لیا سفید پانوں کی گلوریاں چاندی کے ورق سے لپٹی ہوئی تھیں، زاہدی نے کمرے کے بھڑے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا۔ اور مسکرا کر سلام کرتے ہوئے ایک ہی دفعہ کئی گلوریاں منہ میں ڈال لیں۔ پان کی خوشبو اور الائچی کے دانوں سے اس کا دماغ معطر ہو گیا تھا اور زاہدی کو اچانک ایسا لگا جیسے مہندی لگے پوروں کی انگلیوں کو وہ بے تحاشا چومے چلا جا رہا تھا۔

زاہدی کے دل و دماغ پر ایک نشہ سا چھایا رہنے لگا۔ سفید معطر پانوں کی گلوریاں کھا کھا کر وہ کئی دنوں تک جھومتا رہا۔ اور سہگل کے گانے آپ ہی آپ اس کے لبوں پر لہرانے لگے تھے۔ چلمن کے اٹھنے اور گرتے ہوئے پردوں میں رفتہ رفتہ اس کی ساری دنیا سمٹ کر آ گئی تھی، جس دن کاجل لگی شوخ آنکھیں اس سے اشارے اشاروں میں باتیں نہ کرتیں، وہ سارا دن کھویا کھویا سا رہتا، ایک عجیب انجانی کیفیت اس پہ چھائی چلی جا رہی تھی اور ایک سرور کے عالم میں اس کا یہ جی چاہتا تھا کہ وہ کسی کو اپنی مضبوط باہوں میں بھینچ لے، اپنے دھڑکتے ہوئے سینے میں چھپا لے، اور اپنے ان سلگتے ہوئے لبوں کی آگ کو وہ کسی طرح سے ٹھنڈا

گرے، اس گھر میں آکر اس کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ اپنے کھوئے ہوئے وجود کو پانا چاہتا تھا، مگر اس کی گرم گرم سانس اس کو کسی بھٹی میں جلائے جا رہی تھی، اور وہ بیچارگی کے عالم میں تکیے کو سینے سے چمٹا لینے کے سوا اور کیا کر سکتا تھا؟۔

اتوار کا سارا دن وہ اپنی کوٹھری میں لیٹا لیٹا پڑھنے کی کوشش کرتا رہا، مگر اندر سے بار بار سلمٰی کی پکار دی جانے والی آواز اس کی آنکھوں کے نیچے سلمٰی کی جیتی جاگتی چلتی پھرتی تصویر کھینچ کر رکھ دیتی تھی جو اسی چھت پر چل پھر رہی تھی ہنس بول رہی تھی اس کی کاجل لگی آنکھوں کا خمار اسی بوسیدہ مکان کے کونے کونے پر چھا رہا تھا۔ وہ اپنی حنائی انگلیوں سے اسی گھر کے کام کاج میں لگی ہوئی تھی۔ سلمٰی! کتنا پیار میں ڈوبا ہوا نام تھا ——— "سلمٰی ——— سلمٰی" کاش وہ اس کو جی بھر کے دیکھ سکتا، اس کو چھو سکتا، اس کی مہندی لگی انگلیوں کو چوم سکتا، زاہدی اپنے لحاف کے اندر تڑپنے لگا۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں، وہ اپنے بستر پر ٹھہر نہ سکا، اور ایک ہارے ہوئے جواری کی طرح سر جھکائے، کپڑے پہن کر اپنی کوٹھری میں تالا لگا کر باہر چلا گیا۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور چہرہ خون کی تمتماہٹ سے انگارے کی طرح دھک رہا تھا۔

سلمٰی کی ٹوٹ کر چھائی ہوئی جوانی پر، بڑھیا سانپ کی طرح کنڈلی مارے بیٹھی ہوتی تھی، جہاں جاتی ساتھ لئے جاتی باہر برآمدے کی طرف کھلنے والے کواڑوں کو وہ اپنے خیال میں ہر گھڑی بند رکھا کرتی تھی۔ مگر جب بھی سلمٰی کو موقعہ ملتا چپکے سے دبے پاؤں آکر کواڑ کی جھلملی سے لگ کر زاہدی کو جھانکنے لگتی، قبر خانے کی تیلیوں سے ٹکرانے کی آس سے ایک عادت سی ہو گئی تھی، اور اب تو گلشن میں بہار کے جھونکے آنے لگے تھے! اور زاہدی کی خوشبو سے اس کا اجاڑ کمرہ بھی مہک اٹھا تھا۔ بڑھیا جب بھی غسل خانے جاتی یا نماز پڑھنے لگتی، سلمٰی کے لئے وہ موقعہ بڑا غنیمت ہوتا۔ اس لڑکی کے جسم میں خون تیزی سے دوڑنے لگا، اس کی آنکھیں ہر گھڑی چمکتیں اور اس کی بوٹی بوٹی تھرکتی رہتی تھی، مہینوں اسی طرح دبی دبی چنگاری لئے تاکا جھانکی میں گذرتے چلے گئے تھے۔ برسات کی امنڈتی ہوئی گھٹائیں برس برس کر چلی گئیں، گلابی سردی، کڑاکے کی سردی میں بدل گئی، مگر سلمٰی بند کواڑوں کے پیچھے صرف مسکرانی رہ گئی بس کبھی پان کی گلوریاں کاغذ میں لپٹی ہوئی زاہدی کو مل جاتیں جس میں صرف پیار بھرا مختصر سا "سلام" لکھا رہتا، اور کبھی کبھی جھلملی سے مہندی لگے ہوئے پوروں کو زاہدی کی مردانہ انگلیاں چپکے سے پکڑ لیا کرتیں اور اس دھیرے سے پکڑا دھکڑی میں ان کے سارے جسم میں بجلی کی لہریں دوڑ جایا کرتی تھیں۔ اور پھر وہ حالات کی نزاکتوں کو سمجھتے ہوئے بڑھیا کے ڈر سے اپنی گرم گرم سانسوں کو جھیلتے ایک دوسرے سے دور ہو جایا کرتے تھے۔

سلمٰی بیمار تھی، زاہدی نے بھی سنا کہ سلمٰی بیمار ہے، اس کی خالہ نے اس کو دروازے پر کئی دفعہ پکار کر اس سے سلمٰی کے لئے نورانی دواخانہ سے جوشاندہ اور انگریزی ڈسپنسری سے یوکلپٹس کی تیز خوشبو والی اسپرٹ منگائی تھی، جھلملیاں سونی پڑی تھیں بس کبھی کبھی یوکلپٹس کی مریضانہ خوشبو کا جھبکا زاہدی کی کوٹھری میں بھی پہنچ جاتا تھا۔ کئی دن بیت گئے سلمٰی گلے میں رومال لپیٹے پڑی رہی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے سردی سے سوجے سوجے سے لگتے تھے۔ چہرے پر گیندے کے پھول جیسی زردی چھا گئی تھی، اور لبوں کی لالی میں ہلکا پن آکر پپڑی سی جم گئی تھی۔ خالہ پریشان پریشان سی تھیں، حکیم اور ڈاکٹر کے بنا ان کی بچی اچھی ہوتی نظر نہ آتی تھی۔ گھر کے اندر کام کاج کے لئے بس ایک ہی نوکرانی تھی۔ اور باہر مردانہ صورت میں کوئی بھی نہ تھا، بڑھیا نے زاہدی کو اپنے پاس یہی سمجھ کر تو رکھا تھا کہ ضرورت پڑنے پر ایک مرد کی ڈھارس بندھی رہے گی۔

شہر میں کوئی اپنا رشتہ دار ایسا نہیں تھا جو کہ آڑے وقت پر کام دیتا۔ سارے عزیز اقارب دیہات میں بکھرے پڑے تھے۔ بڑھیا بچاری میاں کے مرنے کے بعد سے اپنی روزی خود کما کھا رہی تھی۔ اگر پٹنہ میں رہ کر وہ اپنے گھر کی دیکھ بھال خود سے نہ کرتیں تو اب تک یہ مکان کب کا گر چکا ہوتا، اسی لئے بچاری میاں کی اپنی کمائی کی ڈیوڑھی آباد کئے عزت آبرو کے ساتھ اپنے دن کاٹ رہی تھیں۔ ایک دن اچانک دوسرے محلے میں کسی جان پہچان کے یہاں موت ہو گئی خالہ دھک سے رہ گئیں وہاں جانا بھی ضروری تھا مگر سلمیٰ کی بیڑی پاؤں میں پڑی تھی۔ انھوں نے سلمیٰ کو کئی بار دیکھا مگر وہ کمرے کے اندر بیمار پڑی ہوئی تھی۔ ساتھ لے جانے کا تو کہیں پر سے سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ سلمیٰ کی دادی نے دروازے پر جا جا کر کئی دفعہ زاہدی کی تالا لگی کوٹھری کو غور سے دیکھا، اور جب انھیں یقین ہو گیا کہ وہ سچ مچ میں بند ہے تب وہ آہستہ سے سلمیٰ کے قریب آئیں اس کی پیشانی کو چھوا، بخار اتر گیا تھا، نقاہت باقی تھی، وہ پلٹ پلٹ کر سلمیٰ کو دیکھتی رہیں، باہر برآمدے میں جھانک جھانک کر بند کوٹھری کے تالے کو گھورتی رہیں، آخر جی کڑا کر کے رکشا منگا کر اس میں پردا بندھایا۔ سلمیٰ کو گھنٹہ بھر سونے کی تاکید کرتی اور ذکرانی کو جلدی واپس کر دینے کا وعدہ کر کے چلی گئیں۔ بڑھیا دادی کی چوکس نگاہوں کی بے قراری سلمیٰ کے دل میں چھپی ہوئی چنگاری پر پنکھا سا جھل گئی، اس نے لیٹے ہی لیٹے بوڑھے چہرے کی جھریوں پر اضطراب کی لہروں کو دیکھا اور چپکے سے ہنس پڑی۔ دادی کا رکشا جیسے ہی چلا، وہ کمزوری سے لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی طاقچے پر سے صابن اتارا اور منہ دھونے چلی گئی اس کے بیمار چہرے پر مانجھے میں بیٹھی ہوئی دلہن کی طرح آپ ہی آپ رونق آ گئی تھی، اس نے ہلکے سے سر پر کنگھی پھیری، دھیرے سے مجھلی والے کواڑ کو کھولا اور دبے پاؤں برآمدے میں آ گئی، زاہدی کی کوٹھری میں تالا لٹک رہا تھا، اس کا جی سست ہو گیا دادی کے چنگل سے چھٹ کر وہ اتنے چاؤ سے آئی تھی تو زاہدی کے کمرے میں تالا لگا ہوا تھا۔ وہ چپکے چپکے دبے پاؤں زاہدی کے تالا لگے کواڑوں کے پٹ کو ذرا سا کھول کر اندر جھانکنے لگی۔ دلائی شکنوں سے بھرا بستر خالی پڑا تھا۔ کوٹھری کے اندر جگہ جگہ سگریٹ کے ٹوٹے پڑے تھے، میز پر ڈھیر سی کتابیں بے ترتیب بکھری ہوئی تھیں، ساری کوٹھری سگریٹ اور زاہدی کی مخصوص خوشبو سے بسی ہوئی تھی، وہ لمبے لمبے سانس لے کر ان خوشبوؤں کو سونگھتی رہی اور ہر چیز کو پیار کی نظروں سے دیکھتی جا رہی تھی کہ اچانک کسی نے اس کے شانے پر ہلکی سی تھپکی دی، وہ سر سے پیر تک کانپ گئی۔

"ارے آپ؟ کیسے یہاں تک آ گئیں؟" زاہدی اس کے پاس کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سلمیٰ شرم سے گڑ گئی، اس نے آنچل سے اپنا چہرہ چھپا لیا، وہ چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی تھی، اس کا سارا جسم تھرتھرا اٹھا۔

"گھر میں کوئی نہیں، گھبرا کر ادھر آ گئی تھی"، وہ اپنی نگاہوں کو جھکائے مشکلوں سے بس اتنا ہی کہہ سکی۔

"تو پھر۔ ذرا سا آکر دیکھئے میں نے آپ کا کمرہ کتنا گندا کر رکھا ہے" وہ ہنسا، اس کے چمکیلے خوبصورت دانت ہنس پڑے، اور اس کی آنکھوں میں ناچتی ہوئی شوخیاں ہنس پڑیں۔ وہ سلمیٰ کی جانی پہچانی انگلیوں والی نازک کلائی پکڑے اپنی کوٹھری کے اندر آ گیا۔ شام کے چھائے ہوئے اندھیرے میں اس نے بڑے پیار سے بھرپور نظر سلمیٰ پر ڈالی، اور سلمیٰ کے بھرے بھرے جسم کی متوالی خوشبو اس کے دل و دماغ کو مست کرتی چلی گئی۔ اس نے زینے کی طرف جھانک کر دیکھا اور کواڑ بند

ہوتی آواز میں بولا۔

" اب بتلائیے ، میں۔ میں آپ کی کیا خاطر کروں؟ خوشبودار پان بھی تو ہمیشہ آپ ہی کھلاتی رہی ہیں۔"

سلمیٰ دیوار سے لگی کھڑی رہی، خوف، شرم اور نقاہت کے مارے اس کے پاؤں تھرتھرائے جا رہے تھے۔

" آئیے۔ اس بستر پر بیٹھ جائیے۔ میں آپ کو ذرا قریب سے دیکھ لوں۔" زاہدی نے سلمیٰ کو اپنے قریب کھینچ لیا۔ یک بیک اس کی آنکھوں میں بجلیاں سی کوند گئیں۔ اچانک کانپتی ہوئی سلمیٰ تڑپ کر کوٹھری سے نکلی، اور جھلملیوں والے کواڑ کو بند کرتی لڑکھڑاتی اپنے پلنگ پر گر پڑی اس کا سارا جسم تپنے لگا تھا، اس کے چہرے اور ہتھیلیوں میں شرم کے مارے پسینے آ گئے تھے۔ اس کا دل بری طرح سے دھڑکے چلا جا رہا تھا ——— ہائے اللہ۔ وہ کیوں ادھر چلی آئی تھی، اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس کو اپنے آپ پر غصہ آنے لگا۔ وہ اپنے آنچل سے منہ ڈھانپ کر لیٹ گئی۔ اس کے آنچل سے زاہدی کی خوشبو آ رہی تھی، وہ دھیرے سے مسکرائی، آج اس نے پہلی بار اپنے ہونٹوں کی آگ کو ٹھنڈا ہوتے ہوئے محسوس کیا تھا۔ اس کی بیمار آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا، بال بکھر گئے تھے اور اس کے بند بند اور جوڑ جوڑ میں ایک نیا سرور بھرا نشہ چھا گیا تھا۔ وہ اپنے پلنگ پر مچلی اور آپ ہی آپ شرما گئی۔ "ہائے۔ توبہ۔ کتنے برے ہیں وہ۔ بھلا کوئی ایسے بھی پیار کرتا ہے؟۔ اور جو کوئی دیکھ لیتا تو" ——— اس خیال کے آتے ہی وہ کانپ کر مرجھا سی گئی۔ اس میں سر سے پیر تک زاہدی کی خوشبو اور سگریٹ کی بو بسی ہوئی تھی، سلمیٰ نے بڑی گہری اور ٹھنڈی سانس لے کر اپنے کپڑوں کو پیار سے سونگھا، پھر وہ گھبرا کر جلدی سے اٹھی ٹھنڈے پانی کے چھینٹے چہرے پر ڈال کر جگہ جگہ پھیلے ہوئے کاجل کو تولیہ سے رگڑ رگڑ کر ٹھیک کیا، ہلکے سے سر پر کنگھی پھیری۔ دل کے اندر ایک عجیب سی دھکڑ پکڑ ہو رہی تھی جیسے وہ ٹھگ کر چوری ہو رہی ہو۔ اس کی روح پر ایک بار سا محسوس ہونے لگتا تھا۔ اس کا دل پچھتانے لگتا، وہ کتنا نیچے گر گئی تھی ——— اس کا جی پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہنے لگا ——— مگر اس کے جسم سے لپٹی ہوئی زاہدی کی خوشبو نے اس کے دل کو بہلایا۔ اس نے کون سا گناہ کیا تھا؟ محبت اور پیار ——— یہ تو کوئی گناہ نہیں ہے۔ روتے روتے وہ مسکرا پڑی پھر اس کی نس نس میں خوشبوؤں کی لہریں کوند اٹھیں۔ اس نے ادھر ادھر غور سے دیکھا تو کرانی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ سلمیٰ نے یوکلپٹس کی آدھی شیشی اپنی ہتھیلی پر انڈیل لی اور اس کو اپنے سارے جسم پر رگڑ لیا، سگریٹ اور زاہدی کی خوشبو یوکلپٹس کی تیز بو میں چھپ کر رہ گئی تھی۔ پھر وہ نڈھال کچھ رنجیدہ اور کچھ مسرور سی تھکی تھکائی اپنے پلنگ پر سو رہی، نوکرانی کب واپس آئی اور دادی اماں کس وقت لوٹیں وہ بے خبر سوتی رہی۔

بچاری بڑی بی کے فرشتوں کو بھنک تک نہ مل سکی کہ لاڈو نے پالنے سے پاؤں نکالنے شروع کر دیئے ہیں۔ مگر کھاگ بڑھیا چوکنا ضرور تھی، اسی لئے وقت بے وقت سلمیٰ کی ہنسی اس کو کھٹکنے لگی تھی۔ "بھلا جوان جہان لڑکی کو ہنسی دل لگی سے کیا واسطہ؟" اور سلمیٰ تھی کہ ہر گھڑی انار کی کلی کی طرح سے چٹکی پڑتی تھی جھلملی سے جھانکنے والی آنکھیں اب ذرا شوخ ہو چکی تھیں، اور زاہدی کی پرشوق نگاہوں میں بھی بے قراری بھر گئی تھی۔ بڑے چپکے چپکے دلوں کی کہانیاں کہی اور سنی جانے لگیں۔ سلمیٰ کی جوانی کا مہرے دار ناگ اپنا پھن اٹھائے چوکس تھا۔ بس چھوٹے بڑے پرزے ہی جھلملی سے آنے جانے اور اپنے

اپنے خاموش دکھڑے سُناتے رہتے تھے۔

اسی دوران میں گرمی کی چھٹیاں آگئیں، کالج بند ہونے سے ایک دن پہلے زاہدی سلمیٰ سے ملنے کو مچل پڑا: "سلمیٰ۔ پل بھر کے لئے جو تم آجاؤ ۔۔۔ تو پھر میں بھی اُٹھوں گا" یہ بند پڑھ کر سلمیٰ مسکرائی۔ باورچی خانے سے مصالحہ بھوننے کی چھچھاہٹ کے ساتھ دادی اماں کی آواز آرہی تھی ۔۔۔ رات کا ہلکا اندھیرا چھا گیا تھا، سلمیٰ نے دھیرے سے باہر برآمدے میں کھلنے والی چٹخنی کھولی اور فوراً ہی سے برآمدے میں جھانکتی ہوئی بڑے پیار سے سرگوشیوں میں بولی "ہائے اللہ۔ کیسے آدمی ہو بھئی؟ دادی اماں تو رات کو بھی نہیں سوتیں" زاہدی نے جلدی سے لپک کر اُس کی گوری گوری کلائی کو تھام لیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی التجا سے بولا "میں کل جا رہا ہوں سلمیٰ۔ پھر کون جانے۔ تم سے مل بھی سکوں گا یا نہیں" سلمیٰ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ وہ دادی اماں کی پکار سن کر جلدی سے کواڑ کو بند کر کے آنسوؤں کو پونچھتی ہوئی باورچی خانے میں چھپ گئی۔

اس کا دل کٹتا رہا۔ آنکھیں جلتی رہیں "وہ چلا جا رہا ہے" "ابھی تو سلمیٰ نے اس کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا ۔۔۔ پھر کیا ہوگا ۔۔۔؟" سلمیٰ نے طے کر لیا کہ وہ زاہدی سے ضرور ملے گی، کسی طرح سے بھی ہو مگر ملے گی ضرور ۔۔۔ ملنے کی صورت کیا ہوگی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا ۔۔۔ اچانک اس کو یاد آگیا کہ دادی اماں کی عشا کی نماز بڑی لمبی ہوا کرتی ہے پھر وظیفہ پڑھتے پڑھتے تو اچھی خاصی رات ہو جاتی ہے، پھر کیوں نہ وہ اُس وقت سے فائدہ اٹھائے۔ سلمیٰ کے اترے ہوئے چہرے پر ایک رونق آگئی، اس نے گھر کی نوکرانی کو چپکے سے ذرا دور کی مارکیٹ سے دادی اماں کے سر میں لگانے کے لئے اصلی چنبیلی کا تیل لانے بھیج دیا۔ اور خود دادی اماں کی نماز کا انتظار کرنے لگی۔

گرمی اور حبس کے مارے دادی بیچاری نے باہر چھت کی چوکی پر ہی جائے نماز بچھا لی، اور مصلّے پر بیٹھنے سے پہلے بڑی بی نے سلمیٰ کو پکار کر کہا "منھن کی ماں کو اپنے پاس بٹھائے رکھنا ۔۔۔ توبہ ایسی اُمس اور گرمی میں بھی یہ لڑکی کمرے کے اندر گھسی رہتی ہے" "یہاں پڑھ رہی ہوں دادی اماں۔ چھت کی روشنی بڑی مدھم ہے" سلمیٰ نے مسکراتے ہوئے دادی اماں کی طرف دیکھا۔ بڑی بی نے نماز کی نیت باندھ لی تھی اور سلمیٰ کی جوانی اور دنیا کے بکھیڑوں سے دور ہو کر خدا سے لو لگائے اپنی عاقبت سنوارنے لگی تھیں۔ سلمیٰ نے چپکے سے کواڑ کھولا۔ ڈری ڈری نظروں سے چھت کی طرف دیکھا بڑی بی رکوع میں خدا کے آگے جھکی ہوئی تھیں۔ دبے پاؤں بینائی سے چلتی ہوئی زاہدی کی چوکھٹ پر وہ آکر جھجک گئی ۔۔۔ دل زور سے دھڑکا اور پاؤں کانپنے لگے۔ زاہدی اُسی کے انتظار میں تھا، اس نے اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر سلمیٰ کو اندر اُتار لیا۔ اور اس کے جھکے ہوئے شرمیلے چہرے کو اس طرح سے اوپر اٹھایا، جیسے سہاگ کی رات دولہا اپنی نویلی دلہن کی صورت کو دیکھ رہا ہو۔ دادی اماں کا دھڑکا سلمیٰ کے جی کو ایسا لگا ہوا تھا کہ یہ چند منٹ بھی اس کو پہاڑ سے نظر آرہے تھے۔ وہ جلدی سے جانے کو مچل پڑی۔ زاہدی نے اس کی آنکھوں کو چومتے ہوئے کہا "سلمیٰ میں تمہارے بغیر کیسے جی سکوں گا"

سلمیٰ نے جاتے جاتے زاہدی کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور اس کے آنسو بے اختیار ٹپک پڑے۔ زاہدی نے ایک بندھا بندھایا پیکٹ اس کی گود میں تھماتے ہوئے اس کی پیشانی کو پیار کیا "سلمیٰ مجھے بھول نہ جانا

میں جلد ہی آؤں گا ——— دیکھو میرا انتظار کرنا" برآمدے سے اترتے اترتے سلمیٰ نے پلٹ کر زاہد کو دیکھا اور جلدی سے کواڑ بند کر کے چھت کی طرف دیکھنے لگی۔ دادی اماں سجدے میں پڑی تھیں سلمیٰ نے خلوص دل کے ساتھ خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کا چہرہ ابھی تک تمتما رہا تھا اور سینے میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی۔ اس نے جھک کر اپنا بکس کھولا، دل دھڑکے چلا جا رہا تھا ——" اس پیکٹ میں کیا ہو گا؟" آہستہ سے اس نے پیکٹ کو کھولا۔ سب سے پہلے زاہد کی ایک چھوٹی سی تصویر نکلی، پھر یوٹنگ اِن پیرس کی خوشبو سے بسی کیوٹیکورا پوڈر کا لال ڈبہ اور دو ریشمی رومال۔ "یا اللہ میں اتنی ساری چیزوں کو کہاں چھپا کر رکھوں گی؟" سلمیٰ کے چہرے پر پسینے چھوٹنے لگے۔ اس نے جلدی جلدی کپڑوں کی تہوں کے اندر ان چیزوں کو چھپا دیا اور بکس کا تالا بند کر کے اپنا جائزہ لیا۔ اس کے چہرے اور جسم سے سگریٹ کا بھبکا ابھی تک اٹھ رہا تھا۔ کتنی پیاری اور کتنی مست کر دینے والی خوشبو تھی۔ مگر دادی اماں۔ ہائے دادی اماں تو اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے۔ کھڑکی کی طاق پر سے اس نے دادی اماں کا روغن صندل ذرا سا اپنے سر میں گھسا اور ہتھیلیوں کی چکنائی اپنے کپڑوں پر مل لی۔ نوکرانی ابھی تک واپس نہیں آئی تھی۔ اور دادی اماں سجدے پر سجدے کئے جا رہی تھیں۔ سلمیٰ کا دل رو دیا "ہائے وہ گھر اگر کتنا جلدی چلی آتی تھی" وہ دبے دبے پاؤں چھت پر گئی اور پانی پینے کے بہانے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں پر چھینٹے دینے لگی۔ بس اتنی ہی سی دیر میں وہ گھڑوں پسینے سے نہا گئی تھی۔ "یا خدا —— کتنی گرمی ہے" وہ دادی اماں کی نماز کی چوکی پر ایک کنارے لیٹ کر اپنے آنچل سے پنکھا جھلنے لگی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا، اور پھوٹ پھوٹ کر رونے کو کہیں جگہ نہ ملتی تھی ——
"ہائے پھر اس پرانے گھر میں جھینگروں کی چیخوں کے ساتھ وہ کیسے دو مہینے کاٹے گی" آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے اس کی آنکھوں سے چپکے چپکے ڈھلکتے رہے۔

دوسرے روز زاہد ہی چلا گیا۔ باہر برآمدے میں کھلنے والا دروازہ آج پورے کا پورا کھلا ہوا تھا۔ سلمیٰ نے ویران زینے اور برآمدے کو دیکھا اور اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ اپنے آنسوؤں کو چھپانے کے لئے وہ اٹھ کر اس چھوٹی سی کوٹھری کی طرف چلی گئی، کوٹھری خالی پڑی تھی، دریچوں پر بچھے ہوئے اخبار ہوا سے پھڑپھڑائے جا رہے تھے۔ کونے میں ابھی تک صراحی دھری تھی اور جوتا صاف کرنے کا ایک میلا سا کپڑا بھی رہ گیا تھا —— سلمیٰ بڑی محبت سے ایک ایک چیز تکتی رہی۔ سلمیٰ کی اکیلی زندگی میں وہ کتنی پیاری مگر یادگار قسم کی گھڑیاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ سلمیٰ نے زمین پر بکھرے ہوئے سلائی اور سگریٹ کے جلے ہوئے ایک ایک ٹکڑے کو بڑے پیار سے چن لیا۔ اچانک اس کی نظر اپنی ٹوٹی ہوئی چوڑی کے ٹکڑوں پر پڑی "ارے! یہ کب ٹوٹی تھی یہاں؟ اور جو دادی اماں دیکھ لیتیں تو پھر کیا ہوتا؟" اور پھر اس نے چوڑی کے ان ٹکڑوں کو جلدی جلدی چن کر باہر پھینک دیا۔

دادی اماں کی نگاہوں سے بچنے کے لئے وہ ہنستی رہتی، گھر کے کاموں میں دلچسپی لیتی رہتی مگر پھر بھی اس کو لگتا جیسے دادی اماں اس کے دل کے چور کو جانتی ہیں۔ وہ ان کی چبھتی ہوئی نگاہوں سے گھبرائی گھبرائی رہنے لگی۔ بڑی بی کے چہرے پر تنے جاتے ہوئے رنگوں کو وہ بڑے غور سے دیکھا کرتی، وہ ہر وقت اپنے آپ سے ڈری ڈری سی رہتی تھی۔ زاہد خاں کے دیئے ہوئے تحفے اس کے لئے ایک جنجال بن گئے تھے، ہر گھڑی اپنے بکس کی چابی وہ اپنے آنچل کے کونے میں باندھے پھرتی تھی۔

جب بھی کمرے سے نکلتی اسی بکس میں اُس کا دم اٹکا ہوا رہتا تھا۔ زاہدی کی تصویر کاغذ کی کئی تہوں میں لپٹی ہوئی اس کے بلوز کے اندر سینے سے چپکی رہتی رہتی مگر پسینے سے تر بتر تصویر کے خراب ہونے کا دھڑکا بھی لگا رہتا تھا۔ سلمیٰ بے چین بے چین سی رہتی اس کا سکون مٹ کر رہ گیا۔

سلمیٰ کا اُترا اُترا چہرہ اس کی پریشان پریشان سی نگاہیں دادی اماں کے دل میں ایک ہلچل مچا دیتی تھیں۔ "مولا۔ وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جو اس نے زاہدی کو اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ کیسا نصیبہ تھا اس کا کہ بیٹی ہو کر اب وہ بدی کاٹنے لگی؟" زاہدی کے جانے ہی بڑھیا کی آنکھوں سے پٹی کھل گئی تھی۔ "تو یہی بات تھی جو یہ چار دن کی چھوکری پھول بن کر رات دن ہلکی رہتی تھی"؟ بڑی بی ہزار اپنے دل کو تسلی دینا چاہتیں مگر نجانے دل کے اندر کیسا کانٹا تھا جو کھٹکتا ہی رہتا تھا، وہ راتوں کو چونک چونک کر اٹھ بیٹھتیں "یا مولا ——— ہم غریبوں کی عزت بچا لیو ——— اس کے سوا اور ہمارے پاس کیا ہے؟ معبود" ——— وہ بڑے درد و کرب سے دعائیں کرتیں۔ سلمیٰ اُن کے قریب بے خبر سوئی رہتی بڑی بی کی لرزتی ہوئی دعاؤں نے ایک دن عرش کو ہلا ہی دیا، اور بے خبر سوئی ہوئی سلمیٰ کے آنچل میں مضبوطی سے بندھی ہوئی چابی دادی اماں کی بوڑھی انگلیوں سے اچانک ٹکرا گئی۔ بڑی بی نے اندھیرے ہی میں ٹٹول ٹٹول کر بڑی مشکلوں سے آنچل میں بندھی ہوئی چابی کو چپکے سے کھول لیا، دبے پاؤں وہ کمرے کے اندر گئیں سلمیٰ کا بکس ان کو بڑا معصوم نظر آیا۔ "نگوڑی نیم بچی کی ذرا سی ہنسی خوشی بھی دل کو گوارا نہیں ہوتی"۔ دادی اماں کا ضمیر ان کو مجرم بنا رہا تھا۔ ـــ بکس کھولتے کھولتے وہ ذرا سا جھجکیں ——— ان کو سلمیٰ سے زیادہ اپنے آپ سے ہمدردی لگ رہی تھی۔ "اور جو بکس کو کھولتے ہی ان کا سکون مٹ گیا تب؟ تب پھر وہ کیا کریں گی؟ ـ ایک تو ایسی ہی ساری زندگی روتی اور بلکتی ہوئی گذری تھی۔ بڑی بی کا جی چاہا کہ اسی طرح سے تالا لگے ہوئے بکس کو وہ جلا کر خاک کر دیں تاکہ اس بکس کے اندر کا راز ان پر فاش نہ ہو۔ وہ اپنے اعتماد کو مجروح ہوتا ہوا دیکھنا نہ چاہتی تھیں جس پودے کو انھوں نے اپنے خونِ جگر سے سینچا تھا اسی پودے کو کیڑا لگا ہوا دیکھنے کی اُن میں جرأت نہ تھی۔ وہ پھر سنبھلیں، اور بڑے استقلال سے تالے میں چابی کو گھمانے لگیں۔ تالا آہستہ سے کھل گیا بکس کا ڈھکنا اٹھاتے ہی سینٹ کی خوشبو کا ایک بھبکا ایک دم سے بڑی بی کے حلق اور دماغ میں گھس گیا۔ اور بڑی بی تھوڑی دیر تک اسی طرح سے سکتے اور سناٹے میں رہ گئیں جیسے کسی نے ان کو کلوروفارم سنگھا دیا ہو۔ کانپتی ہوئی انگلیوں سے کپڑوں کی اکٹی پکٹی تہوں کو وہ اور بھی الٹتی پلٹتی رہیں۔ بسکٹ کے ایک خالی ڈبے میں رنگین چھالے لگی موبافین، لال، ہری، پیلی گھیکرے کے پھولوں والی ہیر پنیں اور لال، ہری، تھوڑی سی موتی ریشم کی لچھیاں دھری تھیں، ریشمی سوتی کپڑوں کی چھوٹی بڑی کترنیں بڑے احتیاط سے لپیٹ کر رکھی گئی تھیں، ایک فلیچی بھی تھی سوئی دھاگے اور کئی قسم کے بٹن بھی تھے۔ بڑی بی کا سوکھا چہرہ خوشی سے لہرا اُٹھا۔ کیسے سلیقے کی چھوکری ہے۔ بیکار ہی میں وہ اس کی ڈھنڈ بلے رہی ہیں، خواہ مخواہ شیطانی وسوسے ان کے دل میں اُٹھتے رہتے ہیں ——— مگر ہائے تو پھر یہ خوشبو کہاں سے آ رہی ہے۔ یہ انگریزی خوشبو میرے گھر میں کہاں سے آئے گی؟ بڑی بی نے کپڑوں کی سب سے نچلی تہوں میں ہاتھ ڈالا، کاغذ کے تہہ بہ تہہ پلندوں کو انھوں نے بڑے خوف کے ساتھ جلدی سے گھسیٹا، باجہ بجانے ہنسنے گانے سینماؤں کا ڈھیروں اشتہار دیکھ کر بڑھیا کی جان

میں جان آئی۔ بڑی بی نے سلمٰی کے سامنے بکس کو کھنگال کر رکھ دیا تھا۔ بکس کی سب سے نچلی سطح پر بچھے ہوئے کاغذ کو جب انھوں نے اٹھایا تو دھک سے رہ گئیں، کٹی کور رہ پاؤڈر کا لال ڈبہ۔ پیلے رنگ کی سینٹ کی شیشی اور دو ریشمی رومال بڑے پیار سے دھرے ہوئے تھے۔ بڑی بی کا سر چکرا گیا "ہائے مالک۔ اب کیا ہوگا۔"؟ بڑے درد و غم کے ساتھ انھوں نے اپنے سوکھے سوکھے ہاتھوں کو بڑی تیزی سے ملتے ہوئے بے بسی میں خود سے پوچھا "اس حرامزادے کو میرے ہی سینے میں چھری گھونپنی تھی؟" بڑھیا بلک بلک کر اس طرح سے رونے لگی جیسے رات کے سناٹے میں سلمٰی کی بھری جوانی کی لاش دھری ہو۔ آخر جیسے تیسے بکس کو بند کر کے اور زاہدی کی دی ہوئی ساری چیزوں کو لیتے وہ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے چھت پر آئیں اور ان تحفوں کو کسی مرے ہوئے چوہے کی طرح نفرت سے دبکتی ہوئی گھر کے سنڈاس میں پھینک آئیں۔

مگر یہیں جوان محبت کی رکھی ہوئی رات بھی آخر کسی طرح سے بیت ہی جاتی ہے اسی طرح سے بڑی بی ساری رات تڑپتی اور لوٹتی رہیں۔ اور چھت کی اکیلی چوکی پر جوانی کی مست نیند میں سلمٰی بے خبر سوتی رہی، اور زاہدی کی مسکراتی ہوئی تصویر کاغذ کی تہوں میں لپٹی ہوئی اس کے سینے سے لگی رہی —— ! دوسرے دن بڑی بی نے بڑے صبر اور وقار سے اپنے آپ پر قابو پایا، نزلہ اور سر کے درد کا بہانہ بنائے وہ بیمار سی پلنگ پر پڑی رہیں سلمٰی پر نظر ڈالنے کو بھی ان کا جی نہ چاہتا تھا۔ مگر شہر کی لونڈی دوسرے گھروں میں جا جا کے کیا کیا نہ گل بوٹے کھلاتی، بڑی بی شرافت کی خاطر زہر کا گھونٹ پیتی رہیں۔ رات ہی انھوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ اس گھر میں نہیں رہیں گی، آج تحفے تحائف تک ہی بات رہی تھی کل کلاں کو اس سے بھی آگے بات بڑھ سکتی تھی۔ اور یہ کون جانے کہ لاڈلی نے اندر ہی اندر کیا کیا گل کھلا کر رکھے ہیں۔ بڑھیا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح سے پہنچ کر روئی کے گالے کی طرح ڈھنک کے رکھ دیں۔ اتنی دیکھ ریکھ اور اسی کسنی پر تو لاڈو نے آنکھ کا کاجل نکال لیا تھا اور جو ذرا ڈھیل ملتی تو پھر کیا کیا تماشا ہوتا۔؟

صبح کو اٹھنے کے ساتھ ہی بڑی بی نے بڑی ہمت سے چائے کی ایک پیالی پی اور اپنے سب سے پرانے کرایہ دار کو بلا کر کہا کہ اب تک دوسرے کرایہ داروں کے پاس جو کچھ باقی بقایا ہے وہ جلدی سے وصول کر لائیں کیونکہ رات ان کے دیہات سے آدمی آیا تھا اور اس کی معرفت بڑی بی کو سخت تاکیدی طور پر گھر والوں نے بلایا تھا۔ ان کے ایک کھیت پر خواہ مخواہ کسی دوسرے نے قبضہ کر لیا ہے، اس صورت میں بڑی بی کو جلد سے جلد دیہات جا کر اس کی کارروائی کرنی ہے پرانے کرایہ دار نے بڑی بی کو کبھی اتنے دکھی لہجے میں بات کرتے ہوئے نہیں سنا تھا وہ پریشان ہو گئے۔ بڑی بی نے پھر ان سے کہا کہ وہ کوئی اچھا کرایہ دار ان کے رہائشی حصے میں بھی بسا دیں، اب نہ جانے کتنے مہینے ان کے مقدمے میں لگ جائیں گے۔ پرانے کرایہ دار ایک شریف گھرانے کے بوڑھے مختار صاحب تھے جن کی کئی بیویاں مرتی چلی گئی تھیں اور اب آخری بیوی خود مختار صاحب کو مارنے پر تلی ہوئی تھی، بچارے بڑے حسرت سے اپنی مرحومہ بیویوں کو یاد کر کے آب دیدہ ہو جاتے تھے مگر یہ موجودہ فیشن ایبل بیوی ہر ہفتے سینما میں پیسے لٹا لٹا کر بوڑھے کنجوس میاں کے دل پر آرے چلا رہی تھی۔ بڑی بی نے مختار صاحب کو گھر کے بارے میں اونچ نیچ بتا کر اطمینان کی ایک لمبی سانس لی اب "نہ رہے گا بانس اور نہ بجے گی بانسری" بس یہی ٹھیک ہے جیسے بھی ہو جلد سے جلد اس نگوڑی کو ٹھکانے لگا دیا۔

جائیے، اب نہ تو ان کو ڈپٹی داماد غرضدار داماد کی ہوس تھی اور نہ چاند سے مکھڑے کو منڈھے کے نیلے پر چھنے کا کوئی ارمان باقی رہ گیا تھا۔ سلمٰے کی بچی نے بڑھیا دادی کے دل کو ایسا ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا کہ بس وہ اس کو کسی کے پلے باندھ کر اپنے سر کا بوجھ اتار دینا چاہتی تھی۔

دادی اماں کی اچانک روانگی کا سامان دیکھ کر سلمٰے حیرت زدہ ہو گئی۔ صبح سے وہ اپنی کھوئی ہوئی چابی کی تلاش میں پریشان پھر رہی تھی، زاہدی کی تصویر اُس کے بھنچے ہوئے بلوز میں پسینے سے تر بتر ہو کر اُس کے سینے سے چپٹی ہوئی تھی، اور اس گھر کے اندر ایسی کوئی جگہ بھی نہ تھی جہاں وہ اس کو چھپا کر رکھ دیتی —— اور ذرا سکون کی سانس لے لیتی۔

دوپہر کے وقت بڑی بی نے ایک کوٹھری کے اندر اپنا بچا کھچا سامان بند کیا اور اپنا بوریا بستر سنبھالے سلمٰے کو ساتھ لیے تانگے پر سوار ہو گئیں، سلمٰے نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اپنے اُجڑے ہوئے کوٹھے کو دیکھا، ٹھیک زاہدی کی کوٹھری کے پاس والے برآمدے کے کٹہرے پر باہر کی طرف کالی سی تختی پر موٹے سفید حرفوں میں "ٹولٹ" لکھا ہوا تھا سلمٰے کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے اپنے برقعے کی نقاب ذرا سی اُلٹ لی تھی۔ ہائے زندگی کی کیسی پیاری گھڑیاں اسی چھوٹی سی کوٹھری میں اچانک بیت گئی تھیں۔ ہائے وہ کہاں اور کتنے عرصے کے لئے جا رہی تھی۔ اب وہ شوخ چمکتی ہوئی آنکھیں واپس آ کر جب اس کو یہاں نہ پائیں گی تو کتنی اُداس ہو جائیں گی ؟

بڑی بی نے چلتی ہوئی گاڑی میں اپنے اُجلے برقعے کی موٹی جالی کے اندر سے سلمٰے کو نفرت کی نظر سے دیکھ "کلموہی —— سب کچھ تو کر کے بیٹھ چکی اب اور کیا کرے گی ؟ کمینی —— لعنت ہو تجھ جیسی اولاد پر" —— اچانک گرتی ہوئی بجلی نے سلمٰے کو سب کچھ بتا دیا —— اس کا سارا جسم تھر تھرا اُٹھا —— اس نے اپنے سینے سے لگی پسینے سے چپکی ہوئی تصویر کو آہستہ سے ٹٹول کر دیکھا —— اتنے بڑے طوفان میں زاہدی اس کے کلیجے سے لپٹا ہوا تھا۔ کھوئی ہوئی چابی کا بھید اب اس کو مل گیا تھا —— اور گاڑی تیزی سے اسٹیشن کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔

(۵)

زاہدی نے گھر پہنچ کر ایک نیا شگوفہ کھلا ہوا دیکھا۔ ماں چچا کے گھرانے پر تیوریاں چڑھائے رہتی، اب آمنہ آمنہ کی وہ رٹ اس گھر سے مٹ چکی تھی۔ چچا کے گھر کی وہ دریچی بھی اب سونی پڑی تھی جس پہ آمنہ اپنی ٹھمنی ٹھوڑی لانی کبھی بیٹھی ہوئی نظر آ جاتی تھی —— زاہدی نے سوچا "چلو اچھا ہی ہوا" شام کو جب وہ چچا سے ملنے کو ان کے گھر گیا تو وہ بڑے خلوص اور پیار سے ملے مگر چچی پہلے سے بھی زیادہ اُکھڑی ہوئی تھیں، اُس نے گھر کے اندر خاموش نگاہوں سے جگہ جگہ آمنہ کو تلاش کیا مگر اس کی جھلک بھی نظر نہ آئی —— وہ آمنہ کی موٹی موٹی آنکھوں اور رسیلے ہونٹوں کو سلمٰے کے لب و رخسار سے ملانا چاہتا تھا —— زاہدی جب چچا کے گھر سے نکلا تو اس کا دل اُداس ہو گیا، اب اُس کے لئے وہ پہلی سی لہک اس گھر میں نظر نہ آتی تھی۔ بڑھیا سوٹ اور ریشمی ٹائی کا کسی پر رعب نہ جم سکا۔

رات گئے زاہدی کا ایک پرانا دوست علی حسن اُس سے ملنے آیا اور باہر صحن میں زاہدی کے بچھے ہوئے بستر پر

بیٹھ کر بڑی سرگوشیوں میں بولا "یار، اب تو تیرا پتہ کٹتا نظر آتا ہے، آمنہ کی خالہ کا لڑکا برکت علی مہینوں سے یہاں پڑا ہوا ہے سالے کی بڑی آؤ بھگت ہو رہی ہے۔ پتہ نہیں کلکتے میں کیا کرتا کراتا تھا، یہاں تو جب سے آیا ہے ہر گھڑی بائیسکوپ کے گانے ہی لہرا لہرا کر گاتا رہتا ہے۔ سالے کو اپنی گوری رنگت پر بڑا گمان ہے سمجھتا ہے کہ اس کو دیکھتے ہی لڑکیوں کے کلیجے پر چھُری چل جاتی ہے، مگر ——— یار اکائی تو ہے نہ ترپے تیرے والی تو بات سے گئی، سُنتا ہے کہ تیری چچی بڑا زور لگا رہی ہے کہ یہ جہیز تجھ کو روپیہ بھیجنے سے بچے اور اس کی بہن کا یہ لڑکا یہاں کی گدی پر بیٹھے" حسن علی نے بڑے دُکھ کے ساتھ اپنی بات ختم کی۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ پھر تو آمنہ کی شادی اسی برکت علی سے کر دینی چاہئے" زاہدی کو تھوڑی سی ندامت محسوس ہوئی۔

"ارے تم نے بھی اماں کہہ دیا۔ شہر جا کر شرم حیا سب دھو کر پی گیا۔ وہ تو تیرے نام کی لڑکی۔ اور تو کتنی آسانی سے اس کو دوسرے کی جھولی میں ڈالنے کو تیار ہو گیا ہے۔" حسن علی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

دوسرے دن جب زاہدی چچا سے ملنے گیا تو وہ اس کو دیکھتے ہی کھل اٹھے۔ چچی نے باہر بیٹھک سے کئی آوازیں دے کر برکت کو اندر سے بلایا۔

"دیکھو میاں — یہی میرا ڈاکٹر بھتیجا ہے۔ بڑا ہونہار لڑکا، گاؤں بھر کا چراغ ——— چچا کے لہجے میں ان کے خرچ کئے ہوئے روپیوں کی جھنکار صاف سُنائی دے رہی تھی۔

"آپ ابھی آئی۔ایس۔سی ہی میں ہیں نا؟ ——— برکت علی نے مسکراتے ہوئے چچا کی ڈاکٹر والی بات اُڑا دی۔

زاہدی کو ایسا لگا جیسے بھری محفل میں اس نے زاہدی کو ذلیل کر دیا ہو ———

حسن علی چچا کے گھر میں ہونے والی رنجشوں اور جھکی جھکی لڑائیوں کے قصے سُنا جایا کرتا تھا، چچا کے گھر میں شدید رسہ کشی ہو رہی تھی۔ سب ہی ایک طرف تھے اور چچا بے چارے کا ساتھ دینے والا کوئی نہ تھا۔ چچا ہی پابند تھے، ایک سال تک ان کا روپیہ زاہدی پر خرچ ہوتا رہا تھا۔ زاہدی کی پیشانی پر اقبال کا ستارہ چمک رہا تھا، پھر وہ کیسے آنکھیں رکھتے ہوئے چوٹنے کے ایک دکاندار کو اپنی بیٹی دے دیتے آمنہ بیتا کے ننھے ننھے گالوں پر لکھی ہوئی تھی اور چچی کا تو اپنا ہی خون تھا پھر وہ کیسے نہ جوش مارتا ———

زاہدی ان قصوں کو سُن سُن کر تھوڑی دیر کیلئے پریشان ہو جاتا تھا، اس کو آمنہ یا اپنی شادی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن اس کو اپنی تعلیم مکمل کر لینے کا بڑا ارمان تھا۔ اور اس تمنا کو پورا کرنے والے صرف اس کے چچا ہو سکتے تھے۔ اور چچا کے سامنے آمنہ کا بیاہ تھا۔ اور آمنہ کی نیاہ ہی اب ڈگمگاتی نظر آ رہی تھی۔

دو مہینے کی یہ لمبی چھٹی اس سے کاٹے نہیں کٹ رہی تھی، گھر آ کر وہ ایک عجیب سی الجھن میں پھنس گیا تھا، پڑھائی میں بھی جی نہ لگتا تھا۔ باپ کی مالی حالت دن بدن بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ زاہدی فکر میں ڈوبا رہنے لگا روپیہ کہاں سے آئے گا اور اس کی تعلیم کیسے پوری ہو سکے گی۔؟

وہ سلمے کو بھول گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اداسی چھائی رہتی اور کوئی راستہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ صرف ٹیوشن کے سہارے پر میڈیکل کالج کا خرچہ چلانا کوئی آسان نہ تھا ——— زاہدی کی پریشانی کو دور کرنے والا کوئی نہ تھا۔ ڈاکٹری کی چھ سال کی پڑھائی میں، کم سے کم چار ہزار کی بڑی سی تھیلی چاہئے تھی اور چچا کے سوا یہ تھیلی اس کو کون دے سکتا تھا؟

آخر تھک ہار کر زاہدی نے اپنے چچا کا دامن تھامے رکھنا ہی مناسب سمجھا۔ اب جو بھی ہو۔ اس کو اپنی پڑھائی سے سروکار رکھنا ہے۔
برکت میاں شوق سے آمنہ سے بیاہ رچائیں۔ "ڈاکٹری کرنے ہی وہ چچا کا پائی پائی ادا کر دیگا"۔ گاؤں بھر میں کانا پھوسی ہونی رہی، لڑکیاں اپنے اپنے دروازوں سے جھانک جھانک زاہدی کو آتے جاتے دیکھ کر حسرت سے کہتیں "ہائے ہائے مت ماری گئی ہے آمنہ کی۔ کہاں زاہدی جیسا ہزاروں میں ایک اور کہاں وہ لنگوڑا بڈھا ——؟ ارے آمنہ کا کوئی قصور نہیں اس میں، ماں کتنی بنی آگے پیچھے کرتی رہتی ہے" دوسری لڑکی بولی۔
"تو کیا —— آمنہ کی اپنی آنکھیں پھوٹ گئی ہیں؟ جو سوجھائی نہیں دیتا؟" گاؤں بھر کی لڑکیوں کو زاہدی کا بڑا دکھ تھا۔
زاہدی کی چھٹی ختم ہونے سے پہلے ہی برکت میاں اچانک اپنی جوتے کی دکان پر کلکتہ چلے گئے معلوم ہوا کہ اُن کی دکان میں چوری ہو گئی تھی حسن علی نے بڑے رازدارانہ انداز میں زاہدی سے کہا کہ "جلتے سمے برکت میاں کی آنکھیں رونے کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں جانے کیسے چلا گیا۔ سچ پوچھ میں کلکتہ سے بلاوا آیا تھا یا روز روز کے جھگڑے کو پاک کرنے کیلئے چچا نے اس کو چلا دیا تھا۔ چچا کے گھر اور بستی بھر میں تھوڑی دیر تک سناٹا چھایا رہا، پھر یہ بات گاؤں والوں نے ایسی بھلائی جیسے ان کے سر پہ سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہو۔ بستی بھر میں کوئی بھی برکت میاں کو اچھی نظر سے نہ دیکھتا تھا، پھر زاہدی کے مقابل وہ اس کو کس طرح سے دیکھ سکتے تھے؟ کئی دنوں کی خاموشی کے بعد چچا کے گل بوٹوں والے پھٹے پردے سے دروازے کی چولیں بھی اب آہستہ آہستہ چرچرانے لگی تھیں اور کبھی کبھار دریچے کے پاس ایک سایہ بھی گذرنے لگا تھا۔
مگر زاہدی کو اس ماحول سے اب گھن آنے لگی تھی۔ اس کو اپنے آپ سے بھی نفرت ہو گئی تھی، جو بھی ہڈی کا ابھی تک وہ آسرا لگائے بیٹھا تھا۔ روپے کی عرض میں اس کو اپنی غیرت تک کی پروا نہ تھی، یہی سوچ سوچ کر زاہدی کئی دنوں تک تڑپتا رہا۔ اپنے گھر کی بدحالی اب اس سے دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور اس کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کیلئے چار ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ اور اس ضرورت کو پورا کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا۔
بس چچا کے سہارے اُسی چوٹھی ہڈی میں بندھی ہوئی چار ہزار کی تھیلی دور سے جھنجھنا رہی تھی ——!
کئی دنوں سے اچانک اس کو سلمٰی کی کاجل لگی آنکھیں اور اس کے گداز لبوں کی گرمی یاد آ رہی تھی —— اُس کی زندگی میں سلمٰی اور آمنہ دو لڑکیاں آئی تھیں۔ اور دونوں اپنے اپنے گھر کے گھروندوں میں پیار اور محبت کے کھلونوں سے کھیلتی رہی تھیں۔ زاہدی کا جی یہ سوچتے ہوئے دھک سے رہ گیا۔ خدا کرے کہ آمنہ کی ڈولتی ہوئی نتھنی کا حلقہ اس کے ہونٹوں کی پاسبانی کرتا رہا ہو"۔ زاہدی نے اپنے دل کو بہلایا، آمنہ کی بات دوسری تھی دیہات کی سہمی ہوئی لڑکیاں بڑی معصوم ہوا کرتی ہیں، پھر آمنہ کا گھر بھرا پُرا تھا —— سلمٰی کے اجاڑ گھر میں جو نہ ہو جاتا وہ کم ہی تھا —— پھر بھی زاہدی کو سلمٰی کی یاد سے محبت تھی —— اور سلمٰی کی نشیلی آنکھوں کا پیار صرف اسی کے لئے تھا۔ زاہدی کو آمنہ کی معصومیت کا یقین جب سے آ گیا تھا تب سے تو اسے ایسا لگتا جیسے ایک پہاڑ اس کے سر پر سے سرک گیا ہو۔ وہ گھنٹوں سلمٰی اور آمنہ کی باتیں سوچا کرتا —— اس کے شعور میں ابھی اتنی پختگی نہیں آئی تھی جو اپنے لئے وہ فیصلہ کن قدم اٹھاتا ——! سلمٰی سے اس کی جوانی کی پہلی کرن نے پیار کیا تھا —— اور آمنہ؟ آمنہ کے لئے ابھی اس کے جذبات بیدار نہ ہوئے تھے، مگر آمنہ اس کی ترقی کا زینہ تھی —— پھر آمنہ جیسی بھی تھی بہرحال اُس کے لئے بے حد ضروری تھی ——!

(۶)

چھٹیوں کے دو مہینے جیسے تیسے گزار کر جب وہ اپنا سامان لیے سلمے کے مکان پر پہنچا تو گھر کا نقشہ ہی بدل چکا تھا ــــ اس کی کوٹھری میں دوسرا کرایہ دار آ کر بس گیا تھا۔ اور سلمے کے اُس حصے میں بھی نئی نئی صورتیں چلتی پھرتی نظر آ رہی تھیں۔ نیچے کے کرایہ داروں سے پتہ چلا کہ بڑی بی اپنے کھیت کے مقدمے کے سلسلے میں گاؤں چلی گئی تھیں وہاں سے اُن کا خط آیا ہے کہ وہ اپنی لڑکی کی شادی کر کے ہی ادھر واپس آئیں گی" زاہدی نے حسرت کی ایک نظر اپنی کوٹھری پر ڈالی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر گئے ــــ نیچے سے کھڑے ہی کھڑے اس نے اوپر جھلملی والے بدرنگ کواڑوں کو دیکھا اور سوچا کہ سلمے کی مہندی لگی ہوئی انگلیاں اب کیا کبھی اس دروازے کو کھول سکیں گی؟

پٹنہ کا شہر گنگا کے کنارے کنارے پر نو میل تک لمبا بستا چلا گیا ہے۔ کالج اور یونیورسٹی کی بڑی بڑی عمارتیں اور بجلی کی روشنیاں جب گنگا کے اُجلے پانی میں جھلملاتی ہوئی نظر آتی ہیں تو اس وقت پٹنہ کا سارا شہر دریا کے اندر دلہن کی طرح جگمگاتا ہوا نظر آتا ہے۔ زاہدی گھنٹوں دریا کے کنارے چپ چاپ بیٹھا ہوا پانی کی لہروں میں جلتے اور بجھتے ہوئے چراغوں کا کھیل دیکھتا رہتا تھا۔ دور نزدیک چھوٹی بڑی کشتیوں کے بادبان پانی کی لہروں پر ڈگمگاتے رہتے۔ زاہدی کے اپنے کالج کی بھی کئی کشتیاں تھیں جب وہ شروع شروع میں آیا تھا تو کشتی پر چڑھتے ہوئے اس کی جان جاتی تھی۔ مگر اب وہ ان ساری پرانی باتوں کو یاد کر کے مسکرا پڑتا تھا۔ سلمے جب اس کے دل و نگاہ سے اتنی قریب آ کر اس سے ہمیشہ کے لیے چھپ گئی تھی تو پھر میڈیکل کالج کے اور لڑکوں کی طرح اس نے بھی اپنے لیے ایک رنگین فضا بنا لی! اور پڑھنے کے ساتھ وہ ان کھلونوں سے بھی کھیلتا رہتا۔ اس نے ان کھلونوں کو کبھی اہمیت نہ دی ــــ ایک اکیلی لڑکی سلمے نے جھلملی والے کواڑوں کے پیچھے سے اس کی زندگی میں جو جذبات دیے اور انگارے بھر دیے تھے، اور جس کی آگ میں تڑپ تڑپ کر اس نے بہت سی راتیں جاگ کر کاٹ دی تھیں، وہ لطیف بیقراریاں پھر کبھی اس کے دل میں نہ تڑپیں۔ ہسپتال کی ڈیوٹی میں اپنے گرد وہ ناچتی ہوئی لڑکیوں کو محسوس کر کے خوش ہو جاتا تھا مگر لک چھپ کر مہندی لگی انگلیوں کے پوروں کو چومنے میں جو مزہ ملتا تھا۔ وہ لب اشک سنچے ہوئے ہونٹوں سے کبھی نہ مل سکا تھا۔ ہنستی ہوئی آنکھوں اور شوخ دیدوں کو دیکھتے دیکھتے اس کو سلمے کی غریب صورت کاجل لگی آنکھیں یاد آ جاتیں۔ ان آنکھوں میں محبت کی جرأت کیسی جگمگاتی تھی! سلمے۔ اس کی اپنی سلمے! نجانے اب تک کسی دوسرے کے کتنے بچوں کو جنم دے چکی ہوگی۔۔ کاش وہ اس کو صرف ایک بار اور دیکھ سکتا!

چچا کے گھر سے پڑھائی کے روپے آتے رہے، وہ ٹیوشن میں کئی لڑکوں کو پڑھاتا رہا اور اپنی ذہانت سے ہمیشہ اچھے نمبروں کے ساتھ کامیاب ہوتا چلا گیا ــــ وہ میڈیکل کے ذہین لڑکوں میں شمار ہوتا تھا۔

جب بھی وہ چھٹیوں میں گھر جاتا تو آمنہ کے اچھے برے بہت سے تذکرے سنا کرتا۔ آمنہ بڑی شوخ تھی جوانی اس پر ٹوٹ کر چھائی تھی۔ ساون کے منڈلاتے ہوئے بادلوں کی طرح اس کی آنکھوں میں شباب کی لہریں جھومتی رہتی تھیں ــــ زاہدی کا جی چاہتا کہ بس ایک پل کے لیے وہ اس کو دیکھ لیتا۔ میلاد والے دن سے آمنہ کا زاہدی سے پردہ ہونے لگا تھا۔ اس بات کو پانچ برس بیت گئے تھے۔ دور ہی دور سے کبھی کبھار وہ آمنہ کے بے باک قہقہے کی گونج سن کر حیران ہو جاتا۔

آمنہ دیہات میں رہتے ہوئے اب اتنی اونچی آواز سے ہنسنے لگی تھی۔ کبھی کبھی رات کو جب زاہدی کی نیند اچٹ جاتی تو اس کو بے اختیار آمنہ کی یاد آجاتی اور وہ اس کو پا لینے کے لیے بے چین ہو جاتا تھا۔ چچا اپنے چمڑے کی تجارت میں اتنے مگن تھے کہ زاہدی کے جوان دل کی دھڑکن کا انھیں کوئی احساس نہ تھا اور زاہدی کے والدین چچا کی لڑکی کو اب اپنے بیٹے کے لائق نہ سمجھتے تھے۔ اڑتی پڑتی ایک خبر اس کے کان میں بھی پڑی تھی کہ آمنہ منہ زور گھوڑی کی طرح زاہدی کے نام پر بدکتی ہے۔ ——

شاید برکت میاں کے آنے جانے کی کشش آمنہ کے دل میں باقی رہ گئی تھی اور اسی لیے زاہدی آمنہ کے سامنے اپنے آپ کو آزمانا چاہتا تھا۔ مگر زاہدی کی حسرتیں دل کی دل ہی میں رہیں اور وہ چھٹیاں گزار کر اپنے چچا کے رولوں اور دعاؤں کو لے کر واپس آگیا۔ اب صرف دو سال اس کے ڈاکٹر بننے میں رہ گئے تھے۔ زندگی کی اتنی رنگینیاں اس پر چھا گئی تھیں کہ سلطے کی یاد میں ایک دھندلے سے خواب کی طرح اس کے ذہن میں باقی رہ گئی تھی۔ جھلملاتے بدرنگ گاؤں والے پرانے گھر کی طرف وہ پھر کبھی نہ گیا۔ اس کی یہ فطرت تھی کہ اپنے آپ کو بھول نے کے لیے وہ ان پرانے راستوں سے کتراتے لگتا تھا۔ جیسے وہ اپنے کسی کمزور پہلو سے ڈرتا رہا ہو۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچا کہ چچا کے اتنے روپے اس کی ذات پر خرچ ہو چکے ہیں کہ اب اس کو کبھی نہ چھوڑیں گے۔ چچی کی سرکشی بھی ختم ہو چکی تھی۔ آمنہ کے رسیلے ہونٹوں پر اس کی چاندی کی ڈوبتی ہوئی تھی، زاہدی کو ہمیشہ یاد آتی رہتی "اس جنگلی لڑکی کو سینچنے کی بیوی بنانے میں اس کو کافی محنت کرنی پڑے گی۔" زاہدی سوچ کر مسکرا اٹھتا۔ اب رنگ برنگی لڑکیوں کے پیچھے پیچھے بھاگتے بھاگتے وہ تھک گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا کہ اب سکون کی زندگی گزارے مگر ابھی اس کو ڈاکٹری کے فائنل امتحان دینے میں پورے دو سال تھے۔ دنیا سے بیگانہ ہو کر وہ اپنے امتحان میں جٹ گیا۔ اس کی تیز آنکھوں کے چمکتے ہوئے دیے بجھ گئے۔ پرچھائیاں منڈلاتی رہیں مگر آہستہ آہستہ ساری دلچسپیوں سے اس نے اپنے آپ کو الگ کر لیا تھا۔

جب فائنل امتحان میں وہ بڑے اعزاز سے کامیاب ہو گیا تو پھر اس کی اجاڑ دنیا میں بہار کی رنگینیاں چھا کر رہ گئیں۔

ابھی وہ اپنی تھکان کو پورے طور سے اتارنے بھی نہ پایا تھا کہ اچانک گھر سے چچا کی بیماری کا تار آگیا —— زاہدی بھاگم بھاگ جب گھر پہنچا تو اس کے چچا کا انتقال ہو چکا تھا۔ سارے گاؤں پر ایک گہری اداسی چھائی ہوئی تھی۔ تعزیت میں آنے والوں کی بہت سی نئی صورتیں گاؤں میں نظر آرہی تھیں۔ گاؤں بھر کا ایک بڑا آدمی اٹھ گیا تھا۔ زاہدی اپنے باپ سے مل کر رو پڑا۔ اور چچی کے پاس جب آیا تب بھی اس کے آنسو ٹپک رہے تھے۔ چچی کی آنکھیں روتے روتے سوج گئی تھیں بال الجھے ہوئے تھے اور روتے روتے وہ تیکھی نگاہوں سے زاہدی کو دیکھ کر بولیں۔

"ہائے تم چچا کے جیتے جی نہ آسکے۔ وہ تمہارا انتظار کرتے کرتے چلے گئے۔" زاہدی نے سب کچھ بتایا — راستے کی دشواریوں کا رونا رویا مگر چچی کی نگاہوں کو تو پہلے بھی وہ عزیز نہ تھا۔ چچی کا میکہ قریب ہی دوسرے گاؤں میں تھا۔ ان کے گھر سے لوگوں نے آکر چچا کی ہر چیز پر اپنا قبضہ جما لیا۔ برکت علی اپنے جوتے کی دکان بند کر کے آگئے تھے۔ اور اب وہی چمڑے کی تجارت کی دیکھ بھال کر رہے تھے۔ چچا کے گھر کا اب نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ برکت میاں کے حکم کے بغیر گھر کا کوئی کام نہ ہو سکتا تھا۔ زاہدی نے بڑے خلوص سے خدا تعالے کی درگاہ میں اپنا سر جھکا کر اس کا شکریہ ادا کیا جس نے برکت میاں کے ہاتھ

اٹھائے پیسوں سے اس کو بچا لیا تھا۔ زاہدی اس بیگانے ماحول سے جلد سے جلد بھاگ جانا چاہتا تھا مگر اس کا دوست حسن علی اس کو روک رہا تھا کہ ابھی چچا کے گھر میں بہت سے انوکھے تماشے ہونے والے ہیں یہ ممکن ہے کہیں پر سے اس میں تمہاری ضرورت ہو" گاؤں بھر کے جو لوگ چچا کی بیماری میں ان کے پاس آتے جاتے تھے سب ہی کو خبر تھی کہ چچا نے آخری حالت میں بھائی کا ہاتھ پکڑ کر کہا تھا کہ "آمنہ کا نکاح جلدی سے جلدی زاہدی سے کر دیا جائے۔ نہیں تو قبر میں ان کی بیٹھ نہ لگے گی" بیوہ چچی کو مرحوم شوہر کی وصیت کا پاس تھا ـــــ مگر ان کا سارا گھرانا ان کے گرد ایک حصار باندھے ہوئے تھا۔ زاہدی کے گھر والے بس یکی طور پر ہی آتے جاتے تھے۔

بھائی کا چالیسواں گزرنے کے بعد زاہدی کے والد نے آمنہ کے نکاح کی بات چلائی ـــــ چچی بھی سوزش میں پڑی تھیں۔ ان کے گھر باہر کا سارا حساب کتاب برکت میاں نے کچھ ایسا نبھا لیا تھا کہ وہ بے بس ہو کر رہ گئی تھیں۔ نکاح کی بات گھر میں پھیلی، اور چچی کا گھرانا ایک ساتھ ناراض ہو گیا۔ "بھلا زاہدی جیسے کرسٹان کو بیٹی دے دیا کیسے بڑے دکھ کی بات تھی۔ جب آمنہ کے باپ بیس لاکھ روپے کی زندگی چلی گئی تو ٹکڑے یہ پانچ ہزار روپے زاہدی کی پڑھائی میں برباد ہوئے تو کون سا غم ہے" چچی بلک بلک کر روتیں۔ زاہدی کے گھر والوں نے ہمیشہ ان کے کھاتے پیتے گھرانے سے جلن محسوس کی تھی۔ اور اب اسی گھر میں بیٹی کو بیاہ دینا ان کے دل کو بھی کسی طرح سے گوارا نہ تھا۔ مگر مرے ہوئے شوہر کی خواہش کو پورا کرنا بھی ضروری تھا۔ برکت میاں گھر اور باہر جھنجھلائے جھنجھلائے سے رہتے اور آمنہ کا چہرہ اداس رہتا۔ برکت کی ماں ایک دن غصے میں بھری ہوئی کوٹھڑی میں آکر اپنی پھیلی ہوئی چیزوں کو سمیٹنے لگی اس کی آنکھوں میں سے آنسو بہہ رہے تھے اور وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہی تھی "برکت کسی کا نوکر نہیں ہے۔ جو وہ اس طرح سے اس گھر میں پڑا رہے گا۔ آج آمنہ کا نکاح ہوگا تو کل زاہدی میاں ہم لوگوں کو کان سے پکڑ کر نکال پھینکیں گے۔ مہینوں سے اپنی دکان جو بند پڑی ہے اس کا نقصان کون بھوگے گا" آمنہ خالہ کو برستے دیکھ کر سہم گئی اس نے خالہ کا ہاتھ تھام لیا "نہ جاؤ ـــ خالہ ابھی نہ جاؤ"۔

پھر کیا؟ تیرے میاں کے جوتے کھانے کو رہیں؟ خالہ تڑپ کر بولی تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی یہاں نہیں رہ سکتی خالہ نے حسرت بھری نظر سے آمنہ کی ناک میں ڈولتی ہوئی چاندی کی نتھنی کو دیکھا ــــ "ہائے یہ سونے کی چڑیا کیسے دوسرے کے گھر چلی جائے گی" گھر کے لوگوں نے سمجھایا مگر آمنہ کی خالہ سر پر کھدر کی چادر ڈال کر اپنی پوٹلی بغل میں دبائے اپنے گاؤں کی طرف غصے سے تنتناتی پیدل ہی چلی گئی۔ اس بستی میں شرافت اور تہذیب کا کوئی اونچا معیار نہ تھا جن کے پاس تھوڑے سے پیسے ہو گئے تھے۔ وہ اپنے گھر کی عورتوں کو تھوڑا پردہ کرا کر بیل گاڑی پر لاتے لے جاتے تھے۔ آمنہ کی خالہ بیوہ تھی جس کو صرف اپنے اکلوتے بیٹے برکت ہی کا ایک سہارا تھا۔ جوتے کی دوکان سے تھوڑی آمدنی ہو جاتی تھی، پھر ادھر کئی سالوں سے ماں بیٹے آمنہ پر دانت جمائے بیٹھے تھے۔ گھر آنے والی لکشمی ان کے دروازے تک آگئی تھی۔ مگر زاہدی ان کے راستے میں حائل ہو رہا تھا۔

بہن کے جانے کے تیسرے دن جب آمنہ کی ماں صبح تڑکے اچانک اٹھ بیٹھی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا سامنے آنگن کا کواڑ چوپٹ کھلا تھا۔ اور اس کی بغل میں آمنہ کا بستر خالی پڑا تھا۔ دبے دبے پاؤں وہ سارے گھر میں آمنہ کو

ڈھونڈتی پھری۔ مگر آمنہ لاپتہ تھی۔ جیسے جیسے صبح نکھرتی گئی آمنہ کی ماں کا دل ڈوبتا گیا۔ برکت کی پلنگ بھی خالی تھی۔ اتنی بڑی کالکھ لگنے کی اس کو امید نہ تھی۔ اس کی بہن نے دولت کے لالچ میں اس کے کلیجے پر چھری چلائی تھی۔ "ہائے برکت تم ہی نے میری ناک کاٹ ڈالی۔" آفتاب کی کرنوں کے ساتھ گاؤں بھر میں پہلے چپکے چپکے اور پھر ڈنکے کی چوٹ پر آمنہ کے نکل بھاگنے کا شور مچ گیا۔ زاہدی کے گھر والوں کا سر شرم سے جھک گیا۔ گاؤں والے آمنہ کی ہمت پر حیران تھے۔ آمنہ کی ماں نے ہزاروں بہانے بنائے مگر تاڑنے والی نگاہیں سب کچھ جان گئی تھیں۔ اس چھوٹے سے گاؤں میں شرافت پر مرمٹنے والا کوئی اونچا گھرانا نہ تھا۔ اس سے پہلے بھی کئی لڑکیاں اسی راستے پر جا چکی تھیں۔ مگر دیہات کے اس گنوار اور جاہل ماحول میں زاہدی کا شعور جاگ چکا تھا اور جس علم اور تہذیب کے سانچے میں اس کی زندگی ڈھل چکی تھی اس کے لیے یہ حادثہ بہت ہی المناک تھا۔ زاہدی کے گھر والے طنز کے نشتر چلاتے رہتے۔ مگر وہ اکیلا کمرے میں پڑا سوچا کرتا تھا کہ فطرت نے کس طرح سے اس کی ساری عیاشیوں کا بدلہ لے لیا ہے۔ آمنہ کی سادگی اور معصومیت کے دھوکے میں رہ کر اس کی زندگی کتنی کربناک بن جاتی۔ اچھا ہوا جو وہ زاہدی کو ٹھکرا کر چلی گئی تھی۔ نہیں تو یہ کانٹا نشتر بن کر ہمیشہ اس کے دل کو کاٹتا رہتا۔

شفیق چچا کی موت۔ اور اس موت سے بڑھ کر آمنہ کا برکت کے ساتھ بھاگ نکلنا۔ زاہدی برداشت نہ کر سکا۔ اس کو سب سے زیادہ اپنے بوڑھے باپ پر ترس آرہا تھا جس نے غربت میں تھوڑی سی عزت بنائی تھی اور اب وہ عزت دو کوڑی کی بھی باقی نہیں رہی تھی۔ کھاتا پیتا ہوا بھائی ساتھ چھوڑ کر دنیا سے جا چکا تھا اور آمنہ نے بھری بستی اور آس پاس کے گاؤں میں اس کے منہ پر کالکھ مل دی تھی۔

(۷)

زاہدی پٹنہ واپس آگیا۔ آتے ہی میڈیکل وارڈ میں ہاؤس سرجن کی جگہ مل گئی تھی۔ وہ اپنے پریشان دماغ سے اپنا گاؤں، اپنا گھرانہ اور سب کچھ بھلا دینا چاہتا تھا۔ مگر اس کے سر پہ چچا کے روپے کا بار تھا۔ گھر سے چلنے سے اس نے حسن علی کی زبانی چچی کو کہلا دیا تھا کہ "میں آپ کا روپیہ جلد سے جلد ادا کرنے کی کوشش کروں گا۔" جگمگاتی ہوئی بجلی کی روشنی والے شہر میں آکر زاہدی کو بڑا سکون ملا گاؤں کے اندھیروں نے اس کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں میں پھر سے شوخیاں چمکنے لگیں۔ اور سانولے چہرے پر من موہن مسکراہٹ دمکنے لگی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ گاؤں کی ایک اُجڈ سی لڑکی کے آگے اتنی بڑی بازی ہار کر آرہا ہے ـــــ وہ اپنی دنیا میں پھر مگن ہو گیا۔ اس نے پلٹ کر کبھی آمنہ کے بارے میں نہ سوچا۔ ہر مہینے بڑی پابندی کے ساتھ پچاس روپے کا منی آرڈر چچی کے نام سے اپنے گاؤں بھیجتا رہا تھا۔ کبھی کبھی اس کو سلمیٰ بے اختیار یاد آجاتی مگر آٹھ سال کے بیتے ہوئے دنوں نے اگرچہ سلمیٰ کے نقش و نگار کو اس کے ذہن میں بہت دھندلا کر دیا تھا پھر بھی وہ اس کی پرخلوص یاد کو دل سے پورے طور پر مٹا نہ سکا۔ سلمیٰ اس سے اچانک چھن گئی تھی اور آمنہ کی مست جوانی سے لبالب بھرا ہوا پیمانہ ایک جھٹکے نے اس کے ہاتھوں آنے سے پہلے ہی اچک لیا تھا ـــ اور وقتی بہلاوے کے لیے چند کھلونوں سے وہ کھیلتا رہا ـــــ جو ٹوٹے پیمانوں کی تلچھٹ کو چاٹتا

رہا ——— وہ کسی کا اپنا نہ تھا۔ کوئی اس کا اپنا نہ بن سکا۔

مسٹر جوزف نے بڑی گہری نظر سے زاہدی کو دیکھا اور رفتہ رفتہ اس پر چھا کر رہ گئی۔ اپنی خریدی ہوئی تابعوں کے پھندے زاہدی کے گلے میں ڈالی کر شاید ——— شاید وہ اس کو اپنا پالتو کتا سمجھنے لگی تھی" جوزف کی یاد آتے ہی زاہدی کھول اٹھا ——— وہ اتنا نیچے گر چکا تھا کہ جوزف اس کو اپنی ملکیت سمجھنے لگی تھی؟ زاہدی تلملا گیا اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ وہ عینی کے لائق نہ تھا۔ مگر وہ عینی کی معصوم محبت سے بے نیاز بھی نہیں رہ سکتا تھا" خدایا" میری گنہگار روح کو قرار دے" ——— وہ اکیلے کمرے میں تکیے سے منہ چھپائے سسک سسک کر دیر تک روتا رہا ———

دوسرے دن جب زاہدی عینی سے ملا تو اس کی آنکھیں جھکی جھکی سی تھیں۔ جیسے عینی اس کے ماضی کی ساری بیتی بھول گئی ہو کر سن چکی ہو ——— زاہدی نے ڈرتے ڈرتے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں مگر عینی کی معصوم آنکھوں میں زاہدی کے گناہوں کا کوئی دھبہ نظر نہ آیا وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ "آپ۔ آپ آج کھوئے ہوئے سے کیوں نظر آ رہے ہیں؟" ———

زاہدی گھبرا اٹھا ——— اس نے اخبار کا سہارا لیتے ہوئے کہا "آپ نے آج کا اخبار نہیں پڑھا ——— جرمنی نے وارسا پر حملہ کر دیا ہے اب دیکھیے یہ جنگ کہاں کہاں شعلہ فشاں ہوتی ہے" زاہدی بڑے مزے میں اپنے دل کی بات چھپا گیا۔

عینی کو جنگ کے خیال سے بھی دہشت ہوتی تھی۔ اس کا باپ فوج میں میجر کے عہدے پر تھا۔ اس کے باوجود وہ جنگ اور جنگ کی باتوں کو ناپسند کرتی تھی۔ جب کبھی بھی جنگ کے تذکرے نکلتے عینی زاہدی کو روک دیتی "بھئی خدا کے لیے اس گفتگو کو ختم کیجیے۔ اللہ اللہ کر کے تو کہیں لڑائی ختم ہوئی تو اب یہ بھی پتا جنگ کی بھینٹ کی نذر نہ ہو جائیں۔ اور اب پھر وہی منحوس دن سامنے آ رہے ہیں بس بس خدا کے لیے میں آپ کو کیسے بتاؤں کہ یہ جنگ مجھ کو کتنی ناپسند ہے"

دو مہینے جیسے ہفتے بن کر گزر گئے عینی کے بھائی کا یلا سر کٹنے والا تھا اور عینی سامنے لان میں گنگا کے کنارے تک جانے لگی تھی۔ ڈاکٹر ناغہ صبح کے راؤنڈ میں اس کو بڑی پابندی کے ساتھ دیکھنے آجاتا تھا۔ اور ہر روز اتنی دہان پان سی لڑکی کو زیادہ سے زیادہ فروٹ جوس پینے کی تاکید کرتا رہتا تھا تاکہ اس کی کمزوری اور چہرے کا پیلا پن جلد سے جلد دور ہو سکے۔

شام کو گنگا کے کنارے کبھی کبھی زاہدی کے ساتھ بیٹھنے میں عینی کو بڑا اچھا لگتا تھا، برسات کی امڈتی ہوئی گھٹاؤں میں بھرے ہوئے دریا کی تڑپتی ہوئی موجوں پر جب ان کے سامنے سے کوئی کشتی تیزی سے پھسلتی ہوئی گزر جاتی، تو عینی کی آنکھوں میں دم بھر کے لیے ایک چمک سی آجاتی تھی "زندگی کی کشتی بھی کبھی کبھی طوفانی حوادث میں اسی طرح ڈگمگانے لگتی ہے نا؟ اور کبھی کبھی تو ڈوب بھی جاتی ہے" عینی بڑی گمبھیرتا سے کہتی۔ زاہدی ہنس پڑتا "بھئی آپ جیسی لڑکیوں کے منہ سے ایسی فلسفیانہ باتیں سن کر بڑا عجیب سا لگتا ہے"

بہت سی باتوں کے ساتھ زاہدی عینی کی گہری نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر کے نروس ہو جایا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک روشنی سی تیر جاتی اور سانولے چہرے پر جذبات کی بجلیاں سی تڑپ اٹھتی تھیں ——— عینی نے کئی بار بڑی سادگی سے زاہدی کے چمکیلے دانتوں کی تعریف کی تھی اور پھر بڑے بھولے پن سے کہا تھا کہ "آپ کی مسکراہٹ میں بڑا انوکھا پن ہے یہ ہنسی آہستہ آہستہ سمٹتی ہوئی لبوں کے ایک کونے میں چپکے سے کھو جاتی ہے" زاہدی اس روز بہت دیر تک عینی کی گہری نگاہوں

کا تجزیہ کرتا رہا۔ عینی کی بہت سی چھوٹی چھوٹی باتیں ایسی تھیں جن کو اپنے اکیلے کمرے میں ایک معمہ کی طرح بوجھنے میں اس کو بڑا اچھا لگتا تھا۔ یہ دو مہینے کیف و سرور بن کر اس کی زندگی پر چھا گئے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ اور آنے والے دنوں کو فراموش کر چکا تھا۔

ایک دن زاہدی کالج کے کمرے میں پہنچ کر ٹھٹھک سا گیا۔ عینی کے پاپا کے ساتھ ملٹری کا ایک نوجوان آفیسر بھی آیا ہوا تھا۔ میجر شعیب بڑے خلوص سے لپک کر ملے۔ اور جب انھوں نے زاہدی سے اس نوجوان کا تعارف کرایا تو معلوم ہوا کہ وہ لفٹننٹ ساجد ہے۔ جو عینی کو خاص طور پر دیکھنے کے لیے ناسک سے چھٹی لے کر آیا ہے۔ کمرے کے اندر اتنے لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک افسردگی چھائی ہوئی تھی۔ عینی کا چہرہ اترا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں ویران ویران سی نظر آ رہی تھیں۔ میجر شعیب خوشی سے پھولے جا رہے تھے۔ اللہ نے ان کے دونوں بچوں کو نئی زندگی بخشی تھی۔ لفٹننٹ غرور بھری تمکنت سے کبھی کبھی ہاں ہوں کر کے اکھڑے اکھڑے سے ان کی باتوں کا جواب دے رہا تھا۔ اور زاہدی کو ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھولے سے کسی اجنبی کے کمرے میں آ گیا ہو۔ اس کے اداس اور گھبرائے ہوئے چہرے پر زبردستی کی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اچانک لفٹننٹ ساجد نے بڑی گہری نظر سے زاہدی کو دیکھتے ہوئے پوچھا "آپ ہی یہاں کے انچارج ہیں؟"

"جی نہیں۔ ڈاکٹر ناگیشر یہاں کے انچارج ہیں۔" لفٹننٹ ساجد کے اس اچانک سوال پر زاہدی کا چہرہ تمتما اٹھا ——— میجر شعیب نے زاہدی کی مہربانیوں اور احسان کے قصے جب سنائے تو ساجد کے اکھڑ چہرے پر ایک طنزیہ ہنسی آئی "اچھا!! ہمارے ہندوستان میں ابھی تک اتنے اچھے لوگ پائے جاتے ہیں" اور یہ کہہ کر اس نے بڑے غرور سے اپنا ہاتھ زاہدی کی طرف بڑھا دیا ——— "مسٹر زاہدی آپ کی عنایتوں کا بہت بہت شکریہ"۔ ساجد سے ہاتھ ملاتے ہوئے زاہدی کو ایسا لگا جیسے اس نے جلتی ہوئی بھٹی میں اپنا ہاتھ ڈال دیا ہو۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چمک اٹھا تھا اور وہ ایک عجیب ماحول میں اپنے کو گھرا ہوا دیکھ کر ندامت محسوس کر رہا تھا۔ عینی بڑی خاموش تھی۔ اس کے چہرے پر بیزاری جھلک رہی تھی۔ اور ایک اجنبی کی طرح، مگر بڑی ٹکٹکی نگاہوں سے وہ اس جگہ کھیلا جانے والا تماشا دیکھ رہی تھی۔ میجر شعیب نے کمرے کے اندر چھائی ہوئی اذیت رساں غیریت کا احساس کیا اور وہ بڑے پیار سے زاہدی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "بیٹا اب تو اپنی مریض کو گھر جانے کی اجازت دے دو!" زاہدی چونک پڑا "تو عینی گھر جا رہی تھی۔ وہ اس کو اکیلا چھوڑ کر چلی بھی جا سکتی تھی۔۔!"

زاہدی نے اب تک اتنی سی بات کیسے نہیں سمجھی تھی؟ وہ اتنے میٹھے خواب سے کیوں جگا دیا گیا؟ وہ تو اپنی زندگی کی ساری دلفریبیوں سے کٹ کر عینی کی آنکھوں میں جذب ہو گیا تھا۔ اپنی حیات کی ساری محرومیوں کو بھول کر عینی کی مسکراتی ہوئی بس ایک صورت ہی اس کو یاد رہ گئی تھی ——— اس نے ایک اندھیری رات میں اپنے خدا سے عینی کی زندگی کی بھیک مانگی تھی۔ پھر وہ اس کے بغیر کیسے رہ سکے گا؟ کیسے جی سکے گا۔؟

مگر وہ روتے ہوئے دل کے ساتھ مسکرا دیا۔ اب وہ ساری باتوں کو جان گیا تھا۔ ساجد کی تیز نگاہوں کی چبھن میں فوجی زندگی سے عینی کی چڑ اس کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ اس نے بڑی ہمت سے عینی کی آنکھوں میں اس کے دل پر چھائے ہوئے غم کا اندازہ لگاتے ہوئے سوچا "یہ عینی پاگل ہے جو اتنی غمگین ہو رہی ہے۔ حوصلے کی بلندی ہواؤں کے رخ کو پلٹ سکتی ہے"۔ زاہدی نے

ایک عزم کے ساتھ سوچا مگر عینی کے اس روئے روئے سے چہرے کو دیکھ کر بے اختیار اس پہ پیار آگیا کیسی بھولی سی ہے۔ یہ لڑکی جو ایک ہی ساتھ سب سے ناراض لگ رہی ہے یا مگر جب وہ اس کمرے سے باہر نکل آیا تب اس کا چہرہ یک بیک غصے سے مہک اٹھا، اس کو ساجد کا بڑھا ہوا ہاتھ ایک چیلنج کی صورت میں نظر آنے لگا۔

رات بڑی بیقرار تھی، وہ ایک پل کے لیے بھی سو نہ سکا گھڑی گھڑی اس کو وہ پہلی رات یاد آرہی تھی، جب بھی وہ اسی طرح سے بے چین تھا عینی موت کے منہ میں سسک رہی تھی، اور وہ ایک اجنبی ہو کر بھی اس کی زندگی کے لیے دعا کر تا رہا تھا۔ وہ اپنے بستر پر تڑپ اٹھا" کاش وہ دعا نہ کرتا —— عینی کے خوب صورت جسم میں زاہدی کا خون زندگی بخش ثابت نہ ہوتا۔ تو، تو پھر! آج عینی اس سے جدا نہ ہوتی ساور عینی کی آنکھیں اس طرح سے اداس نہ ہو جاتیں۔ اور زاہدی عینی کی نگاہوں میں اپنے لیے اتنی بتیابی محبت کو کبھی محسوس بھی نہ کر سکتا۔" یہ سوچتے ہی کانپ اٹھا وہ کتنا خود غرض ہو گیا تھا جو اپنی خوشی کی خاطر عینی کی موت تک چاہنے لگا تھا۔ ؟ اس کی آنکھیں جلتی رہیں اور وہ بے چینی سے اپنی پیشانی کو تکیے پر رگڑتا رہا۔ " میری عینی۔ میں تیرے بغیر کیسے زندہ رہوں گا ؟ میں تجھے پوجتا ہوں میری دیوی ! پھر میں تیری روشنی کے بنا کیسے جی سکوں گا ؟ ساری رات وہ اپنے بستر پر تڑپتا رہا اور اپنے آپ سے لڑتا رہا تھا۔ کہ جس کی ساری زندگی گناہ کی تاریکیوں میں ڈوبی ہوئی تھی پھر اس نے خدا سے اچانک فرشتوں کی پاکیزگی کی ایک معصوم کرن کی بھیک مانگ کے اپنے اندھیروں کو چند دنوں کے لیے اجالا کیوں بنا لیا تھا ؟

دوسری صبح بڑی اداس تھی اور اس کو محسوس ہو رہا تھا کہ آج نجانے کیا کچھ ہونے والا ہے۔ اپنے آپ کو بھول جانے کی خاطر وہ اپنی وارڈ کے چھوٹے سے چھوٹے کام میں الجھا رہا۔ جو کچھ وہ بھولنا چاہتا تھا اس کو بھلا نہ سکتا تھا۔ اور اس کا دل غم کے بوجھ سے ڈوبا جا رہا تھا۔

اپنی کمر میں لال بلٹ باندھے ہوئے مس جوزف اچانک باہر کے برآمدے میں سے گزری۔ زاہدی نے دیکھا اور دور تک، اس کے سفید ایپرن کے دامن کو پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اور اس کا بے اختیار جی چاہا کہ جوزف کے سوکھے سوکھے کالے ہاتھوں کو تھام کر جی بھر کے رو دیے اور پھر اس کو بتا دے کہ آج اس کا خوب صورت سپنا ٹوٹ رہا ہے۔ پھر ہمیشہ کی طرح وہ انہی اندھیروں میں ڈوب جائے گا۔ اور سسک سسک کر مٹ جائے گا۔ مگر جوزف کا خیال آتے ہی اس کی نگاہوں میں نفرت بھر گئی۔ ڈائن۔ جو اس کی خوشیوں سے جلتی رہی تھی —— اور جو آج اپنے دروازے پر گھی کا چراغ جلا کر زاہدی کے لوٹتے ہوئے قدموں کا انتظار کرے گی۔ کالی ناگن —— جس کو عینی کے جینے کا غم تھا۔ اور جو آج خوشی سے اٹھلائی پھر رہی ہو گی ..... زاہدی نفرت سے کھول اٹھا —— جوزف کی ایک ہی جھلک نے اس کے دل کے زخموں پر نشتر لگا دیا تھا۔ وہ اپنی وارڈ سے نکل آیا، اور غیر شعوری طور پر انہی جانے بوجھے راستوں پر چلتا چلا گیا، اور جب عینی کے کمرے کا پردہ اٹھا کر وہ اندر گیا تو لفٹننٹ ساجد کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کا دل ڈوب کر رہ گیا، سامان پیک ہو کر ایک طرف رکھے ہوئے تھے، عینی کا بھائی سرجیکل وارڈ سے آگیا تھا میجر شعیب بڑے پیار سے ملے، مگر عینی خاموش اور ذہنی ہیجان میں مبتلا نظر آرہی تھی، اس کا چہرہ اتنا پیلا ہو رہا تھا جیسے جاتے جاتے اس کا سارا خون کسی نے اس کے جسم سے نچوڑ کر پھینک دیا ہو۔ ساجد کی اکھڑی اکھڑی نگاہوں کے باوجود وہ زاہدی کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اور جیسے اس کی خاموش گہری اور گمبھیر آنکھیں زاہدی

سے کہہ رہی تھیں کہ "ہم زندگی کی موڑ پر ملنے والے اب دو اجنبی نہیں رہے ہیں۔ جس طرح میں اپنی رگوں میں تمہارے خون کی گرمی لے کر جا رہی ہوں اسی طرح تم میری ہر ایک سانس میں میرے پاس رہو گے۔"

زاہدی اسٹیشن تک ساتھ آیا۔ اور ڈوبتے ہوئے آفتاب کو دیکھتے ہوئے اس کو خیال آیا کہ کل وہ اس کی دنیا میں طلوع نہ ہو گا —— اور وہ اندھیروں میں سسکتا سسکتا مر جائے گا۔" اس نے عینی کو بڑی بے بس نگاہوں سے دیکھا۔ عینی اس کی دنیا سے بہت دور جا رہی تھی۔ اب راتوں کو وہ ان بھولی بھالی محبت بھری نگاہوں کی پہیلی کبھی نہ بوجھ سکے گا۔ صبح ہونے کی خوشی کہاں سے آئے گی اور سدو پہر گزار کر سنہری شام کا بیتابانہ انتظار اب کبھی اس کی زندگی میں لوٹ کر نہ آئے گا —— وہ عینی کے پاس سے دور ہٹ گیا۔ اس کی آنکھوں میں دبے ہوئے آنسو باہر نکلنے کو بیقرار ہو رہے تھے۔ عینی خود ہی اس کے قریب آ گئی "آپ ابھی سے ہمارا ساتھ چھوڑ رہے ہیں؟ —— زاہدی۔ اگر آپ آ کر میری زندگی کو بچا نہ لیتے تو آج؟ میں پاپا کے ساتھ کہاں سے جا سکتی تھی؟۔ اپنی حیات پر آپ کا کتنا بڑا احسان لے کر جا رہی ہوں میں" اور عینی بے اختیار رو پڑی۔ زاہدی نے بڑی گہری نگاہوں سے عینی کو دیکھا اور اس کی نگاہیں عینی کی آنکھوں کی جھیل میں اترتی چلی گئیں، وہاں محبت کے ہر کنول پر صرف اسی کا نام لکھا ہوا تھا۔ اور پھر اس کی نظر عینی کے سیاہ اور بہت ہی پیارے تل پر جم گئی۔ وہ ایک خود فراموشی کے عالم میں اپنے گرد و پیش کو بھول کر صرف اسی ایک تل کو تکتا رہا تکتا رہا —— گاڑی کھل رہی تھی اور وہ اسی سیاہ تل کو تکتا جا رہا تھا جس کی عظمت کے آگے اس نے بارہا عقیدت کے ساتھ اپنے سر کو جھکایا تھا اور جس کو صرف ایک بار بڑے احترام سے چوم لینے کی حسرت اس کے دل میں باقی رہ گئی تھی۔ یکایک رینگتی ہوئی کار کے دریچے سے عینی نے اپنا ہاتھ اس کی طرف پھیلا دیا اور زاہدی نے لفٹننٹ ساجد کی موجودگی کی پرواہ کیے بغیر دم بھر میں بچھڑتے ہوئے اس ہاتھ کو تھام لیا عینی کی گرم اور روئی کے گالے کی طرح نرم انگلیوں نے ایک بار اس کے ہاتھ کو زور سے دبایا اور زاہدی کی مٹھی میں کاغذ کا ایک چھوٹا سا پرزہ تھماتا ہوا عینی کا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور تک چھوٹتا چلا گیا۔ جاتی ہوئی گاڑی کا جب آخری حصہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ تو لوٹتے ہوئے اس نے کاغذ کے اس پرزہ کو کھول کر پڑھا۔ جلدی میں پنسل سے گھسیٹ کر عینی نے لکھا تھا۔

"اب میری حیات تمہاری بخشی ہوئی زندگی ہے، میں تمہارے بغیر جی نہ سکوں گی۔ مجھے بھول نہ جانا۔ زاہدی میں صرف تمہارے لیے زندہ رہوں گی —— میرے خط کا انتظار کرنا۔" صرف تمہاری عینی۔

ٹفن پر بیٹھ کر اس نے دوبارہ اس پرزے کو پڑھا۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ عینی کا لکھا ہوا ہے۔ جس عینی کو وہ ابھی ابھی کھو کر آ رہا تھا، کیا زاہدی نے اس کو ہمیشہ کے لیے پا لیا تھا، جس شرمیلی لڑکی نے اب تک اپنی محبت بھری نگاہوں کو چھپا چھپا کے رکھا تھا وہ اس سے بچھڑتے ہوئے اپنا راز راز نہ رکھ سکی؟ —— زاہدی جب اس خط کو پڑھنے کو جھکا تو اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب ایک ہی دفعہ ابل پڑا۔

"اچھا ہوا عینی کہ تیری معصوم محبت سے انجان بنا صرف تجھے پوجتا رہا تھا —— تیری محبت کا اقرار شائد مجھے اتنی پاکیزہ محبت کا سکون نہ بخش سکتا"

وہ اپنے کمرے کے اندر ویران دن اور اندھیری راتوں کو بڑی بیقراری سے کاٹ رہا تھا۔ اس گھپ اندھیرے میں

اس کو عینی کے خط کا بے چینی سے انتظار تھا۔ اب راستوں پر چلتے ہوئے اس کے قدموں میں وہ تیزی نہ رہی تھی۔ اچانک جیسے اس کا سارا کام ختم ہو گیا تھا۔ اور اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ایسے پہاڑ سے بے کیف دنوں کو کس طرح سے گزارے؟ پرزے کی گھسیٹی ہوئی تحریر کو وہ اتنی بار پڑھ چکا تھا کہ بعض دفعہ دیواروں پر وہ حرف اس کی آنکھوں کے آگے چمکنے لگتے تھے۔ ڈاکیہ جیسے اس کے کمرے کا راستہ بھول گیا تھا۔ جب خط کا انتظار اس کے لیے بہت ہی بے چین کر دینے والا بن گیا تب اس کو اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ عینی اس سے کتنی دور چلی گئی تھی! کیا وہ اس کا پتہ بھول گئی تھی؟ —— یا غلط پتہ لکھنے کی وجہ سے اس کا خط زاہدی کو نہیں مل سکا تھا۔؟ وہ اپنے آپ کو بہلاوے پر بہلاوے دیئے چلا گیا۔ آخری بار عینی کی آنکھوں میں جھلکتے ہوئے ان آنسوؤں کو یاد کرتا۔ جو اس نے بچھڑتی ہوئی گھڑیوں میں دیکھا تھا —— ! اس کو وہ سیاہ تِل یاد آ جاتا، جو اس کے پیار کی سجدہ گاہ بن چکا تھا۔ اور اپنے خون کی سرخی سے لپکتے ہوئے انار کی کلیوں کی طرح نازک سے ان لبوں کی یاد اس کے دل کو تڑپا تڑپا دیا کرتی تھی۔ مگر عینی کے خط کے انتظار کے سوا کر ہی کیا سکتا تھا —— ؟ زاہدی خط کا انتظار کرتا رہا اور تڑپتا رہا اب اس کے دل پر مایوسیوں کے بادل چھانے لگے تھے۔ لفٹنٹ ساجد کا پھیلا ہوا ہاتھ اس کی طرف بڑھتا ہوا نظر آنے لگتا۔ اس کی زہریلی ہنسی زاہدی کی روح میں نشتر چبھونے لگی تھی —— "تو پھر کیا عینی سچ مچ اُسے بھول گئی تھی —— ؟" اور جب کئی دنوں کے انتظار کے بعد بھی عینی کا خط نہ آیا تو زاہدی نے عینی کے لکھے ہوئے اس پرزے کو مسل کر میز پر پھینک دیا —— شاید عینی نے اسے روتا ہوا بچہ سمجھ کر اپنے جھوٹے لفظوں کا ٹوفی دے کر بہلانا چاہا تھا۔ اور وہ بھی کتنا بڑا احمق تھا جو ایک ایسی لڑکی کے بہلاوے میں آ گیا۔ تھا جس کے دل اور نگاہوں پر پہرے دیئے جا رہے تھے۔ ساجد کے سامنے وہ اس کو خط لکھنے کی ہمت ہی نہ کر سکی ہوگی ——

اسی طرح سے ساجد عینی کی زندگی پر چھاتا چلا جائے گا اور عینی کی نگاہوں میں زاہدی بس ایک بھولی بسری سی کہانی بن کر رہ جائے گا —— زاہدی کی آنکھوں میں اچانک سلمے کی کاجل لگی شوخ آنکھیں گھوم گئیں —— اس کا اترا ہوا اداس چہرہ یاد آ گیا —— "سلمے اب کہاں ہوگی؟ —— شوہر کی محبت اور بچوں کے پیار میں اس کو زاہدی کا خیال بھی نہ آتا ہوگا —— ؟ اور آمنہ جو برکت کے بچوں کی ماں بن کر چچا کے گھر پر راج کر رہی تھی کیا اس کو بھی کبھی زاہدی کی ایک دھندلی سی یاد آتی ہوگی؟ —— سلمے اور آمنہ کی طرح عینی کو بھی ایک دھندلکے کی طرح کبھی کبھی زاہدی کی یاد آ جایا کرے گی اور وہ اس یاد کو ذہن سے جھٹکنے کے لیے اپنی مسکراہٹوں کو اور زیادہ تیز کر دے گی، اپنی خوشبوؤں میں اور زیادہ مہکار پیدا کرنے کی کوشش کرے گی۔ مگر —— مگر اس گھپ اندھیرے میں وہ کہاں جائے گا۔ کیا کرے گا؟ —— وہ پٹنہ سے کہیں دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس دن مہینوں کے بعد وہ اکیلا ہی سینما دیکھنے چلا گیا اور واپس آ کر نیند کی گولی کھا کر سو گیا۔

دوسرے دن اس کی وارڈ میں اس کا ساتھی ہاؤس سرجن کمار مل گیا۔ وہ اپنے ہاتھ میں فارم دکھا کر بولا —— "ارے یار! اب تو میں چلا۔ دیکھو یہ فارم لے کر آ رہا ہوں، جانے والوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی ہے!"

"میں نے بھی سنا ہے کہ کرنل جہانی ڈاکٹروں کو وار میں بھیجنا چاہتے ہیں۔ اس ہوسپٹل سے بھی ڈاکٹروں کی مانگ آئی ہے"

"رات بھی تو ایک میٹنگ تھی کالج میں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وار میں جانے سے تقدیر چمک اٹھتی ہے!" کمار مسکرایا۔

"اور کبھی ہمیشہ کے لیے سو بھی جاتی ہے کمار۔" دکھ بھرے لہجہ میں زاہدی نے کہا۔

"ارے یار! تو ابھی اپنی قسمت کون سی جاگی ہوئی ہے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کی۔ ایک معمولی سی جگہ بھی تو نہ مل سکی۔" کمار نے بڑی ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"مار میں کم سے کم ذرا ٹھاٹ سے تو مریں گے۔" یہاں کس کا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ ہمارے لیے؟ بس ایک ماں ہے، جو بچاری رو دھو کے چپ ہو ہی جائے گی۔" کمار بڑی بیزاری سے بولا۔

"بھئی پٹنہ، اب بری طرح سے کھلنے لگا ہے۔ آٹھ سال کی میعاد بڑی لمبی ہوتی ہے۔ سُریش، مہندر، علی اب سب ہی جا رہے ہیں۔" کمار بولتا گیا۔

کمار کے جانے کے فوراً بعد ہی ڈاکیہ اس کے قریب آیا اور دواؤں کی کمپنی کا ایک رنگین اشتہار دے کر چلا گیا۔ اب وہ پورے طور پر عینی کے خط سے مایوس ہو گیا تھا۔ رہ رہ کر زاہدی کو لفٹننٹ ساجد یاد آتا رہا۔ اس کی ملٹری کی وردی یاد آتی رہی جس پر لفٹننٹ کا ستارہ چمک رہا تھا، وہ کتنے غرور سے باتیں کیا کرتا تھا؟ زاہدی کے دل میں نفرت کی ایک لہر سی اٹھی۔ اب اس کے اتنے دوست اسی ملٹری میں چلے جا رہے تھے، جس ملٹری کی وردی پر ساجد کو ناز تھا۔ اپنا کام ختم کر کے جب وہ اپنے کمرے کی طرف واپس جانے لگا تو راستے میں اس کو علی مل گیا۔ علی اس کا ساتھی تھا۔ اس نے علی کے خوب صورت چہرے کو بڑے افسوس سے دیکھتے ہوئے سوچا، جنگ کی بھٹی میں جلنے کے لیے یہ صورت کبھی نہیں بنی تھی، مگر علی بڑا خوش تھا اور کمیشن ملنے کے بعد کا پروگرام بنا رہا تھا "دنیا کو دیکھنے کے لیے اس کے پاس پیسے نہیں تھے اور اب جگہ جگہ محاذ پر گھوم کر وہ دنیا بھر کی سیر مفت میں کر لے گا۔" علی کے ہاتھ میں کئی فارم تھے۔ وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے زاہدی کے کمرے میں چلے آئے۔

علی کرسی پر بیٹھتا ہوا بولا "تم ہی بتاؤ ——— اس ایک طرح کی زندگی میں کون سی دلکشی رہ گئی ہے؟ وہی صبح وہی شام۔ ہمارے اس ایک اکیلے کمرے میں کیا دھرا رہ گیا ہے؟ چلو یار۔ تم بھی چلو۔ پھر ہم چیٹ کے مزے کریں گے۔" علی قہقہہ لگا کر بولا "مرنا تو بس ایک ہی بار ہے نا۔"

زاہدی کی میز پر کئی فارم رکھ کر جب علی چلا گیا تو زاہدی نے سوچا اس کے سب ہی ساتھی چلے جا رہے ہیں۔ وہ یہاں اکیلا رہ کر کیا کرے گا؟ عینی کے خط کے انتظار میں بس اسی طرح سے سسکتا ہوا پڑا رہے گا؟ اور اس کے کانوں میں دور سے ایک ملٹری آفیسر ساجد کے قہقہے سنائی دیتے رہیں گے۔ وہ زندگی کے ہر ایک موڑ پر مات کھانے کو تیار نہ تھا۔ اس نے اچانک میز پر سے فارم اٹھایا اور تیز چلتا ہوا کرنل دہانی کی کوٹھی میں داخل ہو گیا۔ فارم پر ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ کے دستخط ہونا ضروری تھے۔ جب وہ اپنے فارم پر دستخط کرا کے واپس آنے لگا تو سامنے کالج کا وہی گیٹ کھلا ہوا تھا جس سے خوشیوں کے ساتھ گزرتا ہوا وہ عینی کے پاس کبھی پہنچتا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں واپس آ کر غم سے نڈھال ہو کر گر پڑا۔ اس کو اپنی ماں کی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسو یاد آ گئے۔ اپلوں کے دھوئیں سے مہکتا ہوا وہ پیارا آنچل یاد آ گیا، جس سے لپٹا کر ماں اس کو پیار کر لیتی تھی۔ باپ کا تھکا ہوا درد و کرب میں ڈوبا ہوا چہرہ نگاہوں میں گھومنے لگا۔ چھوٹے بھائی بہنوں کی چیخیں کانوں میں گونجنے لگیں۔ وہ کتنا سخت دل تھا جو زمانے سے ان پیاری صورتوں سے دور رہا تھا ——— ! زاہدی کی آنکھوں سے آنسوؤں کے گرم گرم قطرے ڈھلک پڑے۔

مگر اس نے اپنے بہتے ہوئے آنسوؤں کو پونچھ کر سوچا کہ زندگی کی دوڑ میں اس کو پیچھے نہیں رہنا چاہیئے۔ اس کے گاؤں کا مستقبل بے حد اندھیرا تھا۔ اپنے بھائی بہنوں کے لیے بہت کچھ کرنے کی ابھی ضرورت تھی ——— پھر وہ جنگ میں اکیلا تو نہیں جا رہا تھا۔ سارے ہندوستان سے لوگ چلے جا رہے تھے۔

جب وہ فارم کو بھر چکا تب اس کے ہونٹوں پر نفرت بھری مسکراہٹ آئی ——— "لفٹنٹ کا بچہ — اپنے کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا" ——— اور پھر جلدی جلدی اس نے اپنے دستخط کر دیے۔ یہ سارا ہفتہ اس نے انگاروں پر لوٹتے ہوئے گزارا تھا۔ محبت کی سوزش سے کہیں زیادہ رقابت کی آگ میں وہ تڑپتا رہا تھا۔ درخواست دے کر ہسپتال سے دو دن کی چھٹی لے کر وہ اپنے گاؤں چلا گیا ——— مگر پر کسی سے کچھ کہنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ جب واپس آیا تو تیسرے دن زرد لفافے میں رجمنٹ کال پر اسے وہاں جانا تھا۔ جہاں انسان کو انسان مار رہا تھا۔ بم اور شل گر رہے تھے۔

جب آنے سے ایک دن پہلے زاہدی کو علینی کا خط ملا وہ اس بند لفافے کو دیکھ کر سوچتا رہا کہ اسی ایک خط کے انتظار نے تو اس کی دنیا بدل دی تھی۔ اس خط کے پانے کا وہ پہلا سا اضطراب مٹ چکا تھا۔ اس نے روٹھے ہوئے انداز میں بڑی بے پروائی سے خط کو پڑھا۔ اور ایک مظلوم تھکی ہوئی سی مسکراہٹ بے اختیار جھلملاتی ہوئی اس کے لبوں کے اس داہنے کونے میں سمٹ کر پیچھے سے بجھ گئی۔ وہ اپنا سر تھام کر بیٹھ رہا۔ اس نے کیا کر دیا تھا۔ علینی جیسی پُر خلوص لڑکی کی معصوم محبت پر شبہ کر کے اس نے کتنا بڑا گناہ کیا تھا۔ علینی گھر جاتے ہی بیمار ہو گئی تھی ——— اور شاید اس سے ناراض ہو کر فوجی طلبی پر واپس چلا گیا تھا۔ علینی نے لکھا تھا کہ وہ زاہدی کی مسکراہٹ کے بغیر ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا محسوس کر رہی ہے اس کی دنیا میں اس کا آفتاب کب چھپے گا پھر اس نے بڑی معصومیت سے لکھا تھا کہ "جب میں اپنے کالج واپس جاؤں گی تو تم کو لکھوں گی مجھے اسٹیشن پر ضرور آ کر ملنا" زاہدی اس چھوٹی سی لڑکی کی سادگی پر بے اختیار ہنس پڑا "کون جانے اس وقت تک میں کہاں رہوں گا علینی!" —

پہلی ٹریننگ اس کو جھانسی میں ملی تھی جہاں اس کا دل ذرا بھی نہ لگتا تھا علینی کو پہلا خط اس نے وہیں آ کر لکھا تھا ——— اس کو کسی لڑکی کو پیار بھرا خط لکھنا نہ آتا تھا وہ کئی خط لکھ لکھ کر پھاڑ چکا تھا۔ آخر میں اس نے ایک مختصر سا خط لکھا جس میں اس نے بس اتنا ہی لکھا تھا کہ۔

میں تم سے شرمندہ ہوں علینی جو تم کو یہاں سے خط لکھ رہا ہوں اب تم مجھ سے یہ نہ پوچھو کہ میں یہاں کیسے آ گیا!۔

کاش تمہارا خط مجھ کو اتنی دیر سے نہ ملتا اور اس طرح سے میں تمہارے سامنے مجرم نہ بنتا!"

فوجی ٹریننگ میں اس کا جی الجھا الجھا سا رہتا تھا اور کبھی کبھی وہ اپنے آپ پر جھلا اٹھتا کہ اس نے خواہ مخواہ کا ایک روگ اپنی جان کو کیوں لگا لیا تھا۔ ——— قسم قسم کے لوگ، اور بھانت بھانت کی بولیوں کے درمیان اس کو کبھی سکون نہ ملا۔ چھاؤنی کے اندر بس ایک ہی نقشہ چھا رہی تھی۔ جنگ۔ جنگ اور صرف جنگ! ایک دائرے میں ان کی زندگی مقید ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر آتے آتے علینی کا خط اس کو نہ ملتا تو شاید بندوقوں اور توپوں کی گرج میں وہ اپنے آپ کو کھو دیتا۔ مگر اس بیگانے ماحول میں اس کو علینی کی ادا اسی یاد آ جاتی جب وہ جنگ کی باتوں سے گھبرا کر التجا کرنے لگتی تھی کہ خدا کے لیے ——— ان باتوں کو نہ چھیڑیئے!! دار میں جانے والے دوست دوسری دوسری چھاؤنیوں میں بھیج دیئے گئے تھے۔ سارے چہرے یہاں اس کے

لیے اسجانے تھے اور وہ اتنا الجھا الجھا سا رہتا تھا کہ مختلف صوبوں کے نوجوانوں میں اپنے کو کھپا بھی نہیں سکتا تھا۔ چھاؤنی کے پتے پر عینی کا جب پہلا خط اس کو ملا تو اس کو کھولتے ہوئے اس کی انگلیاں کانپنے لگی تھیں۔

عینی کے خط کے ایک ایک لفظ سے درد بھری ٹیسوں کا چھپا ہوا اظہار ہو رہا تھا۔ ساجن کی جس دوری نے اس کی آنکھوں میں نفرت کی لہر اٹھا کرتی تھی۔ اب وہی دوری۔ وہی چھاؤنی میں زاہدی کی زندگی پر مسلط تھی۔ عینی نے اپنے خط میں زاہد کی عظمت اور بلندی کا ایسے اظہار کیا تھا کہ زاہدی کا سر شرمندگی سے جھک گیا ـــــ عینی کا دل کتنا خوب صورت تھا ـــــ اور اب سے پہلے عینی کو اس نے اپنی وہی تصویر بھیجی جو اس کے ساتھیوں نے چھاؤنی میں کھینچی تھی۔

(۸)

جنگ بڑی تیزی سے بھڑک اٹھی تھی۔ برطانیہ کا وقار لرزنے لگا تھا۔ ہر طرف ایک بھیانک اندھیرا اور ہیجان چھا رہا تھا۔ اور ہندوستانی نوجوان دھڑا دھڑ محاذوں پر پہنچے جا رہے تھے۔ ان کے اپنے ملک میں کوئی جنگ چھڑی ہوئی نہیں تھی۔ وہ اپنی مادر وطن کی سرحدوں کو محفوظ بنانے کے لیے شہید ہونے کو جا رہے تھے۔ ان کی لٹی ہوئی ماں کے سر پہ اوڑھنی نہیں تھی۔ اس کا گریبان چاک چاک تھا اور اس کی چھاتیاں ننگی ہو رہی تھیں۔ مادر وطن کی ننگی چھاتیوں کو دیکھ دیکھ کر اس کے بچے شرم و حیا سے اپنے سروں کو جھکائے جا رہے تھے۔ انہی سوکھی ہوئی چھاتیوں سے بے مانگے انہوں نے دودھ پیا تھا ـــــ اور اسی دکھیاری ماں کی محبت کے سہارے ان کے جوان بازوؤں میں جنگ لڑنے کی طاقت آئی تھی ـــــ اور اب ـــــ وہ اپنی اسی مقدس ماں کا دکھ دور کرنے کے لیے اپنے خون کا بلیدان دینے کو جا رہے تھے۔ ماں کے سر پر جب ستاروں بھری پروقار اوڑھنی ہوگی اور اس کے جسم پر خوب صورت سا اپنا لباس ہوگا، تب وہ بھی ساری دنیا سے اپنی آنکھیں ملا سکیں گے اور پھر وہ بھی بہادر سپوتوں میں شمار ہوں گے اور ماں کے شاداب چہرے پر فخر بھری مسکراہٹ ہوگی۔

ٹریننگ ختم ہوتے ہی زاہدی افریقہ کے محاذ پر بھیج دیا گیا۔ اب وہ رفتہ رفتہ جنگ کی ہولناکیوں کا عادی بنتا جا رہا تھا۔ موت کی گھاٹیوں میں زندگی بڑی ارزاں تھی۔ اور حیات کے ایک ایک لمحے کی قدر کرتے ہوئے لوگ عشرتوں کے پیمانے کی آخری تلچھٹ بھی بڑی حریصانہ پیاس سے پی رہے تھے۔ موت کے سیاہ بادل سروں پر منڈلاتے رہتے اور وہ اپنے آپ کو بھولے ہوئے نشے میں جھوم رہے تھے۔ سامنے میدانوں میں لاشیں پڑی تھیں۔ زخمی سسک سسک کر دم توڑ رہے تھے، توپوں کی گرج سے زمین دہل پڑتی تھی مگر محاذ پر سے آیا ہوا تھکا ہارا انسان اپنی موت کی ہچکی لینے سے پہلے اپنے آپ کو بھول جانے کی خاطر سچ مچ میں وحشی بن رہا تھا ـــــ جنگ بھی دنیا کی تہذیب اور انسانیت کے لیے سب سے خراب ادارہ تھا، ایک جیتے جاگتے محبت کرنے والے انسان کو مار ڈالنا اور پھر انہی کے ہاتھوں سے بیدردی سے مر جانا ـــــ کتنی بڑی درندگی تھی۔ زاہدی محاذ پر آ کر صحیح طور پر عینی کے جذبات کی قدر کر سکا تھا۔

اتحادی فوجوں میں ہندوستانی بٹالین آگے بڑھتے صحراؤں سے ہوتی ہوئی اریٹریا تک پہنچ گئی تھی۔ فوجی ہسپتال محاذ سے دور رہتا ہوا بھی خطرے سے باہر نہ ہوتا تھا۔ ہسپتال کے کیمپوں کے اوپر ریڈ کراس کا سرخ اور امن کا سفید نشان

دیکھتے ہوئے بھی دشمن کے طیارے جہاں تہاں اپنے بموں کے گیند اچھالتے پھر رہے تھے۔ زندگی کی بڑی ہیبت ناک گھڑیاں بیت رہی تھیں مگر تہذیب و تمدن کی دھجیاں اڑاتی ہوئی انسانیت پھر بھی سرنگوں نہ ہوتی تھی ——— سارا دن اسی طرح خاک و خون اور مرہم پٹی میں گزر جاتا ——— کراہوں اور زخمیوں کی چیخوں سے دلوں میں ہوکیں اٹھتی رہتی تھیں۔ جب کسی رات کو بمباری نہیں ہوتی تھی یا ذرا کم ہوتی تو اسی رات نابدی کو تھوڑا سا سکون ملتا تھا۔ اور اپنے ہسپتال کے کیمپوں سے ذرا دور ہٹ کر خلوص بھرا سادہ سادہ سا پیار اور خوشی سے بھرا ہوا عینی کو خط لکھا کرتا تھا ——— اور عینی کا بھی ایک خط مہینے میں بڑی پابندی کے ساتھ مل جایا کرتا تھا۔ عینی کے خطوں سے ایک جانی پہچانی ہوئی خوشبو کو محسوس کر کے اس کی ساری تھکان دور ہو جاتی تھی۔ اریٹیریا کے تپتے ہوئے ریگستان میں اس کو کبھی کبھی عینی کی آنکھوں کی مقدس جھیل بڑی شدت سے یاد آ جاتی اب وہ ان آنکھوں کو کبھی نہ دیکھ سکے گا۔ جنگ کی اس تپتی ہوئی بھٹی میں انسان سوکھے پتوں کی طرح جھلس کر ہمیشہ کے لیے مٹ رہا تھا جن کا کہیں مزار نہ ہوتا اور نہ جس پر فاتحہ کے لیے کسی عزیز کے ہاتھ اٹھتے تھے ——— اپنے سینوں میں گنتی کی چند سانسیں لیے لوگ جنگی محاذ پر اپنی حیات کو چوم رہے تھے اور وحشی طور پر بڑی ہوس سے اپنی آرزو کو پورا کر رہے تھے۔

اتحادی فوج فتح کا ترانہ گاتی ایک سیلاب کی طرح آگے سے آگے کی طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ اٹلی کے چھوٹے چھوٹے اطالوی مقبوضے بڑی بزدلی سے شکست کھاتے ہوئے پیچھے ہٹتے چلے گئے۔ آخر فوجی بینڈ فتح و مسرت کا ترانہ گاتا ہوا اسمارہ کے قلعے کی طرف بڑھتا چلا گیا ——— اور گھمسان کے مقابلے کے بعد کاؤنٹ کا قلعہ جیت لیا گیا۔ اس روز ساری فوج نے بڑے جوش سے خوشی کا دن منایا تھا۔ اور اسی رات کو نابدی نے بڑے سکون کے ساتھ عینی کو لکھا تھا ——— "آج فضا صاف اور نکھری ہوئی ہے بہت دنوں کے بعد آسمان پر ستارے بڑے روشن نظر آ رہے ہیں۔ روز کی طرح گرم ہواؤں میں ریتوں کی وہ چبھن بھی محسوس نہیں ہو رہی ہے دور پہاڑوں سے ٹکراتا ہوا فاتح نوجوانوں کے گانے کا مدھم شور سنائی دے رہا ہے۔ عینی آج یہاں جنگ نہیں ہے۔ بمباری بھی نہیں ہے۔ آج کی رات زندگی یہاں زندہ رہنے کی خوشی میں جھوم رہی ہے۔ اپنے آپ کو چوم رہی ہے۔ شراب کے دور چل رہے ہیں۔ نازک لبوں پر پھسلتے ہوئے نغمے کی گونج دلوں میں ہل چل مچا رہی ہے۔ خیموں کے اندر اور گرم ریتوں کے اوپر خوشیاں ناچ رہی ہیں گھنگھرو کی جھنکاریں موت کی وادی سے دور زندگی کی سمت بے تابانہ طور پر کھینچ رہی ہیں ——— اور ایسے وقت میں جب آج اردلی نے مجھ کو تمہارا خط لا کر دیا۔ تو تمہارے خط پانے کی مسرت میں میں نے ایک سیب کھا لیا ہے اور ایک سیب اس اردلی کو بھی انعام میں دیا ہے جس نے آج مجھ کو سچ مچ کی خوشی پہنچائی تھی۔"

اسمارہ میں اطالین فوج کے مورچوں پر سے ڈھیروں اسلحہ اتحادیوں کو ملا تھا ——— کاؤنٹ کے قلعہ کے اندر ایسے مونوگرام چھپے ہوئے برتنوں میں اتحادی فوجیوں نے اکڑ اکڑ کر کئی دنوں تک کھانا کھایا تھا۔ اور اسمارہ کی گلیوں میں وہاں کے لڑکے گولیوں کے پیالے چھوڑ چھوڑ کر اک نیا کھیل کھیل رہے تھے۔ ریتیلے میدانوں اور صحراؤں کے تیکھے نقش و نگار والی دراز قامت اور گٹھیلے جسموں والی دوشیزائیں عجیب زبانوں کے ترنم میں دف بجا بجا کر فتح اور خوشیوں کے ترانے گا رہی تھیں۔ وہ اپنے راگ اور نغموں سے فوجیوں کا درد دور کر رہی تھیں۔ اپنے پیار بھرے گیتوں سے تھکے ہوئے نوجوانوں کی رگوں میں بہادری کے جوش کو تازہ کر رہی تھیں ——— نابدی کی وردی میں کیپٹن کے ستارے چمک اٹھے تھے مگر اس کی راتیں اسی طرح اداس اور اندھیری تھیں۔

اس کے بے رنگ و بے کیف دنوں میں پہلے ہی گناہوں کا اتنا بڑا بوجھ تھا جس کی تلافی ممکن نہ تھی اور علینی کے خیالوں کی بلندی تک پہنچ کر چاند اور ستاروں جیسی پاکیزگی تلاش کر رہا تھا۔ اس کو ایک مقدس رات کا احترام اب تک یاد تھا جب اس کے گناہوں کو بھول کر خدا تعالےٰ نے اس کی دعا کو قبول کر کے ایک ڈوبتے ہوئے دل میں نئی زندگی بخش دی تھی ——

زاہدی کی فوجی بٹالین پھر لیبیا کی طرف بھیج دی گئی۔ اتحادی فوجوں کے اندر جو اک سکون آ گیا تھا وہ اب مٹنے لگا تھا۔ اطالوی فوج کی پسپائی کے بعد جگہ جگہ جرمن فوج نے مورچے سنبھالنے شروع کر دیئے تھے۔ اتحادیوں کی بے چینی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی اور ساری فوج کے اندر ایک ہل چل سی مچ گئی تھی۔ العالمین کے صحراؤں میں زندگی اور موت کا اصل مقابلہ شروع ہو گیا تھا۔ دھوئیں کے بادلوں میں آسمان گھرا رہتا، زمین کے سینے پھٹ رہے تھے اور کائنات دہلی جا رہی تھی۔ ریتوں پر انسانی خون کے پرنالے بہہ رہے تھے اور طاقت، طاقت کو مٹا رہی تھی —— زندگی اور محبت کے فرشتے سر جھکائے رو رہے تھے اور عزرائیل کا ہیبت ناک قہقہہ صحراؤں میں آگ لگا رہا تھا۔ زاہدی کا کیمپ زخمیوں سے بھر گیا۔ اس کا ہسپتال پہاڑوں کی اوٹ میں چھپا ہوا تھا، جہاں مرنے والوں کی دبی دبی کراہیں اور بے قرار چیخیں چٹانوں میں گونجتی ہوئی ان کے سینوں میں خاموش ہو جاتی تھیں۔ دھوپ کی کرنوں اور چاندنی راتوں میں چمکنے والے ریتوں کا صحرا انسان کے خون سے رنگین ہوتا جا رہا تھا۔ فضا میں بموں اور شیلوں کے کثیف بادل چھائے رہتے اور بارود اور گندھک کی بدبو کے ساتھ انسانوں کے گوشت اور ہڈیوں کی جلی ہوئی بدبو ساری کائنات میں بسی ہوئی تھی۔ مردار خور گدھ منڈلاتے رہتے اور زمین پر دبکے ہوئے جنگلی کتے اور گیدڑ اپنے لمبے لمبے خونخوار دانتوں کو کھولے انسانی لاشوں کو نوچ نوچ کر کھا رہے تھے۔ اور یوں زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑا قیمتی اور بہت ہی پیارا بن گیا تھا —— ان ساری درندگیوں اور ہولناکیوں میں زاہدی کا دل لرزتا رہتا۔ اس کے چاروں طرف بم اور شیل گر گر کر پھٹتے رہتے۔ اور مشین گنوں سے تڑا تڑ گولیوں کی بوچھاڑیں ہوتی رہتی تھیں۔ اچانک دل کے دل بادلوں کی طرح آسمان پر طیارے چھا جایا کرتے پھر آگ کی بارشیں ہونے لگتیں اور دم بھر میں انسانی زندگیاں سوکھی ہوئی گھاس کی طرح بھک سے جل کر راکھ کا ایک ڈھیر بن جاتی تھیں۔

ایسے وقت میں علینی کے خط سے بھی اس کو کوئی تسکین نہ ملتی تھی، دو چار چھوٹی چھوٹی باتوں کے سوا پورے کا پورا خط سیاہ دھبوں سے بھرا ہوا ملتا تھا اور علینی کے خطوں میں بھی انہی سیاہ پردوں کا رونا کہیں کہیں دھبوں میں سے جھلک آتا تھا —— سنسر والوں نے دو محبت کرنے والے دلوں کے درمیان ایک اندھیری دیوار کھڑی کر دی تھی۔ آخر سیاہی کے یہ دھبے گہرے ہوتے چلے گئے اور پھر کچھ دنوں کے بعد خط کا آنا ہی بند ہو کر رہ گیا۔ اتنی بھیانک جنگ میں خوشی اور تسکین کا جو ایک ہلکا سا سہارا تھا، اب وہ بھی مٹ کر رہ گیا تھا —— زاہدی کی نگاہوں کے سامنے جنگ کی ایسی قیامت خیزیاں تھیں کہ علینی کے خط کا اب کوئی انتظار بھی باقی نہیں رہا تھا۔

لڑائی وحشیانہ صورت اختیار کر چکی تھی۔ دو دن قبل جرمنی کی بمباری سے زخمیوں سے بھرا ہوا ہسپتال بھک سے اڑ کر رہ گیا تھا، ہسپتال کا کچھ اسٹاف پہاڑوں کی اوٹ میں بھاگ کر اس وقت پناہ لینے چلا گیا تھا۔ بمباریاں ہوتی رہیں۔ زمین کانپتی رہی، دل دھڑکتے رہے اور کانوں کے پردے پھٹتے رہے۔ جب ذرا سکون ہوا تو لوگ اپنے

اپنی پناہ گاہوں سے لوٹ کر آ گئے۔ زاہدی جب واپس آیا تو ہسپتال کی جگہ سلگتی ہوئی ہڈیاں چیخ رہی تھیں اور جلتے ہوئے گوشت کے لوتھڑوں سے دھواں نکل رہا تھا۔

ہندوستان سے تازہ دم آئی ہوئی کمک کی خبر سن کر تھکی ہوئی فوج میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ پھر بھی آفیسروں کے دلوں پر حالات کی نزاکت کا بہت بڑا بوجھ تھا ——— زاہدی کو ہسپتال پر بمباری کا بے حد افسوس تھا۔ بہت سے زخمیوں کی حالت بہتر ہو چلی تھی۔ اور بہت سے مریض مدت کے خیال سے کانپ کانپ اٹھتے تھے۔

بڑی افسردہ اور دھیمی چال سے چلتا ہوا زاہدی کینٹین کے اندر داخل ہوا اور سامنے میز کے پاس آ کر ٹھٹھک گیا۔ میجر ساجد اس کے قریب ہی کھڑا تھا ——— زاہدی کی آنکھوں میں ناگواری کی ایک چمک پیدا ہو کر فوراً ہی بجھ گئی۔ میجر ساجد اس کی طرف بڑھتا چلا آیا۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ ان نگاہوں میں شکوہ تھا، رقابت تھی اور چھپی ہوئی نفرت کی ایک جھلک بھی تھی۔ اس کے باوجود ساجد نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ زاہدی کی طرف بڑھا دیا ——— زاہدی کا ہاتھ بے اختیار اپنی پیشانی پر چلا گیا اور اس نے ایک آفیسر کے آگے سلیوٹ کرتے ہوئے بڑے احترام سے اپنا ہاتھ پیش کر دیا ——— !

میجر ساجد نے اپنا سگریٹ کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بہت دھیمے سے کہا ——— "کیپٹن زاہدی ——— ایک فوجی اپنے ملک کے ایک ایک چپے کی حفاظت کرتے ہوئے اپنی جان قربان کر دیتا ہے۔ اسی طرح ہم دونوں ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ لیکن جنگ کے میدان میں ہماری اور آپ کی حیثیت ایک سی ہے۔ اور نہ ہماری ہار اور جیت بھی ایک ہی سی۔ پھر کیوں نہ اتنے دنوں تک کے لیے ہم ایک دوسرے کو معاف کرتے ہوئے آپس میں صلح کر لیں!" زاہدی حیران رہ گیا۔ ساجد اتنے بلند کیریکٹر کا انسان تھا!

وہ بڑی سچائی اور سادگی سے ایک دوسرے سے ملتے رہے۔ ان کی باتوں میں جنگی مصروفیتوں کے ساتھ ساتھ دوستانہ انگ بھی ہوتا تھا۔ پھر جنگ تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی۔ حیات کی گھڑیاں بڑی عزیز بن گئی تھیں اور منٹوں میں ختم ہوتی ہوئی زندگی پر سے اعتبار اٹھ گیا تھا ——— زاہدی کے ہسپتال میں زخمیوں کی اتنی کثرت ہو گئی تھی جیسے گوداموں میں بھرے ہوئے بورے۔ صبح کی اچانک بمباری میں لوگ بری طرح سے زخمی ہو ہو کر ہسپتال لائے جا رہے تھے۔ محاذ پر بھی بڑے گھمسان کا رن پڑا تھا۔ اتحادی فوج اپنی ساری طاقت سے حملہ کر رہی تھی مگر جرمنی کی طاقت کے آگے اپنی فوج کے قدم آہستہ آہستہ اکھڑتے چلے جا رہے تھے۔ سب کے دل بے چین تھے۔ سب کی آنکھوں تلے زندگی کا انجام نزدیک تر آ گیا تھا

صبح سے ایک ساں زخمیوں کی دیکھ بھال اور آپریشن میں زاہدی تھک کر چور ہو رہا تھا۔ کہ اچانک اسٹریچر پر ایک مریض کو لاتے ہوئے بہت سے لوگوں کی ملی جلی آوازیں اس کے پاس گونج اٹھیں۔ کرنل نے بدحواسی میں اس کے قریب آتے ہوئے چلا کر کہا "کیپٹن کیپٹن! جلدی کرو جلدی۔ میجر بہت زخمی ہو گیا ہے اور ہم اپنے مورچے سے پیچھے دھکیلے جا رہے ہیں۔" محاذ پر کسی آفیسر کا زخمی ہونا ہی اس بات کی دلیل تھی کہ فوج کے قدم اکھڑے جا رہے ہیں۔ زاہدی نے دوسرے زخمیوں کو اسسٹنٹ پر چھوڑ دیا اور کرنل کے قریب آ کر زخمی میجر پر جھکا تو یکبارگی اس کا سارا جسم تھرتھرا کر کانپ گیا۔ بم کے ٹکڑوں نے میجر ساجد کے

سارے جسم کو چھلنی کر دیا تھا۔ فضا میں موت کا سایہ پھیلا ہوا تھا اور زاہدی ساجد کو ہر قیمت پر بھی بچا لینے کو بیقرار ہو گیا۔ دن بھر کی لگاتار محنت کے بعد رات کے وقت ساجد کو ہوش آ گیا۔ زاہدی اپریشن کے بعد اس کے جسم میں پانی اور خون چڑھاتے چڑھاتے تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ پانی اور خون کے قطرے جب پاس کرنے لگتے تھے تو زاہدی کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا اور جب راستے بلوک ہو جاتے اور پانی یا خون کا قطرہ اپنی جگہ پر تھم جاتا تو پھر وہ مضطرب ہو جاتا تھا۔ رات کی خون آشام گھڑیوں میں اچانک ساجد نے اپنی کپکپاتی ہوئی سرد انگلیوں سے زاہدی کے گرم ہاتھوں کو تھام لیا۔ اس کی آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگی تھی۔ اور ایک بحرانی کیفیت میں وہ دیوانوں کی طرح بولتا چلا گیا "کیا تم ——— ہاں تم اس آگ سے بچ جاؤ گے؟ ——— یاد رکھو یہ جنگ ——— آگ کا سایہ سمندر تم کو عینی سے کبھی نہ ملنے دے گا۔ مگر تم ——— تم مجھ کو بچانے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟ میں تمہارے راستے کا پتھر ہوں۔ بہت بڑا پتھر! آہ! میرے سارے جسم میں آگ سی لگ رہی ہے۔ شاید ——— شاید میں مر رہا ہوں" وہ بڑی نقاہت سے بولا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

دوسرے دن ساجد کے جسم سے بہتا ہوا خون رک گیا تھا۔ گلوکوز اور کورامین کے انجکشنوں سے اس کے اندر تھوڑی سی طاقت آ گئی تھی۔ اور پیلے رنگ کے کمزور چہرے پر دوبارہ زندگی پا لینے کی ایک ہلکی سی رونق بھی چمک اٹھی تھی۔ زاہدی نے خوش ہوتے ہوئے جب اس کو نئی زندگی ملنے کی مبارک باد دی تو ساجد نے بڑے خلوص سے اس کے ہاتھ کو تھام لیا اور کہنے لگا۔

"کیپٹن زاہدی ——— مجھے افسوس ہے کہ پہلے پہل جب ہماری ملاقات ہوئی تھی تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف اچھی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ چند مہینے پہلے عینی سے میری منگنی ہو چکی تھی۔ میں نے اس کو دیکھا نہیں تھا۔ منگنی سے پہلے مجھ کو اس کی جو تصویر دی گئی تھی وہ مجھے بے حد پسند آئی تھی۔ اتنی کہ آج بھی وہ تصویر میری وردی کی جیب میں موجود ہے اور کبھی مجھ سے جدا نہ ہوئی۔ میں بڑے شوق سے عینی کو دیکھنے کے لیے ہسپتال میں آیا تھا ——— مگر ایک اکسیڈنٹ کے طور پر تم ہم دونوں کے درمیان میں آ چکے تھے ——— اور میں نے پہلی ہی نظر میں محسوس کر لیا تھا کہ تم نے عینی کی آنکھوں میں میرے لیے محبت کی ایک بوند بھی باقی نہیں چھوڑی تھی ——— میں تڑپ اٹھا ——— اور ایک عہد کر رکھا تھا کہ تم کو اپنے راستے سے ہٹا کر رہوں گا" ——— ساجد نے آہستہ سے اپنا کمزور ہاتھ اٹھایا اور اپنی وردی کی جیب کو ٹٹولنے لگا ——— "میں ایک فوجی آفیسر تھا ——— اور یہ جانتا تھا کہ اپنے ایک ایک چپے کی حفاظت میں زندگی کو مٹا دینا بھی کوئی بڑی بات نہ تھی ——— مگر جب ہم دوبارہ ملے تو جنگ کے اس میدان میں ہماری حیثیت بالکل دوسری تھی۔ یہاں ہمارے لیے کوئی عینی نہیں تھی۔ ہماری محبت ہماری مجبوری تھی اور دشمن کا محاذ ہمارا رقیب تھا" ——— وہ بڑے درد سے کراہ اٹھا ——— "تم نے مجھے بچایا ہے زاہدی ——— اگر زندہ رہا۔ تو پھر آگے چل کر ہم اچھے دوست رہیں گے۔ اور نہیں تو ——— پھر خدا حافظ" بولتے بولتے اس کی آواز بھرا گئی ——— زاہدی کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر گئے تھے ——— !

مگر تیسرے دن اچانک کچھ کہنے سننے بغیر وہ خاموشی سے مر گیا۔ زاہدی چپ چاپ ٹکٹکی لگائے اس کے مردہ ساکت چہرے کو دیکھتا رہا توپوں کی گرج کائنات میں ہل چل مچا رہی تھی۔ زمین کا کلیجہ دہلا جا رہا تھا۔ زندگی پانی کے

بلبلوں کی طرح مٹتی جارہی تھی ـــــ اور زاہدی، ساجد کی لاش کو حسرت کی نظر سے دیکھتا رہا۔ بڑے اضطراب اور کرب کی حالت میں زاہدی نے ساجد کی وردی کی جیب سے عینی کی تصویر نکال لی اور اتنی ہولناک جنگ کے ہوتے ہوئے بھی بڑی کوششوں اور محنتوں کے بعد اس نے ایک پہاڑی سائے کے نیچے محفوظ جگہ میں ساجد کو دفن کردیا اور اس کے سرہانے پتھر کی چٹان پر سفید چاک سے لکھ دیا "میجر ساجد۔ یہاں پر ایک ایسی گہری نیند سو رہا ہے جس کو محبت بھری کوئی پکار بھی اب کبھی نہ جگا سکے گی!" اتنا کام کرنے کے بعد زاہدی کو تسکین سی مل گئی۔

ایک زمانہ ہوا اس نے عینی کی تصویر کو دیکھا تھا۔ مگر اس تصویر کا ایک ایک نقش بہت پہلے سے اس کی آنکھوں میں سمایا ہوا تھا۔ اس کو عینی کی تصویر دیکھ کر کچھ خوشی نہ ہوئی ـــــ ایک عجیب طرح کا اضطراب اس کے دل میں بھر گیا تھا۔ یہ تصویر اس کو ساجد کے مردہ جسم سے لپٹی ہوئی ملی تھی ـ اس کو ساجد کی شربتی رنگ کی بڑی بڑی آنکھیں یاد آگئیں۔ وہ اس تصویر کو کتنے شوق اور کتنے پیار سے دیکھتا رہا ہوگا۔ ان لبوں کو چومتے وقت اس کے ہونٹ کیسے بیقرار ہوتے ہوں گے! اور تصویر میں عینی کا یہ سیاہ تل بھی اس کو اپنا ہی نظر آتا رہا ہوگا۔ یہ تصویر پاس عینی کی تھی جس کو زاہدی جانتا بھی نہ تھا۔ جب یہ تصویر ساجد کو بھیجی گئی ہوگی تو عینی کے دل میں ساجد کے لیے کیسی کیسی تمنائیں ہوں گی!۔ اور ساجد کا انتظار کرتے کرتے اچانک غلطی سے اس کو زاہدی مل گیا تھا۔ محض ایک اجنبی کی صورت میں جو اس کے ہسپتال کا انچارج نہ ہوتے ہوئے بھی اس بیمار لڑکی سے ہمدردی کرنے لگا تھا پھر وہی ہمدردی رحم اور اخلاص سے گزرتی ہوئی محبت بن گئی تھی۔ اور اب وہی محبت زاہدی کی اجاڑ زندگی کا ایک سہارا بن چکی تھی اس کا جی بے اختیار چاہا کہ عینی کی تصویر کو چوم لے۔ مگر وہ جیسے ہی اس کو چومنے کو جھکا عینی کی اس تصویر پر ساجد کے مردہ لبوں کے دھبوں کے سائے نظر آنے لگے اور دفن کیے ہوئے ہونٹوں کی ایک ایک لکیر زاہدی کے دل کو چیرتی ہوئی اس کی روح میں اترتی چلی گئی۔ زاہدی نے گھبرا کر تصویر کو میز پر ڈال دیا۔ اس کو اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔ وہ اک چور تھا جس نے ساجد کے مردہ جسم سے لپٹی ہوئی یہ تصویر چرائی تھی۔ اب اس کو عینی کے خیال اور عینی کی تصویر سے بھی وحشت ہونے لگی تھی۔ وہ ایک دیوانے کی طرح گھبرایا سا رہنے لگا۔ ابھی رات کا دھندلکا باقی ہی تھا کہ وہ ساجد کی قبر کے پاس گیا۔ شبنم سے بھیگی ہوئی قبر کو اس نے اپنے ہاتھ سے ایسے تھپتھپایا گویا کسی دروازے پر دستک دے رہا ہو ـــــ "ساجد!" اس نے فریاد بھری آواز سے پکارا ـــــ تم نے میرے خلوص کی قدر نہ کی ـ پہلی بار ملاپ کا ہاتھ تم ہی نے میری طرف بڑھایا تھا۔ اور اب ـ مرنے کے بعد میری روح میں تم نے یہ شعلے کیوں بھر دیئے ہیں؟ وہ قبر پر اوندھا پڑا روتا رہا "میں اپنی اس آخری خوشی کے بغیر تباہ ہو جاؤں گا ساجد ـــــ"

زاہدی سلگتے سلگتے اچانک بجھ کر رہ گیا ـ سنسر والوں نے خط کی امید پہلے ہی مٹا دی تھی ـــــ اب رہی سہی جو تھوڑی سی خوشیوں کی یادگار باقی رہ گئی تھی ـ وہ بھی ساجد کی قبر میں دفن ہوتی جارہی تھی ـ زاہدی کی نگاہوں میں ہسپتال کا خاموش کمرہ گھوم جاتا جہاں محبت کی ایک ننھی سی کونپل پھوٹی تھی۔ پھر اس میں کومل سے پتے نکلے تھے، اور تب کہیں جاکر کلیاں لگی تھیں، پھر کیا وہ عینی کی محبت کی معصوم اور مقدس کلیاں، ساجد کی تربت پر چڑھانے کے لیے ہی چٹکی تھیں؟ ـــــ اس کے دل میں ایک تلاطم برپا تھا۔ ایک ٹکراؤ تھا۔ وہ پیستا رہا ـ گھٹتا رہا۔ اور محاذ پر ہوتی ہوئی جنگوں سے کہیں زیادہ خطرناک جنگ اس کے دل اور ضمیر کے اندر ہوتی رہی ـ ساجد مر کے جی اٹھا تھا، شاید وہ اپنا عہد پورا کر رہا تھا۔ وہ زاہدی سے عینی کی ساری محبت

اور پیار چھین کر اضطراب اور بے چینی دے رہا تھا۔ اس جدوجہد اور طوفان میں اپنے کو بھول جانے کے لیے زاہدی نے پہلی بار شراب کو چکھا۔ اور سچ مچ میں تھوڑی دیر کے لیے وہ اپنا سارا غم بھول گیا ——— ؟

چند دنوں سے محاذ پر لڑتے لڑتے ایک تھکن سی آگئی تھی۔ خیموں کے اندر، پہاڑوں اور خندقوں میں چھپی ہوئی زندگی انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے لگی تھی۔

(۹)

زاہدی اپنے دل و دماغ پر غم کے بہت بڑے بوجھ کو محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر وہ اسی طرح سے گھٹتا چلا جائے گا تو پاگل ہو جائے گا۔ جنگ کے اس ہلکے سے ٹھہراؤ کو غنیمت سمجھتے ہوئے اس نے چند دنوں کی چھٹیاں لے لیں اور اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ قاہرہ چلا آیا۔ اس کی جلتی ہوئی روح کو تھوڑا سکون مل گیا تھا۔ وہ جنگ، موت، حیات اور محبت سب کچھ بھلا کر اپنے آپ کو کہیں ایسی جگہ کھو دینا چاہتا تھا، جہاں وہ اپنے دل کی آواز کو بھی پہچان نہ سکے۔ پھر وہ قاہرہ کی سجی سجائی رنگ و نکہت کی محفلوں میں جھوم جھوم اٹھا۔ رقص کی گردشوں میں اس کی حیات لہرانے لگی۔ گھنگھروؤں کے مدھر بول اور سنگت کی لے اس کے زخمی دل پر ٹھنڈے مرہم کا پھاہا لگانے لگے۔ جسموں کی لچک اور لپکار نیں اس کو اپنے دکھوں سے پناہ مل گئی۔ عینی کا تصور دھندلا پڑتا گیا اور وہ اپنے خوابوں میں گم ہوتا چلا گیا۔ ذہنی کشمکش اور ہیجان کے بعد اس کے اعصاب کو اک سکون مل گیا تھا۔ اب تک جو صرف ایک پھول کے لیے ترستا رہا تھا اس کے قدموں پر سارا چمن بکھرا پڑا تھا۔ وحشی ہرنیوں کی طرح بدکتی ہوئی صحرائی لڑکیوں کو دیکھ کر کبھی بار اس کو آمنہ یاد آگئی۔ اسپین کی دوشیزاؤں کے رقص میں ان کے ہر ہر عضو سے کیف و سرور کے چھلکتے ہوئے پیمانے نظر آتے تھے۔ مصر کی بے پردگی کو دیکھ کر سلمیٰ کا شباب اس کی آنکھوں میں گھومنے لگتا تھا۔ اچانک اتنی مدت کے بعد ساری بھولی بسری یادیں خود بخود اس کے حافظے میں ابھرتی چلی آ رہی تھیں۔ اور وہ قاہرہ کی قلوپطراؤں، بغداد کی حوروں اور مراکش کی حسیناؤں میں اپنے آپ کو بھولتا چلا گیا۔ وہ مسکراتا رہا۔ ہنستا رہا۔ اور شراب کے نشے میں جھومتا رہا۔ رقص کرتی ہوئی ایک خوب صورت لڑکی کی سیاہ آنکھوں کو دیکھ کر ایک دن وہ گھبرا کر ایک بیک چونک پڑا۔ نشے میں جھومتا ہوا وہ اس کے پاس آیا اور اس کی آنکھوں میں جھانک کر بڑے پیار سے بولا "سیاہ آنکھوں والی خوب صورت لڑکی ——— کیا ——— تم ہندوستان کی رہنے والی ہو ——— ؟ لڑکی شرمائی پھر مسکرا کر بولی ———

"نہیں کیپٹن۔ میں نے تو کبھی تمہارا ہندوستان دیکھا بھی نہیں ہے۔"

"پھر تمہاری آنکھوں میں پیاسی روح کو سیراب کرنے والی یہ خوب صورت جھیل کہاں سے آگئی ہے ؟ زاہدی کی نگاہوں میں اچانک عینی کی آنکھوں کا سارا حسن اور پیار جھلک آیا تھا۔ اس کے لب تھرتھرا اٹھے۔ اور بچھڑی ہوئی یادوں کی لہریں دل کے تاروں کو چھوتی ہوئی گزرتی چلی گئیں۔ وہ اس رات کو بہت دیر تک عینی کے لیے روتا رہا۔ اور اپنے آپ کو کوستا رہا تھا۔ اور سندر وادیوں کے سیاہ دھبوں کے نیچے سے عینی کے محبت بھرے خط کو پڑھنے کے لیے اچانک اس کا دل بے قرار ہوا اٹھا تھا۔ اس نے بے چینی سے کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچا "عینی اسی کی تھی۔ صرف اسی کی تھی۔ ساجد کو موت کی لوری نے سلا دیا تھا اور اس

کی شربتی آنکھوں میں عینی کے خواب اور تصور بھی مٹ چکے تھے۔ زاہدی تڑپ اٹھا۔ اس نے رات کی خاموشیوں میں بیتابانہ طور پر پکارنا چاہا۔ "عینی ——— میری عینی!" مگر اس کے منہ سے کوئی آواز نکل نہ سکی۔ عینی اس سے ہزاروں میل دور تھی۔ اور موت کی وادی سے دم بھر کے لیے بھاگ کر وہ قاہرہ کی سجی ہوئی محفلوں، اور چہکتے رباب کے نغموں میں عینی کو ڈھونڈنا چاہ رہا تھا۔ وہ سسکتے ستار کی تاروں اور شراب کے پیمانوں سے اپنے دل میں لگی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتا رہا ——— اور پھر وہ نشے میں مدہوش ہو کر عینی کو بھول گیا ———

دوسرے دن زاہدی پھر اسی لڑکی کے قریب آیا اور اس کے ناچتے اور تھرکتے ہوئے جسم کی لوچ میں گم ہو گیا۔ کل کی ساری باتیں اس کے ذہن سے نکل چکی تھیں۔ مگر اس کے دل میں رہ رہ کر ایک خلش سی ہو رہی تھی کہ آج وہ پھر اسی جگہ کیوں آ گیا تھا؟ ناچتی ہوئی لڑکی کے پیر جب تھم گئے تب زاہدی نے لڑکی کی سیاہ آنکھوں کو دیکھا، اور پھر اس کو سب کچھ یاد آ گیا۔ وہ بڑے پیار سے اس کی سیاہ آنکھوں کو تکتا رہا۔ اور اس کی گہرائیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کے تھکے ہوئے چہرے کو اور قریب سے دیکھنے لگا تو اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑے۔ وہ بڑے پیار سے اس کی پیشانی پر جھکا اور اس کو چوم لیا۔ پھر اس نے اپنی جیب سے قلم نکالا اور لڑکی کے دائیں گال پر لبوں سے ذرا قریب ایک ننھا سا سیاہ تل بنا دیا ——— پھر وہ اس بنے ہوئے تل کو بڑے پیار سے دیکھتا رہا۔ شاید وہ ایک سیاہ نقطے میں جادو بھری ایک دنیا کو ابھرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ ایک ٹک لگائے وہ بڑی حسرت کی نگاہوں سے دیکھے چلا جا رہا تھا۔ اور جب وہ اس سیاہ تل کو بیتابی سے چومنے کو جھکا تو جھجک کر یکدم سے پیچھے ہٹ گیا ——— اپنے ناپاک لبوں سے محبت کے اس سنگِ اسود کو چومنے کی اس میں ہمت نہ ہوئی۔ لڑکی حیران کھڑی تھی اور ——— زاہدی ایک کھوئے ہوئے بچے کی طرح سسک سسک کر نشے میں رو رہا تھا ——— زاہدی کی چھٹیاں ختم ہو گئیں اور پھر وہ انہی تپتے ہوئے صحراؤں میں واپس آ گیا ———!

(۱۰)

اتحادی فوجوں کو دم بھر کے لیے سُلا کر جرمن فوج نے اچانک بڑا سخت حملہ کر دیا تھا۔ مقابلہ ہوتا رہا۔ فوج کبھی آگے بڑھتی اور کبھی پیچھے ہٹتی رہی، مگر پھر یکدم سے اتحادیوں کے پاؤں اکھڑ گئے، سارے مورچوں پر بددلی سی چھا کر رہ گئی۔ جرمن فوج گھیرا باندھے آگے کھڑی تھی اور پیچھے ہٹنے کا راستہ بھی صاف نہ تھا ——— فیلڈ مارشل نے جنگی نقشہ سنبھالنے کی کوئی اور صورت نکالنی چاہی مگر ——— جرمن فوج محاصرہ کرتی ہوئی آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی ——— محصور فوج نے اپنے ذخیروں میں آگ لگا دی۔ میگزینوں کو تباہ کر دیا۔ اور فوجی گاڑیاں قطار در قطار ——— چھپ چھپ کر بھاگنے لگیں، اور بھاگتے بھاگتے پلوں کو اڑاتی چلی گئیں۔ جہاں راستوں پر سے وہ ابھی ابھی فتح کے ترانے گاتے اور اپنا جھنڈا لہراتے ہوئے گزرے تھے ——— انہی راستوں پر بھاگتے ہوئے ان کی گاڑیاں رک گئیں۔ جرمن فوج محاصرہ کرتی ہوئی پہنچ گئی تھی۔ زاہدی کا ایمبولینس ڈرائیور اپنی گاڑی کو اسی طرف سے موڑ کر ریڈ کراس کے نشان کو دکھانے کے لیے آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ ایک گولی اس کے سر میں آ کر لگی اور وہ آہستہ سے اپنی سیٹ پر سے نیچے لڑھک گیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونج رہی تھی۔ اگلی گاڑیاں رکی کھڑی تھیں اور چلتے ہوئے انجنوں کا

شور اور گھبراہٹ پیدا کر رہا تھا۔ زاہدی کی گاڑی کا انجن بھی اسٹارٹ تھا۔ زاہدی نے مُردہ ڈرائیور کا کپڑا پکڑ کر اسے پرے دھکیلا اور جلدی سے اسٹیئرنگ تھام لی۔ ابھی وہ ایک فرلانگ بھی آگے نہ جا سکا تھا کہ ایک سنسناتی ہوئی گولی اس کی پیشانی کے بائیں طرف آکر چپکتی ہوئی لگی اور وہ بڑی آہستگی سے مُردہ ڈرائیور کے اوپر گر پڑا ——— ہوش آنے پر زاہدی نے اپنے آپ کو ایک ہسپتال میں لیٹا ہوا محسوس کیا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اپنی پیشانی چھوئی۔ اس پر ایک پٹی کس کر باندھی ہوئی تھی۔ تو گویا ——— وہ ابھی تک زندہ تھا ——— گولی لگنے کے بعد بھی وہ زندہ رہ گیا تھا ——— اس کے سر کے اندر اور سارے جسم میں ایک تڑتڑاہٹ ہو رہی تھی۔ تکلیف کے مارے آنکھیں نکل چلی جاتی تھیں ——— کاش وہ مر جاتا ——— اچانک اس کو چوہے دان میں پھنسے ہوئے ان چوہوں کی یاد آگئی جنکو سیخ سے گھونپ گھونپ کر ستا ستا کے مارا جاتا تھا ——— ہسپتال کے اندر سواستیکا کے امتیازی نشان کو دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا تھا۔ اس نے بڑے صبر سے اپنے کو حالات پر چھوڑ دیا ———

کچھ دنوں کے بعد سارے قیدیوں کے ساتھ اس کو بھی جرمن فوج کے جنرل رومیل کے سامنے لایا گیا ——— وہ سب کے سب سر جھکائے ایک قطار میں مجرم کی طرح کھڑے تھے۔ ایسی حالت کو دیکھتے ہوئے زاہدی کو ساجد کی فاتح موت پر رشک آنے لگا۔ مرنے کے بعد بھی وہ زاہدی سے بہت بلند تھا۔ تلاشیاں پہلے بھی لی جا چکی تھیں ——— ایک بار جنرل رومیل کے سامنے بھی لی جانے لگیں۔ جرمن آفیسر کے مغرور لال لال چہروں کے درمیان جنرل رومیل کا مسکراتا ہوا چہرہ استعماری بدنصیب تبدیلیوں کو کاٹنے میں گلاب کی طرح کھلا ہوا نظر آ رہا ——— تلاشی میں کسی کی جیب سے سگریٹوں کے ٹکڑے نکلے کسی کے پاس سے سفید پڑا ہوا ذاتی سائز کا پرانا خط ملا۔ کچھ سپاہیوں کے بازو اور گلے سے کپڑوں میں سلے تعویذیں بھی نکلی تھیں جن کو جرمن آفیسر بڑے غور و فکر سے دیکھ رہے تھے۔ وہ تعویذوں کا اشارہ ان کو جب سمجھ نہ سکے تو ان کے چہروں پر غصے کی سرخی آگئی۔ یہ کیا چیز تھی؟ ——— یہ کس طرح کا نقشہ تھا؟ ہندوستانی افسروں سے ان کو ہندوستانی روایت سمجھائی گئی۔ اور ماں کی محبت اور باپ کی تسکین کی اس صورت کو دیکھ کر جنرل رومیل ہنس پڑا ——— اور اس نے تعویذ باندھنے والے ایک سپاہی کے کندھے کو بڑے پیار سے تھپکتے ہوئے کہا "خدا نے تمہاری حفاظت ہی کی ہے جو تم جنگ سے بچ کر یہاں آگئے ہو۔"

زاہدی کی تلاشی لی جانے لگی تو اس کا کمزور چہرہ گھبراہٹ اور غم سے اور بھی گہرا پیلا ہو گیا۔ گھڑی اس کی کلائی پر بندھی رہی۔ قلم جیب میں اسی طرح سے اٹکا رہا۔ صرف اس کی قمیص کے جیب سے کئی کاغذوں میں لپٹا ہوا ایک لفافہ بڑے اہتمام سے جنرل کے سامنے لایا گیا ——— افسر اس لفافے پر جھک پڑے۔ زاہدی کی نگاہیں گھبرا کر شرم سے جھک گئیں۔ کاغذ کی تہوں کو ہٹا کر جنرل رومیل یکایک مسکرا پڑا۔ وہ بڑی گہری نظر سے اس کو دیکھتا ہوا زاہدی کے پاس آگیا۔ اور بڑے پیار بھرے خلوص سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر انگریزی میں بولا ——— "ہندوستانی رومیو میں تمہیں مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ اتنی بڑی جنگ میں بھی تم نے اپنی جولیٹ کی حفاظت کی ہے۔ میں ہندوستان کی اس جولیٹ کا احترام کرتا ہوں۔ محبت دنیا کی اک عظیم طاقت ہے۔"

زاہدی جب اپنی جگہ پر واپس آیا تو اس کے سینے پر غم کا ایک پہاڑ تھا۔ ایک بار پہلے بھی یہ تصویر ساجد کی جیب سے اس وقت نکلی جب وہ مر چکا تھا۔ اور اب پھر وہی تصویر اس وقت زاہدی کی جیب سے نکال لی گئی تھی جب

وہ زندہ درگور پڑا تھا ۔۔۔ ابھرے مجمعے میں اپنی محبت کی اس عریانی کا اس کو بے حد غم ہوا تھا۔

اتحادی فوج کے قیدی جنرل رومیل کی قید میں بڑے خوش اور عزت سے تھے، اتنے بلند کیریکٹر کا انسان ان کی نگاہوں سے اب تک نہ گزرا تھا۔ وہ قیدیوں کے کیمپ میں آ آ کر چھوٹی سی چھوٹی ضرورت پر خود سے نظر رکھتا تھا ۔۔۔ اتنی بھیانک جنگ میں بھی ۔۔۔ جنرل رومیل کی اخلاقی بلندی اس بات کو یاد دلاتی رہتی تھی کہ انسانی عظمت اتنا خون بہا کر بھی ابھی مٹی نہیں تھی ۔۔۔ قیدیوں کے لیے ایک دن کیمپ میں پانی کی کمی ہو گئی۔ جنرل رومیل اچانک پچھلے دروازے سے ہنستا ہوا آیا، سب کی خیر و عافیت پوچھتا ہوا وہ پانی کی خالی ٹنکیوں کو دیکھ کر چونک پڑا۔ ایک بہادر جنرل نے اپنے قیدیوں سے معافی مانگی اور کیمپ انچارج پر ناراض ہوتا ایک گھنٹے میں فوجی ٹرکوں پر بڑے بڑے ٹبوں میں پانی بھروا کر خود اپنے ساتھ لے کر آ گیا ایک ایک جرمن سپاہی اپنے جنرل پر جان چھڑکتا تھا، بہادر جنرل کے محبت بھرے دل نے اپنی فوج کو بھی بلند اخلاق بنا دیا تھا ۔۔۔ قیدیوں نے سنا تھا کہ جنرل رومیل ایک لڑکی سے ٹوٹ کر محبت کر رہا ہے۔ اور جنگی محاذوں پر کبھی وہ کسی درخت کی آڑ یا مورچوں کے پیچھے چھپ کر اس کو روزانہ خط لکھا کرتا ہے۔ زاہدی مسکرا پڑا "سچ ہے محبت کتنی عظیم طاقت تھی!"

جس دن اتحادی فوجیوں کو اٹلی کی فوج کے حوالے کر کے نیپلز بھیجا جا رہا تھا، قیدیوں کے دل رو رہے تھے، جن اطالوی فوجوں پر وہ فاتح رہ چکے تھے اب ان کی قید میں جاتے ہوئے سپاہیوں کی آنکھیں غم بھرے آنسوؤں سے بھیگی جا رہی تھیں۔ اب تک وہ ایک فاتح اور بہادر قوم کی قید میں رہتے تھے۔ جنرل رومیل نے بڑی محبت بھری مسکراہٹ کے ساتھ قیدیوں کا رخصتی سلام قبول کیا اور پھر ان کو آخری سلام کے لیے اپنا ہاتھ آگے پھیلا دیا ۔۔۔ جب وہ الوداعی تقریر کر رہا تھا تو اس کی آواز رقت سے بھر گئی تھی۔

نیپلز کا منظر جتنا زیادہ خوبصورت تھا وہاں کے لوگ اتنی ہی بری فطرت کے سیاہ کار اور لٹیرے تھے، وہ قیدیوں کو دیکھتے ہی بھوکے کنگالوں کی طرح ان پر ٹوٹ پڑے۔ جو بھی جس کے ہاتھ آیا لے کر چلتا بنا گھڑی، قلم، جوتے اور موزے تک انھوں نے اتار لیے تھے۔ ایسا کرتے ہوئے بڑی بے شرمی سے وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ اور ان کے منہ سے کچے پیاز کی بدبو پھیلتی رہتی تھی اطالویوں کو پیاز اتنے پسند تھے کہ ہر گھڑی اپنے منہ میں کچے پیاز کی پوٹیں لیے وہ چباتے رہتے تھے۔ اور بڑے وحشیانہ طور پر ان پیازوں کو چبا چبا کر قیدیوں کو گھورتے اور ستاتے رہتے تھے۔ قیدیوں کے لیے روز نت نئی سزائیں سوچی جاتی تھیں۔ ذہنی اذیتیں بھی اور جسمانی تکلیفیں بھی ۔۔۔ سامان کے بغیر کنواں کھدوائے جاتے نظر کے سامنے کھانے کے غلوں میں ریت اور کنکروں کی ٹوکریاں انڈیلی جاتی تھیں۔ قیدیوں کے سروں کے بال مونڈ دیئے گئے تھے اور بلا قصور کئے ہنٹر کی سزائیں ملتی رہتی تھیں۔ بڑی خوشی کے ساتھ قیدیوں کو یہ خبر سنائی جاتی کہ آج ان کی ڈاک ملنے کا دن ہے۔ سب کو بلا کر اکٹھا کر لیا جاتا۔ تھیلوں سے خطوں کے ڈھیر نکالے جاتے اور پھر اس ڈھیر میں آگ لگا دی جاتی تھی اور برسوں سے بچھڑے ہوئے قیدی اپنے گھروں سے آئے ہوئے خطوں کو سامنے جلتے ہوئے دیکھ کر تڑپ تڑپ اٹھتے تھے اطالوی سپاہی زاہدی سے طبی مشورے لینے کو آتے تھے۔ اطالوی سپاہیوں کی اکثریت کو جنسی گندی بیماریاں

میں مبتلا دیکھ کر اس کو بڑا تعجب ہوا - اتنے خوب صورت شہر میں اتنے سیاہ کار بستے تھے - ؟

نیپلز کی اس گندی اور زہریلی فضا میں کئی سال قیدیوں نے سسک سسک کر گزارے ، بس انہیں اتنی سی اجازت مل گئی تھی کہ ایک تھیٹر نے سے پھیپھے ہوئے کاغذ پر گنتی کے دو چار حرف لکھ کر اپنے گھروں کو بھیجیں۔ سال میں بس دو چار ہی خط لکھنے کا حکم تھا۔ پھر بھی زاہدی کو بڑی خوشی ہوئی، سب سے پہلا خط اس نے عینی کو لکھا تھا۔ مہینوں کے بعد جس دن عینی کا لفافہ اس کو ملا ، زاہدی خوشی سے اچھل پڑا ۔ برسوں کے بعد اس کی عید ہوگئی تھی ——— عینی کے خط میں بڑی لطیف محبت چھپی ہوئی تھی ، ایسا لگتا تھا کہ اب وہ پہلے سے ذرا سنجیدہ ہوگئی تھی ، اور زاہدی کی اتنی لمبی جدائی نے اس کو گمبھیر اور بڑا صابر بنادیا تھا ——— " زاہدی جنگ کی اس طویل مدت ، اور غم نے مجھے بہت تبدیل کردیا ہے مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ اب تم کیسے ہوگئے ہوگے ؛ تمہارے چہرے پر جو ایک بہار سی چھائی رہتی تھی ، کیا جنگ کی اتنی لمبی مصیبتوں میں وہ روشنی ابھی تک باقی رہ گئی ہوگی ؟ اکثر یہ سوچتی ہوں کہ اگر میں کبھی اچانک تمہارے پاس آجاؤں گی تو تم مجھے پہچان سکوگے ؟ اور اتنے زمانے کے بعد مجھ کو دیکھ کر خوشی سے میرا سواگت کر سکوگے ؟ - خدا کرے ، زاہدی تم جلد سے جلد اب واپس آجاؤ - میں تمہارے گھر آکر خوشیوں کے چراغ جلانے کو سچ مچ بڑی بیقرار سی ہورہی ہوں " زاہدی ہنس پڑا عینی ابھی تک ذرا نہ بدلی تھی - وہ چراغ جلائے گی ——— ؟ پگلی ——— " میں خود اس کے آنے کی خوشی میں چراغاں کروں گا " عینی کے اس خط نے زاہدی کو جگا دیا تھا ، وہ دوبارہ جی اٹھا ——— اور اسی لیے وہ سارا دن عینی کو یاد کرکرکے روتا رہا تھا ——— اور نیپلز کے قید خانے میں عینی کی محبت ، اور اس کی پاکیزگی کے سہارے کئی دنوں تک اپنے گھر کا نقشہ بناتا رہا اور اس کو اپنے خیالوں میں سجاتا رہا تھا ——— اس کو اپنے آپ سے پھر پہلے جیسی شرم آنے لگی تھی - اس نے عینی کے خط کا کوئی جواب نہ دیا وہ اس غم میں جلنے لگا تھا کہ عینی کی بلند نظری کی انتہا تک پہنچتے پہنچتے بھی وہ خود کتنی پستی میں گر گیا تھا -

(۱۱)

اچانک اتحادی فوجوں کی فتح کی خبر سن کر نیپلز کے قیدیوں میں نئی جان پڑ گئی تھی - وہ ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر مبارک باد دے رہے تھے - خوشی کے مارے ان کی آنکھوں سے آنسو نکلے پڑتے تھے - وہ جیت گئے تھے ، وہ فاتح بن گئے تھے - جو اتنی ذلتوں سے نیپلز کے قیدی کیمپوں میں سؤروں اور کتوں کی طرح سمجھے جاتے رہے تھے ——— اتحادی قیدی فاتح ہو چکے تھے ، ان کا جھکا ہوا سر فخر سے تن گیا تھا - ان کے بھائیوں نے اپنی جانوں کی بازی لگا کر قیدیوں کے ماتھے پر سے کلنک کے داغ کو دھو دیا تھا ——— ! زاہدی کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آرہا تھا - بے اختیار اسے اپنا ایک ساتھی یاد آگیا جو کہا کرتا تھا کہ جنگ سے ذلیل چیز دنیا میں کوئی نہیں ——— اگر وہ زندہ رہتا تو فتح کی اس خوشی میں وہ اپنے سارے دکھ بھول جاتا ——— پھر اس کو ساجد کی یاد آئی - جس کی جیب میں اس کی ہونے والی بیوی کی تصویر تھی ، ساجد کو جنگ جیت لینے کا انتظار رہتا تھا ، مگر لیبیا کی ایک پہاڑی سائے میں جنگ نے اس کو موت کی گہری نیند سلا دیا تھا - اس کے سرہانے کی چٹان پر سفید چاک سے لکھے ہوئے الفاظ شاید اب تک مٹ چکے ہوں گے " زاہدی نے ایسی خوشی کے وقت میں سچے دل سے ساجد

کو یاد کیا تھا۔ اس نے سوچا کہ ساجد کو اب فتح کی مسرت بھری جھنکار بھی کبھی نہ جگا سکے گی۔ مگر وہ خود فتح کی اس خوشی کو لے کر کہاں جائے گا۔ ملی اس کی اتنی لمبی جدائی کو سہہ نہ سکی تھی ——— چھوٹے بھائی بہن اب تک اس کو بھول چکے ہوں گے۔ ان کی تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے جنگ پر آتے ہوئے اس نے ایک معقول انتظام کر دیا تھا۔ جس فتح کو پانے کے لیے وہ جہنم زاروں سے ہو کر گزرتا رہا تھا اس کی خوشی کو لے کر اب وہ کہاں جائے ——— ؟ جنگ کے شعلوں نے اس کی روح اس کا ضمیر اس کی حاصل کی ہوئی پاکیزگی اور اس کی محبت سب کچھ جلا کر خاکستر بنا دیا تھا۔ پھر وہ یہاں سے کیا لے کر جائے گا؟ ——— سارا دن وہ سب لوگوں کے ساتھ زبردستی کی ہنسی ہنستا رہا۔ مگر اس کا دل رو رہا تھا اور اس کی روح سسک رہی تھی۔ اس کو اپنی پستی کا خیال کم ہمت بنا رہا تھا۔ اور وہ بھی انہی کیچڑوں میں ایک گندے کیڑے کی طرح اب تک رینگتا رہا تھا ——— جن میں ایک کمزور کیرکٹر کا فوجی دم بھر کے لیے بھاگ کر پناہ لیتا ہے۔ وہ ستاروں کی معصومیت تک پرواز کرتے کرتے اچانک منہ کے بل گر پڑا تھا۔ ساجد کی موت نے زاہدی کی زندہ روح کو گھونٹ کر مار دیا تھا ——— اور جس بلند کیرکٹر والے زاہدی کا عینی کو انتظار تھا کہ وہ ساجد کی موت کے بعد لیبیا کے صحراؤں میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکا تھا۔ اس کو ایک ہی بار موت نہیں آئی ——— بلکہ وہ سسک سسک کر بار بار مرتا رہا۔ شرابوں کے نشوں میں اور فاحشہ عورتوں کی آغوش میں کئی بار اس کا دم نکلتا رہا تھا۔ مگر اس کا جنازہ کہیں نہ اٹھا۔ اس کا مزار کہیں نہ بنا اور جب کتوں اور گیدڑوں نے بھی اس کی لاش کو نہ پوچھا تو پھر وہ اپنے ہی دانتوں سے اپنی لاش کو نوچنے لگا تھا ——— اس کے دانتوں کی وہ سفیدی اور چمک اب مٹ چلی تھی، جو کبھی عینی کو عزیز تھی ——— اور جب فتح کی خوشیوں میں زاہدی جی بھر کے رو چکا تو اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ ہندوستان واپس نہ جائے گا ——— عینی کی محبت بھری نگاہوں کو دیکھنے کی اس میں تاب نہ تھی ——— وہ بزدل اور خود غرض بنا اپنے فیصلے پر قائم رہا۔ ہندوستانی قیدی جب اپنے وطن جانے کی خوشی میں مست ہو کر جھومتے ہوئے جہاز پر سوار ہو رہے تھے۔ تو زاہدی ان کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔ اپنے کانپتے ہوئے لبوں سے اس نے اپنے ساتھیوں کو الوداع کہا اور اپنے مقدس وطن کو پیار بھرا سلام بھیجا تھا۔ اس کے اس سلام میں بڑی شکستگی تھی، غموں اور دکھوں کی پکار تھی اور اپنے بہت سے بلند ارادوں کی ہار چھپی ہوئی تھی ——— مگر اس ہار کو کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ زاہدی نے اپنی پوسٹنگ مصر میں کرائی۔ جہاں فتح کے بعد اتحادیوں کے بہت سے کام کرنے کو باقی رہ گئے تھے۔ وہ کئی سالوں تک مشرق اور مغرب کی طرف گھومتا رہا تھا ——— اس کا دل مر چکا تھا۔ اس کے جذبات سو گئے تھے۔ اور اس کی نگاہوں میں عینی کی تصویر دھندلی پڑ گئی تھی ——— وہ صرف ایک اکھڑ سپاٹ سا فوجی بن کر رہ گیا تھا ——— جو کثرت سے شراب پیتا اور خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ ناچ کر خوشی منایا کرتا تھا۔

ماضی کے دھندلکے میں کبھی کبھی عینی کی یاد اس کے دل میں ایک خلش سی بن کر آتی۔ بچھڑی ہوئی ان یادوں سے بچنے کے لیے وہ شراب کے پیمانوں کا سہارا لیتا ——— ملٹری کلب میں نازک لڑکیوں کو شراب کے پیالوں کے پیچھے سے دیکھنے میں اس کو بڑا مزہ آتا تھا۔ وہ خوب صورت آنکھوں کو دیکھ کر کبھی کبھی گھبرا جاتا تھا۔ بہت دور سے اس کے تخیل میں عینی کی آنکھیں جھلک سی پڑتی تھیں ——— اور ایک چھوٹا سا سیاہ تل اس کے حافظے میں ابھر آتا تھا ——— اس کی روح پر ایک تشنگی سی چھا جاتی ——— جب بھی وہ سیاہ تل اس کو یاد آتا تو وہ اس کو چومنے کے لیے بے قرار ہو جاتا تھا ——— ان ساری بے قراریوں کے باوجود اس کی

دنیا بدلتی چلی گئی۔ کبھی بھولے سے بھی کسی کی کاجل لگی آنکھیں اس کو یاد نہ آتیں، وہ اپنے گھر تک سے بیگانہ بنتا چلا گیا تھا۔

اتنے لمبے عرصے میں اس کے ہندوستان پر کیا کچھ نہ بیت گئی تھی۔ جنگی محاذ پر سے بھی کہیں زیادہ بے دردیوں سے انسانوں نے ہنستے انسان کے خون سے ہولیاں کھیلیں آگ اور لہو کے دریا بہہ گئے۔ نفرت اور دشمنی کی دیوار بھائی، بھائی کے بیچ میں حائل ہو گئی تھی۔ ہندوستان اور پاکستان کو آزادی کیا ملی تھی کہ انسانوں نے ایک دوسرے کو کتوں کی موت مارنا شروع کر دیا تھا۔ ان ساری باتوں کو سن سن کر اس کا دل تڑپ تڑپ اٹھتا۔ جب مادرِ وطن کی مقدس پیشانی پر آزادی کا ستارہ چمکنے والا تھا۔ اور جنگوں میں شہید ہونے والے سپوت بیٹوں کی روح کو شانتی ملنے والی تھی۔ بلیدان چڑھا ہوا پوتر خون جب ماتھے پر عزت کا تلک بننے والا تھا۔ تو بھائی نے بھائی کے گلے پر چھری چلا دی تھی۔ زاہدی کا سر جھک گیا وہ غیروں کے سامنے شرم سے اپنی آنکھیں ملانے سے کتراتا رہا تھا۔ ہندوستان جانے کی اس میں اب ہمت نہیں تھی۔ وہ چپکے سے پاکستان ملٹری میں چلا آیا تھا۔ اس کے باپ اور بھائی بہن پاکستان آکر اس سے مل چکے تھے۔ پھر لمبے اور خاموش دن گزرتے چلے گئے۔ اب اس کو تھکن سی محسوس ہونے لگی تھی، اس کی آنکھیں نیند کی غنودگی سے بھرنے لگی تھیں۔ اس کے چہرے پر پہلی سی شگفتگی کی بس ایک ہلکی سی جھلک باقی رہ گئی تھی۔ اب اس کو یاد بھی نہ رہا تھا کہ اس کی مسکراہٹ اس کے داہنے ہونٹوں کے کونے میں چپکے سے سمٹ کر کبھی ڈوب جایا کرتی تھی۔

ایک دن اس کو اچانک عینی کی خبر ملی۔ اس نے ایک بیگانے کی طرح اس جانے پہچانے ہوئے نام کو سنا اور تڑپ اٹھا۔ عینی اس کی اپنی عینی ـــــ جس کے نرم روئی کے گالے جیسے ہاتھ کو اس نے آخری بار اسٹیشن پر چھوا تھا ـــــ وہ اب تک اسی خلوص اور پیار سے اس کا انتظار کر رہی تھی ـــــ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ اور لڑکیوں کے کالج میں پروفیسر ہو گئی تھی ـــــ اپنی اجاڑ دنیا میں اس کو صرف زاہدی کا انتظار تھا۔ جو شراب کے پیالوں اور جوان لڑکیوں کے رقص میں ایک زمانے سے اس کو بھول چکا تھا ـــــ زاہدی عینی سے ملنے کو تڑپ اٹھا لیکن ملٹری آفیسر کے لیے ہندوستان جانا مشکل تھا، اس نے خط لکھ کر اپنے پاس بلانا چاہا تھا ـــــ مگر کئی خط لکھ لکھ کر وہ پھاڑتا رہا تھا ـــــ کسی خط کو پوسٹ کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ وہ اپنے ماضی سے ہمیشہ اپنی آنکھیں چراتا آیا تھا۔ وہ اپنے آپ سے اپنے دیکھے ہوئے سپنوں سے اور اپنی کی ہوئی تمناؤں سے گریز کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ پھر کچھ عرصے کے بعد ہمیشہ کی طرح وہ عینی اور عینی کی ساری باتوں کو بھول گیا ـــــ اب وہ فوج کا ایک، باوقار جنرل بن چکا تھا۔ اور بہت سی پرانی باتیں اس کے حافظے سے اترتی چلی جا رہی تھیں"۔

زاہدی نے میز پر رکھے ہوئے ہاتھوں پر سے اپنا سر اٹھایا آنسوؤں سے اس کی آستین بھیگ چلی تھی۔ احاطے میں رات کا اندھیرا چھاتا جا رہا تھا اور زاہدی کے بیڈ روم میں عینی کی لاش کے سرہانے موم بتیاں بھی جلتے جلتے بجھ چکی تھیں ـــــ!

اس کی بیوی اُس کا خاوند

اعجاز حسین بٹالوی

بلقیس اور شاکرہ کو کمرے میں چھوڑ کر وہ باہر نکل آیا۔ وارڈ کے لمبے برآمدے میں سکون تھا یوں بھی ہسپتال میں شور کم ہوتا ہے مگر اس وقت تو ہر طرف عجیب سی خاموشی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا وارڈ کے آخر میں محراب دار کھڑکی کے سامنے پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔ شام کا جھٹپٹا گہرا ہو چکا تھا۔ ہسپتال کے وسیع لان میں کہیں کہیں بجلی کے مدھم سے قمقمے روشن تھے۔ بڑے بوڑھے پیپل تلے گھپ اندھیرا تھا۔ کھڑکی کے پاس بجلی کا ایک بلب جل رہا تھا جس پہ ایک بڑا سا کالے رنگ کا پتنگا والہانہ سر پٹک رہا تھا۔

اُس نے سگریٹ کا آخری کش لے کر اسے دیوار سے مسلا اور باہر پھینک دیا۔ بلقیس اور شاکرہ اس وقت کیا باتیں کر رہی ہوں گی؟

میں نے اچھا ہی کیا جو باہر چلا آیا۔

کیا میرے چہرے کے بدلے ہوئے رنگ دیکھ کر بلقیس بھانپ گئی ہو گی کہ میں شاکرہ کی آمد پر کیسی اذیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔

ہاں تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد باہر چلے آنا ہی مناسب تھا۔

شاکرہ نے بھی کیسی ہمت کی کہ میری بیمار بیوی کو دیکھنے ہسپتال چلی آئی۔

لیکن اس میں ہمت کی کیا بات ہے۔ آخر بلقیس شاکرہ کی ماموں زاد بہن ہے۔ کیسے اس بیماری میں اُسے ملنے نہ آتی۔

اور شاکرہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی بلقیس کی پیشانی کو اس طرح چوما تھا جیسے محبت کا سیلاب امڈا آرہا ہو اور پھر جب یہ دیکھا کہ کمرے میں ایک طرف وہ بھی کھڑا ہے تو اس کا رنگ سرخ ہو گیا اور رسمی سی گفتگو ہونے لگی۔ شاکرہ بلقیس کے سرہانے پڑی ہوئی دواؤں کے لیبل پڑھ رہی تھی تو اُس نے غور سے شاکرہ کی طرف دیکھا۔ اُس نے شاکرہ کے شوہر کی موت کے بعد پہلی دفعہ اس کو دیکھا تھا۔ وہ اب بھی خوبصورت تھی مگر جیسے گلاب کا پودا مئی جون کی دھوپ میں کمہلا جاتا ہے اور جھلستی شاخوں اور نازک پتیوں پر دھول پڑ جاتی ہے۔ وہ بلقیس سے اس کی بیماری کا حال پوچھنے لگی۔

"خیر بلقیس میں کہتی ہوں خدا کا شکر ہے دل کا عارضہ تو نہیں نکلا ورنہ کراچی میں تو میں نے تمہارے متعلق یہی سنا تھا۔"

"نہیں شاکرہ اب تو ڈاکٹروں کو یقین ہو گیا ہے کہ دل کا عارضہ نہیں لیکن اس کے باوجود بیٹھے بیٹھے طبیعت گھٹنے لگتی ہے ہاتھ پاؤں سرد پڑ جاتے ہیں اور غشی سی طاری ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے شک ہوتا ہے کہیں ہسٹیریا نہ ہو۔" یہ کہہ کر بلقیس خود ہی ہنسنے لگی اور شاکرہ نے ہنس کر کہا۔

"میرا خیال ہے ہسٹیریا کے لئے میری اور تمھاری عمر اب کچھ زیادہ نہیں ہو گئی ہو گی۔"

اسے کمرے کے ایک طرف کھڑے کھڑے یوں محسوس ہونے لگا جیسے دونوں عورتوں نے کسی باہمی سازش کے ماتحت اس کے وجود کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ اُس نے گھبرا کر شاکرہ سے پوچھا "تم کراچی سے کب آئیں شاکرہ؟"

"پرسوں شام پہنچی تھی۔ کل دن بھر فرصت نہ مل سکی۔"

اور اُس نے دیکھا شاکرہ کے بھینچے ہوئے ہونٹوں کے گوشے اب بھی وہی نرمی ہے، وہی شبنم کی سی ٹھنڈک ہے۔ اس کے نچلے ہونٹ کے قریب وہ چھوٹا سا تل اب بھی ایک بے پناہ کشش رکھتا ہے جیسے اسی کی موجودگی سے سارا چہرہ پُر رونق ہو گیا ہو اور بالوں کی ایک لٹ اب بھی اس کے بائیں کان کے قریب لام کی شکل بنا رہی تھی جیسے دل میں بیٹھے ہوئے کسی نے اسے لعنت ملامت کی اور وہ اپنی بیوی کی طرف دیکھنے لگا۔ بلقیس کا رنگ بیماری کے باعث زرد ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں کے گرد حلقے سے پڑ گئے تھے۔ شاکرہ نے سفید ساڑھی پہن رکھی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی خوبصورت عورت کو کفن پہنا دیا گیا ہو کیونکہ اس کے ذہن میں تو دنیا بھر کے شوخ اور چمکیلے رنگ شاکرہ ہی سے وابستہ تھے۔ یوں تو شاید اسے چار برس گزر چکے تھے مگر کل کا واقعہ معلوم ہوتا تھا کہ شاکرہ نے اس کا بھرا ہوا گلاس جس میں ہلکے گلابی رنگ کی وسکی اور سوڈے کے لاکھوں ننھے ننھے بلبلے تھے سبزگھاس پر لنڈھا دیا تھا اور پھر یوں مسکرائی تھی جیسے شب برات کو نیلے آسمان پر پھلجھڑی چھوٹتی ہے۔ اس نے سرخ رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی اور دو رقصاں جوڑوں کے ہجوم میں اس کے ساتھ ڈانس کرتے ہوئے اس نے کہا تھا "میں تمھیں اطلاع دینا چاہتی ہوں کہ تم آج شام اپنی آخری ڈرنک پی چکے ہو۔ اب اگر تم نے کچھ اور پیا تو میں گھر چلی جاؤں گی۔ میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں تمھیں ڈرنک نہیں دیکھنا چاہتی۔ تمھیں وسکی اور میرے درمیان ایک چیز کو انتخاب کرنا پڑے گا۔" موسیقی ختم ہوئی تو وہ واپس اپنے میز پر آ گئے۔ آسمان تلے کلب کے کھلے صحن میں موسم گرما کا آخری ڈانس تھا۔ نصف شب گزر چکی تھی۔ آرکسٹرا والے کوئی نرم سی دھن بجا رہے تھے اور سبز پودوں میں چھپے ہوئے قمقموں کی روشنی اور بھی مدھم ہو گئی تھی۔ اُس نے اپنی ڈرنک کا گلاس اُٹھا کر ایک گھونٹ بھرا اور پھر میز پر رکھ دیا۔ شاکرہ نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بولی "میں تمھاری طرف سے انتخاب کئے دیتی ہوں" پھر اُس نے گلاس اُٹھایا اور آہستہ سے یوں انڈیل دیا کہ وسکی سبزے سے ہوتے ہوئے قریب ہی گلاب کے پودے کی طرف بہہ گئی۔ پھر شاکرہ یوں ہنسی کہ پھلجھڑی کے سب رنگ کھل کھلا اُٹھے اور اُس نے کہا "شاکرہ اگر واقعی تم نے میری طرف سے انتخاب کر دیا ہے تو آؤ ہم آج ہی رات اپنی نسبت کا اعلان کر دیں۔" وہ کرسی سے اُٹھنے ہی والا تھا کہ شاکرہ نے پکڑ کر اسے کھینچ لیا۔ "نہیں، شراب کے نشے میں کوئی وعدہ نہیں کیا کرتے۔" پھر اُس نے کہا تھا "شاکرہ ہم شادی کے بعد اس گلاب کے پودے کو دیکھنے آیا کریں گے۔ اس کے پھولوں میں ہماری محبت کی مہک ہو گی" اور شاکرہ نے مسکرا کر کہا تھا "کم از کم تمھاری وسکی کی مہک تو ضرور ہو گی۔"

.. .. اور اب شاکرہ جو اس کی بیمار بیوی کی عیادت کو آئی تھی سفید ساڑھی میں ملبوس یوں اجنبی سی لگ

رہی تھی جیسے اس کی بیوی کی کوئی سہیلی ہو جس نے دولہا بھائی کے رشتے سے اس سے پردہ کرنا چھوڑ دیا ہو اور شرم کے مارے دبک کر الگ بیٹھی ہو۔ اس نے پھر گفتگو کا کوئی سرا تھامنا چاہا۔

"کہو شاکرہ کتنے روز کے لئے آئی ہو؟"

"مہینے بھر کی چھٹی ہے۔ سوچتی ہوں پہاڑ پر چلی جاؤں۔ یہاں تو کافی گرمی ہونے لگی ہے۔"

اور خاموشی کے وقفے نے گفتگو کا دھاگہ پھر کاٹ دیا۔

بلقیس اور شاکرہ پھوپھی اور ممانی کی باتیں کرنے لگیں۔ دونوں لڑکیوں نے بچپن کے دن اکٹھے گزارے تھے کالج میں اکٹھی پڑھی تھیں اور کہنے سننے کی ہزاروں باتیں تھیں کہ ایک سے دوسری کا رشتہ ملتا چلا جاتا تھا۔ وہ ایک طرف کھڑا ان دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ چند برس ہوتے وہ جرمنی سے تعلیم ختم کر کے آیا تو یہ دونوں کالج کے آخری سال میں پڑھ رہی تھیں۔ دونوں لڑکیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا شاکرہ پہاڑوں پر اچھل کود کر بہنے والی ندی کی طرح لگتی کہ پتھروں سے سر پٹک پٹک کر جوش و خروش سے چلتی ہے۔ بلقیس میدانوں پر خاموشی سے بہنے والی آب جو تھی۔

کچھ مدت بعد گھر کے ہر شخص کو یقین ہو چلا تھا کہ وہ شاکرہ سے شادی کر رہا ہے۔ اس کے دوست اور شاکرہ کی سہیلیاں ان دونوں کو منسوب سمجھتی تھیں۔ خود ان دونوں کو یقین ہو چلا تھا کہ اب زندگی بھر کا ساتھ ہے۔ اس نے ہونے والی بیوی اور شاکرہ نے ہونے والے میاں کی تلاش ختم کر دی تھی۔ معاملہ اس حد تک پہنچ چکا تھا کہ دونوں میں کسی بات پر شکر رنجی ہو گئی اور نوبت علیحدگی تک جا پہنچی۔ جتنے منہ تھے اتنی باتیں تھیں۔ کسی نے کہا اس نے اپنے کسی دوست کے نام شاکرہ کے خط پکڑ لئے ہیں۔ کسی نے کہا شاکرہ نے اسے گھر کی نوکرانی کا منہ چومتے دیکھ لیا ہے۔ پھر یہ خبر آئی کہ دونوں اپنے ہونے والے بیڈروم کے لئے فالین خریدنے گئے تھے کہ رنگ کے انتخاب پر جھگڑا ہو گیا۔ اصل بات تو کسی کو معلوم نہ ہو سکی البتہ چند مہینے بعد اس نے بلقیس سے شادی کر لی اور شاکرہ خالد سے شادی کر کے کراچی چلی گئی۔ خالد اس کا دوست تھا اور اسی کے ذریعے شاکرہ سے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ خالد ہوائی فوج میں بڑے عہدے پر تھا اور ہوا بازی میں اسے وہ مقام حاصل تھا کہ ایئر فورس میں بھرتی ہونے والے جوان سال پائلٹ اپنے کمروں میں اس کی تصویریں اپنے محبوب فلم ستاروں کے ساتھ لگاتے تھے۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ لوگ کچھ عرصہ طرح طرح کی باتیں کر کے پھر خاموش ہو رہے۔

.... اور اب ہسپتال کے اس چھوٹے سے کمرے میں وہ تینوں اکٹھے تھے اس نے پھر چور نظر سے شاکرہ کی طرف دیکھا اور چاہا کہ کوئی بات کرے مگر ہمت نہ ہوئی۔ خالد کی موت کا ذکر وہ چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ کراچی میں شاکرہ کی ملازمت کے بارے میں بھی وہ اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر وہ شاکرہ سے کیا کہے۔ اس نے سوچا خدا جانے میری بیوی اس وقت کیا سوچ رہی ہو گی۔ اس نے مجرموں کی طرح نظر بچا کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا مگر اس کے خیالات تک نہ پہنچ سکا۔ وہ تنگ آ کر کسی بہانے کمرے سے باہر نکل آیا اور اب ہسپتال کی محراب دار کھڑکی تلے کھڑا سوچ رہا تھا کہ خدا جانے بلقیس اور شاکرہ آپس میں کیا باتیں کر رہی ہوں گی۔ شاید بلقیس نے خالد کی موت کا ذکر چھیڑ دیا ہو اور شاکرہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ہوں اور ان آنسوؤں کے آئینے میں ایک دفعہ پھر وہی منظر اس کی آنکھوں تلے گھوم گیا ہو۔

کراچی میں ہوا بازی کی سب سے بڑی سالانہ نمائش ہو رہی ہے۔ ہزاروں لاکھوں کا مجمع ہے۔ بچے، مرد، عورتیں غل مچا رہے ہیں۔ سر پر ہوائی جہازوں کا شور ہے۔ نیچے تالیاں پٹ رہی ہیں۔ نعرے لگ رہے ہیں۔ ہوائی کرتب ہو رہے ہیں۔ اتنے میں ایک ہوائی جہاز آسمان کی بلندیوں سے عقاب کی طرح جھپٹا اور لوٹن کبوتر کی طرح الٹ بازیاں کھاتا ہوا درختوں کے پاس سے ہو کر پھر اوپر اٹھ گیا۔ فضا نعروں اور تالیوں سے گونج اٹھی۔ پھر ایک لمحے کے لئے مجمع نے دم سادھ لیا جیسے تیر نکلنے سے پہلے کمان تن جاتی ہے۔ اب آسمان پر کچھ شعلے تھے اور دھوئیں کی ایک لمبی لکیر تھی جو زمین کی طرف گر رہی تھی۔ شاکرہ نے چیخ مار کر آنکھوں پہ ہاتھ رکھ لئے۔ ہر طرف شور ہونے لگے اور نوعمر ہوا بازوں کے کمروں میں محبوب فلمسٹاروں کے ساتھ لگی ہوئی تصویر ایک داستان بن گئی۔

محراب دار کھڑکی کے پاس بجلی کے قمقمے کے ارد گرد وہ کالا سا پتنگا ابھی تک چکر کاٹ رہا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیا نکالی اور پھر سب جیبوں میں دیا سلائی تلاش کرنے لگا۔ مایوس ہو کر پھر سگریٹ کی ڈبیا جیب میں ڈال لی۔

اگر شاکرہ اس وقت اس کے پاس آ کھڑی ہو تو وہ اسے کیا کہے گا۔ ان کے درمیان کیا گفتگو ہو گی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ہر طرف خاموشی تھی اور ہسپتال کے لان سے پرلی طرف بڑی سڑک سے ٹریفک کا ہلکا سا شور اس کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔ کیا یوں بھی ہو سکتا ہے کہ وہ شاکرہ کو پھر اسی طرح راوی کے کنارے لے جائے اور کامران کی بارہ دری کے باہر اس بڑے سے پتھر پر وہ دونوں بیٹھ جائیں اور شاکرہ پھر اسی سپردگی سے اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دے۔

اس نے پھر دیا سلائی کی تلاش میں ساری جیبیں از سر نو ٹٹولنی شروع کر دیں۔ مایوسی ہوئی تو اسے واپس جانے کا خیال آیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو شاکرہ اس کی بیوی سے کہہ رہی تھی "بلقیس اب مجھے چلنا چاہیئے۔"

"تم کیسے آئی تھیں شاکرہ؟"

"میرے پاس کار ہے بلقیس تم فکر نہ کرو۔"

اور جب شاکرہ چلنے کے لئے اٹھی تو بلقیس نے اس سے کہا "آپ شاکرہ کو گاڑی تک پہنچا آیئے۔"

"نہیں نہیں میں خود چلی جاؤں گی۔"

"میں تم کو گاڑی تک چھوڑ آتا ہوں شاکرہ۔"

ہسپتال کے لمبے برآمدے میں وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے، بغیر کوئی بات کئے۔ شاکرہ بڑی احتیاط سے چل رہی تھی پھر بھی اس کے جوتے کی ایڑی کی ہلکی سی کھٹاک سنائی دے جاتی تھی۔ کتنا لمبا تھا یہ برآمدہ۔ وہ دونوں خاموشی سے سایوں کی طرح چلتے ہوئے اس برآمدے کو پار کر گئے۔ ڈیوڑھی سے گزرتے ہوئے اس نے ہمت کر کے کہا "شاکرہ میری طرف دیکھو، میں اب بھی وہی ہوں، تم بھی وہی ہو مگر وہ سب کچھ جو ہمارے درمیان تھا کیا ہوا؟" شاکرہ خاموشی سے چلتی رہی۔

ڈیوڑھی سے باہر نکلتے ہوئے اس نے کہا "شاکرہ کامران کی بارہ دری اب بھی وہیں ہے وہ بڑا سا پتھر ہر سال سیلاب میں ڈوب جاتا ہے مگر دریا اترتا ہے تو وہ اپنی جگہ موجود ہوتا ہے" شاکرہ خاموشی سے چلتی رہی۔

ہوا کا جھونکا آیا تو چاروں طرف خوشبو کی ہلکی سی لہریں بکھر گئیں۔

"تم اب بھی وہی پرفیوم استعمال کرتی ہو شاکرہ؟"

شاکرہ نے گھوم کر نرمی سے اس کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہیں دیا۔

ڈیوڑھی سے باہر نکل کر وہ دونوں اس سڑک کی طرف چلنے لگے جہاں شاکرہ کی کار کھڑی تھی مگر تھوڑی دور چل کر یہ دونوں سامنے والے پیپل کی چھاؤں میں کھو گئے جہاں گھپ اندھیرا تھا۔ پھر تھوڑی دیر میں شاکرہ کی کار چلنے کی آواز سنائی دی اور وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتا ڈیوڑھی سے ہو کر برآمدے میں آیا۔ شب کے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ اپنی بیوی کے کمرے کے باہر پہنچا تھا کہ اسے اندر سے ایک چیخ کی آواز سنائی دی۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ اس کی بیوی کو غشی کا دورہ پڑ چکا تھا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے اس کے منہ پر دیئے اور جلدی سے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق دوا کے قطرے اس کے حلق میں ٹپکانے لگا۔

اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اسے ایک نظر دیکھا اور پھر جھٹ مار کر آنکھیں بند کر لیں "میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ چلے جاؤ" بلقیس کی آنکھیں بند تھیں مگر وہ دبی دبی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اٹھ کر کھڑکی سے پردے ہٹا دیئے اور ٹھنڈے ٹھنڈے ہاتھوں سے بلقیس کی پیشانی کو ملنے لگا۔ بلقیس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولنی شروع کیں۔

"کیوں میری جان مجھ سے کیا قصور ہوا؟"

"کچھ نہیں" بلقیس نے بڑی نقاہت سے کہا "چلے جاؤ تم نے اس کا منہ چوما ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا ہے تم اس کا منہ چوم رہے تھے۔"

"نہیں میری جان تمہارا خواب بالکل غلط ہے۔"

"تو پھر تم اتنی دیر کہاں رہے۔ مجھے ساری بات بتا دو۔ میرے پاس جھوٹ نہ بولنا تمہیں میری قسم تم نے اس سے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں بلقیس، میں نے تو اسے یہی کہا تھا کہ وہ سب کچھ جو ہمارے درمیان تھا اب کیا ہوا مگر وہ خاموش رہی۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ کامران کی بارہ دری کے باہر وہ بڑا سا پتھر اب بھی موجود ہے مگر وہ کچھ نہیں بولی۔"

"مگر کیا تم اس بڑے سے درخت کے نیچے سے بھی گزرے تھے؟ وہاں کیا ہوا۔ ایک منٹ کے لئے میری آنکھ لگی تو میں نے خواب میں تم دونوں کو وہیں کھڑے دیکھا" "کچھ نہیں وہاں کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں نے وہاں سے گزرتے ہوئے اپنا بازو اس کی کمر کے گرد ڈال دیا تھا۔ وہ سرد لاش کی طرح چلتی رہی۔ پھر میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کا چہرہ اپنی طرف کرنا چاہا تو وہ ایک دم میری گرفت سے نکل گئی اور کہنے لگی مجھے چومنے کی کوشش مت کرو تم میرے لئے ناپاک ہو چکے ہو اور یہ کہہ کر زور سے تھوک دیا۔"

"کیا کہا اس نے؟" بلقیس نے حیرت سے پوچھا۔

"اُس نے کہا تم میرے لیے ناپاک ہو چکے ہو۔"

غصّے کے شعلے بلقیس کی آنکھوں میں تیر گئے۔ "اُلّو کی پٹھی" اُس نے حقارت سے کہا۔

"وہ کم بخت اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔"

وہ اس کے قریب پلنگ پر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا۔ بلقیس کے چہرے سے غصّے کی لکیریں کم ہوئیں تو جیسے الوہیت کا نور اس کے چہرے پر اُترنے لگا۔ بلقیس نے لیٹے لیٹے دونوں بازو اُٹھا دیئے۔ اس کے خاوند نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا اور بلقیس نے اسے یوں اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا جیسے کوئی قیمتی چیز کو چھپا لیتا ہے۔

وَر کے لئے کنّیا کی ضرورت

فکر تونسوی

یہ اشتہار ہمیں آج سے دس سال پہلے دینا چاہئے تھا۔ لیکن ان دنوں وَر یعنی برخوردار علمی چند "دنیا کے عظیم ہیرو" نامی کتاب پڑھنے میں مصروف تھا اور کہتا تھا "جب تک لائبریری میں یہ کتاب موجود ہے، میں شادی نہیں کراؤں گا"

اور اب جب کہ ہم یہ اشتہار دے رہے ہیں، اس کتاب کے کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ بلکہ لائبریری میں اس کا تازہ ترین ایڈیشن بھی موجود ہے مگر اس کے باوجود، برخوردار علمی چند شادی پر آمادہ ہو گیا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اب اُسے رات کو ڈراؤنے خواب آنے لگے ہیں بلکہ کئی بار تو خواب میں وہ آسمان پر اُڑتے اُڑتے بحرِ اوقیانوس میں جا گرا ہے۔

برخوردار علمی چند کا قد ٹھگنا ہے، اس لیے وہ بلند خیالات کا مالک ہے۔ اونچے پایہ کے انسانوں میں بیٹھ کر اُنھیں بتاتا ہے کہ ہمارے اندر کون کون سی خامیاں ہیں۔ علمی چند میں یہ بلند خیالی ان دنوں پیدا ہوئی، جن دنوں فوٹو گرافروں نے یہ پراپیگنڈہ شروع کر دیا تھا کہ فوٹو کھنچواتے وقت مسکرانا ضرور چاہئے۔ دراصل وہ ہندوستان کی بیداری کا زمانہ تھا۔ ہر ہندوستانی کو شک گزرتا تھا۔ کہ ہندوستان بیدار ہو رہا ہے۔ لیکن شرم اور ڈر کے مارے کوئی کسی کو بتاتا نہیں تھا کہ ہمارا معاملہ دیگر نکلے۔ مگر علمی چند نڈر تھا۔ وہ بلا جھجک ہندوستان کی بیداری کا اظہار کر دیا کرتا بلکہ اس بیداری کے سلسلہ میں یہاں تک کہہ دیتا کہ میرا باپ نہایت رذیل اور لالچی بڈھا ہے۔ جو میری شادی کروا کر ہندوستان کا مستقبل تباہ کرنا چاہتا ہے۔

غرض ان دنوں علمی چند کے خیالات بے حد انقلابی تھے۔ اور اس کی باتیں سن سن کر وہی لطف آتا تھا جو شیو کرنے کے بعد رخساروں پر ہاتھ پھیرنے سے آتا ہے۔

باوجود کوتاہ قامتی کے علمی چند ایک با اصول انسان ہے (ہے نہیں ــــ تھا) مثلاً اس کا فارمولا تھا۔ کہ اگر شادی کے بغیر تخلیقِ آدم پہ حرف آتا ہو تو پھر کنیا ایسی لینی چاہئے، جس کا قد، ور سے ایک فٹ کم ہو ــــ لیکن بعد کی تحقیق و تفتیش سے معلوم ہوا۔ کہ علمی چند سے ایک فٹ چھوٹے قد کی کنیا دنیا میں نایاب ہے۔ دو چار ایسی کنیائیں دستیاب ضرور ہوئی تھیں۔ لیکن بقول علمی چند وہ "پرسنیلٹی" سے محروم تھیں۔ حسن کے اُن اصولوں پر پوری نہیں اترتی تھیں، جس کا ذکر شاستروں اور وید منتروں میں آیا ہے۔

مگر اب علمی چند کا اصول ہے کہ اصول نسبتاً لچکیلے ہونے چاہئیں۔ جن شاستروں اور وید منتروں میں علمی چند کے قد کا ذکر نہیں آیا۔ وہ ماڈرن سوشل سائنس کے تقاضوں پر پورے نہیں اترتے۔ اس لیے ماڈرن سوشل سائنس کی روشنی میں ہم ایسی کنیا بھی

قبول کریں گے۔ جس کا قد علی چند کے قد کے برابر ہو۔ اس سے کم یا زیادہ نہیں ہونا چاہئے، کیونکہ اصول کو اتنا زیادہ لچکیلا نہیں بنایا جا سکتا۔

شادی سے متعلق برخوردار علی چند کے کچھ اور اصول بھی تھے، جو اُسے یوں مرغوب تھے جیسے اسے اپنی تصویر کا پرانا فریم اور جامع مسجد کے کباب مرغوب تھے۔ لیکن جب مارکیٹ میں جدید ڈیزائن کے خوبصورت فریم آ گئے اور جامع مسجد کے کباب مہنگے ہو گئے تو علی چند رو دیا۔ اور اس کے آنسوؤں میں تمام اصول دھندلا گئے۔ اور آج صرف ان کی یاد باقی ہے؛ اُن کی دھند باقی ہے، ان کی فغاں باقی ہے اور فغاں کا کوئی اصول نہیں ہوتا۔

اشتہار دیتے وقت علی چند چالیس کے پیٹے میں ہے۔ اُس کے کچھ بال سفید ہو چکے ہیں اور کچھ بال اُڑ چکے ہیں۔ جو بھی اس کی کوئی محبوبہ شادی کر لیتی، علی چند کے کچھ بال یا تو اُڑ جاتے یا سفید ہو جاتے۔ اور اب اُس کے اندر ایک ایسی فسردگی آ چکی ہے، جیسے شادی کے دس سال بعد کسی خاوند میں آ جاتی ہے۔ خاوند کی سی فسردگی پا کر اب وہ خاوند بھی بن جانا چاہتا ہے۔ اور وہ چاہتا ہے کہ اب جس دُنیا سے بیاہ کرے، وہ کم از کم اس کی حسرتوں کی داد ضرور دے۔ وہ کم از کم یہ ضرور محسوس کرے کہ اس قبر کے نیچے کتنا عظیم الشان مردہ دفن ہے۔

علی چند تعلیم یافتہ آدمی ہے اور ایم۔اے میں دو مرتبہ فیل ہو چکا ہے، ایک مرتبہ تو وہ اس لیے فیل ہو گیا تھا کیونکہ وہ اپنی ایک کلاس فیلو لڑکی سے رومانس کر رہا تھا۔ فیل ہونے کی وجہ بعد میں صحیح نہیں نکلی۔ کیونکہ وہ لڑکی ایم۔اے میں پاس ہو گئی تھی۔ یہ نہیں ہوتا۔ ممتحن ایک کو فیل کر دے اور دوسرے کو پاس۔ محبت سچی ہو تو اُس کے اثرات یکساں ہوتے ہیں ——— لیکن علی چند کا بیان ہے کہ وہ لڑکی چونکہ بیوہ تھی۔ اس لیے دور اندیش تھی۔ اور وہ بیک وقت محبت بھی کرتی تھی اور پڑھائی بھی ——— بہرکیف کچھ بھی تھا، علی چند در پردہ راہ کے زیرِ بن، انقلابی اصول پر عمل نہ کر سکا۔ اور بالآخر صرف دو فقروں کا تبادلہ ہوا اور محبت ٹوٹ گئی۔

"ڈیر شوبھا! کچھ دنوں سے تمہارا رویہ محبوبانہ نہیں رہا"

"ڈیر علی! محبوبیت ہم دونوں میں شاید تھی بھی نہیں"

اور برخوردار علی چند دوسری مرتبہ اس لیے فیل ہو گئے تھے، کیونکہ اس بار جنت سے اور لڑکے بھی فیل ہو گئے تھے۔ مگر کنبہ نے اُس کے دوسری بار فیل ہونے کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ بلکہ صرف اتنا کہا کہ اب علی چند کو شادی اور ایم۔اے کے امتحان، دونوں میں سے ایک چیز کا فوری انتخاب کر لینا چاہیئے۔

برخوردار علی چند ایک بظاہر کھلتے ہوئے گھرانے کا چشم و چراغ ہے۔ (گھر میں دو چراغ اور بھی ہیں) اُن کے والد صاحب جناب فاضل چند جی، جن سے برخوردار علی چند کو شدید نفرت ہے، سوسائٹی کے معزز فرد ہیں۔ اُن کی بیوی اُن کے سامنے بچوں کی طرح کانپتی ہے۔ کانپنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ فاضل چند جی کے پاس پچاس ہزار روپیے کی ملی جلی جائداد ہے اور جائداد کے ٹکڑوں سے نہ بیٹا محروم رہنا چاہتا ہے نہ ماں۔ اس لیے دونوں فاضل چند جی کے ستم سہتے ہیں اور دبک کر رہتے ہیں۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ علی چند نے ایک صاحب کو اپنے والد کے ہاں بھیجا۔ تاکہ اُن سے ایک لڑکی (محبوبہ) کے رشتہ کی بات چیت چلائے۔ مگر فاضل چند جی نے اُن صاحب کو جھڑک کر کہا تھا "علی چند نام کا کوئی لڑکا میرے گھر میں نہیں رہتا۔ بھاگ گیا ہے . . . . . "

چنانچہ علی چند کے کیریکٹر کی تعمیر و تخریب میں باپ کی سخت گیری اور ماں کی مظلوم نرمی دونوں کا ہاتھ ہے۔ فاضل چند جی اسے گالیاں دیتے ہیں اور ماں روتی ہے۔ اگر سوسائٹی میں فاضل چند جی کی عزت نہ ہوتی تو وہ ماں بیٹا دونوں کو خانہ بدر کر دیتے۔ مگر سوسائٹی اپنے کسی عزت دار آدمی کو ایسا نہیں کرنے دیتی —— لہذا فاضل چند جی مجبور ہیں۔ کہ وہ علی چند کی نفرت کے باوجود اُسے ہی جائداد کا وارث بنائیں گے۔ فاضل چند جی اتنے بیوقوف نہیں ہیں کہ صرف بیٹے سے نفرت کی خاطر اپنی جائداد کی دھارمک سنستھا کو دان میں دے دیں۔

لہذا جس کنیا سے علی چند کا بیاہ ہوگا۔ وہ ایک صاحب جائداد خاوند کی بیوی کہلائے گی۔ کیونکہ علی چند اب اپنے انقلابی خیالات کی اُس منزل پر پہنچ چکا ہے، کہ وہ اپنے باپ کی پچاس ہزار روپے کی جائداد کو ٹھکرائے گا نہیں بلکہ یوں قبول کرے گا، جیسے رام بن باس کے وقت بھرت نے ایودھیا کی گدی قبول کر لی تھی۔

اس جائداد کے علاوہ، اگر کنیا چاہے تو گھر سے جہیز لاکر اس میں اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ اگرچہ علی چند جہیز کا قائل نہیں ہے لیکن اگر کنیا کی شکل و صورت اچھی ہو تو وہ جہیز لانے میں بھی برائی نہیں سمجھتا۔ البتہ اس کے والد فاضل چند جی کا خیال ہے کہ جہیز کا تعلق حسن سے نہیں بلکہ عزت سے ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انہیں بہو کو بھی جہیز لانا چاہیے۔ کیونکہ بہو کے ہونٹ چاہے کتنے ہی گلابی کیوں نہ ہوں۔ اگر جہیز نہیں لائے گی تو ان ہونٹوں پر کوئی بوسہ محبت ثبت نہیں ہو سکے گا۔

بہر کیف ہمیں ایک ایسی کنیا کی ضرورت ہے، جو فاضل چند اور علی چند دونوں کے خیالات کا نچوڑ ہو۔ اور اگر کوئی ایسی کنیا مادرِ گیتی نے پیدا نہیں کی۔ تو کوئی ایسی کنیا بھی قبول کر لی جائے گی، جو علی چند کی طرح یا د محبوب میں ابھی تک کنواری بیٹھی ہو۔

بحیثیت علی چند کا معیارِ حسن کیا ہے؟ اس کے متعلق خود علی چند اپنے آپ سے اختلاف رائے رکھتا ہے۔ مثلاً وہ بڑی بڑی غلافی آنکھوں کو پسند کرتا ہے لیکن غلافی آنکھوں والی لڑکی کی کمر دُبلی نہیں ہونی چاہیئے۔ کیونکہ پتلی کمر پہ علی چند کو کئی شعر بہت زیادہ پسند ہیں لیکن قدرت کسی کی شادی کے حساب سے تو کمر نہیں بناتی۔ فطرت تو فطرت ہے۔ موشل ریفارمر نہیں ہے۔ کہ غلافی آنکھوں اور کمر میں ترمیم و تنسیخ کر کے سماجی برائیاں دور کرتی رہے —— لہذا علی چند فطرت اور موٹی کمر دونوں سے نالاں ہے۔

دوسری طرف —— علی چند چاہتا ہے کہ لڑکی ذہین ہو۔ اور جب بات کرے۔ تو اس کے خوبصورت ہونٹ فرطِ حیا سے تھرتھرانے لگیں۔ لیکن فرطِ حیا والے کئی ہونٹ علی چند نے دیکھے ہیں۔ کہ فلسفہ اور دینیات پر بحث نہیں کر سکتے۔ لڑکی ایک ذرہ ہوتی ہے تو ہزار بار ساڑھی کا پلو چباتی ہے۔ ایک بار علی چند نے اپنی ایک محبوبہ سے کہا تھا "میلی افلسفی سپائی نوزا کی اخلاقیات سے مجھے بہت چڑ ہے۔ اس شخص کی بغاوت میں سے ایک سنکے کی بُو آتی ہے —— تمہارا کیا خیال ہے؟"

اور سلیم نے فرطِ حیا سے ہونٹ تھرتھرا کر کہا تھا "مجھے خود سپنوزا پسند نہیں ہیں، شادی کا مطلب بالکل نہیں ہیں نوزا!"

مگر علی چند ابھی تک ہندوستان کے تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں سے پوری طرح مایوس نہیں ہوا۔ اُس کا خیال ہے کہ فطرت ایک نہ ایک دن سپائی نوزا اور تھرتھراتے ہونٹوں کو ضرور یکجا کر دے گی۔ لیکن فی الحال وہ کسی بھی ایسی لڑکی سے بیاہ کر لے گا۔ جس کے صرف ہونٹ ہی تھرتھراتے ہوں۔ سپائی نوزا کا پارٹ وہ خود ادا کرے گا۔

لڑکی تعلیم یافتہ ہونی چاہیئے یا نہیں۔ اور اگر ہونی چاہیئے تو کس حد تک؟ اس کے متعلق ہماری کوئی آزادانہ رائے نہیں ہے سماج کی رائے ہی ہماری رائے ہے۔ اور سماج کی کیا رائے ہے، اس پر سماج میں بھی اختلاف رائے ہے۔ علی چند کہتا ہے کہ جو لڑکی غالب کا شعر صحیح صحیح پڑھ سکے مگر سمجھ نہ سکے وہ مجھے پسند ہے۔ مگر علی چند کی ماں کہتی ہے کہ جو بہو خاوند کی قمیص کے بٹن ٹانک سکے بڑی سوشیل کنیا ہے۔ اور اگر غالب کے اشعار میں بٹن ٹانکنے کی تعلیم دی گئی ہے تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔ مگر محترم فاضل چند جی کا خیال ہے کہ کنیا کو اتنی تعلیم ہرگز نہ دلائی جائے کہ کسی بھی وقت دفتر میں نوکری کر لینے کی دھمکی دینے لگے۔

بہرکیف اس بات پر سارا سماج متفق ہے کہ کنیا اپنے ور سے کم تعلیم یافتہ ہو تاکہ گھر میں امن قائم رہے۔ حد سے زیادہ تعلیم مہلک ہے۔ اور ایسے مہلک امراض پیدا کرتی ہے جن کا بعد میں علاج ممکن نہیں۔ اس لیے کم تعلیم ہی بہتر ہے، علاج سے پرہیز بہتر ہے۔

البتہ اگر کنیا خوبصورت ہو، سڈول ہو اور پڈنگ بھی اچھا بنا سکتی ہو، تو یہ ضروری نہیں کہ وہ غالب کے اشعار بھی پڑھ سکے ایسی صورت میں غالب والی شرط اڑائی جا سکتی ہے، کیونکہ غالب تو دراصل پڈنگ کا نعم البدل ہے۔

اس کے علاوہ ہم کنیا کے لیے چند عام فہم شرطیں بھی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی شرطیں، جن کے بغیر کوئی بیوی، بیوی نہیں کہلاتی خادمہ سی لگتی ہے۔ مثلاً سگھڑ ہو یعنی ٹوتھ پیسٹ ہمیشہ اپنی مقررہ جگہ پہ رکھا ہوا مل جائے۔ نہ کہ چوہوں کے بل سے برآمد کرنا پڑے۔ وفا شعار ہو یعنی اگر خاوند کے سر میں درد ہو تو بیوی کا معدہ خراب ہو جائے۔ پڑوسنوں سے ڈپلومیٹک تعلقات رکھے کیونکہ اُن سے کئی بار آٹا اور کوئلہ ادھار لینا پڑتا ہے۔ کفایت شعار ہو مگر خاوند کے اخراجات پر اعتراض نہ کرے، کیونکہ خاوند لوگ بڑے ذکی الحس ہوتے ہیں۔ اور شدتِ جذبات میں گھر آنا ہی چھوڑ دیتے ہیں اور برخوردار علی چند تو اتنا حساس ہے، کہ شاید ترکِ وطن ہی کر جائے۔

کھانا نہایت نفیس پکا سکتی ہو۔ اگرچہ گھر میں عام طور پر دال بھاجی ہی پکے گی۔ مگر مغل شہنشاہوں کے باورچی دال میں بھی کمال کر دکھلاتے تھے۔ کپڑے دھو سکتی ہو، کبھی کبھی گنگنا بھی سکتی ہو، سہیلیوں میں بیٹھ کر علی چند کی مقبولیت کی ہوا باندھ سکتی ہو، فلم دیکھ کر علی چند سے رومانس کر سکے، جیسے سنگترے کی قاشیں چھیل کر منہ میں دینا اور اُس کے سر کے سفید بال نہایت پیار سے نکال لینا اور محبوبانہ غمزہ سے کہنا "جاؤ بھی، ہمیں یہ بال اچھے نہیں لگتے"

اشتہار ختم کرنے سے پہلے ہم ایک آخری استدعا کرنا چاہتے ہیں۔ کہ مندرجہ بالا تمام تشریحات اور شرائط صرف علی چند کے پس منظر کے طور پر دی گئی ہیں، اس لیے کنیا کے والدین انھیں نظر انداز بھی کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ اشتہار خلوص نیت سے دیا گیا ہے۔ یعنی ہم واقعی علی چند کی کہیں نہ کہیں شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ علی چند کی اب یہ حالت ہو گئی ہے، جیسے کوئی آدمی دن بھر کمرہ میں بیٹھے بیٹھے اوب گیا ہو۔ علی چند کے پاس جو کچھ اپنا تھا، وہ اُس کا صرف پس منظر تھا۔ اور اب اُس کے پاس اپنا کچھ نہیں رہا۔ جو کچھ باقی ہے، سماج کا ہے۔ علی چند کے تمام خیالات اپنے ٹرمینس پر پہنچ چکے ہیں۔ اور اب وہ بالکل شانت ہے، یہ خیالات اُس کے دشمن تھے اور اب یوں لگتا ہے، جیسے کوئی اپنے دشمن کو قتل کر کے اُس کی لاش پر بیٹھا سسکیاں بھرتے بھرتے سو گیا ہو۔

اس لیے موجودہ صورت حالات میں ہمیں ایک ایسی کنیا چاہیئے جو صرف کنیا ہو، کنیا ہونا ہی کافی ہے، باقی تمام باتیں غلط ہیں ——— لڑکی جب گھر آئے گی تو بالکل اُسی طرح گھر میں ڈھل جائے گی، جیسے آج تک ہندوستان کی ہر لڑکی ڈھلتی چلی آئی ہے۔ اور اگر اشتہار میں کسی کو ہماری مردانہ نخوت کی بو آئے۔ تو اُسے صرف اشتہار کی ڈرافٹنگ کا نقص سمجھنا چاہیئے اور کچھ نہیں ———

———

آشیانہ

م۔م۔راجندر

جس وقت جرنیل سنگھ کو پتہ لگا کہ وہ جیل سے رہا ہونے والا ہے تو وہ کچھ بھونچکا سا رہ گیا۔ جیل سے باہر کی دنیا اس کے تصور میں بھی نہیں تھی اور رہائی کے اس اچانک خیال نے ایکا ایکی اس کی نظروں کے سامنے ایک وسیع بیابان سی دنیا پھینک دی۔ اس کے سامنے اس کا اپنا گاؤں جنڈیالہ نیر گیا جہاں آج سے پندرہ برس پہلے اس نے کھیتوں میں پانی دینے کے معمولی جھگڑے پر اشتعال میں آ کر اپنے چچا کو گنڈاسے سے ہلاک کر دیا تھا۔ کوئی سال بھر مقدمہ چلا تھا اور اگرچہ سیشن جج نے اسے موت کی سزا دی تھی مگر ہائی کورٹ نے اپیل پر یہ سزا چودہ سال کی قید میں تبدیل کر دی تھی۔ جب سے آج تک جرنیل سنگھ اسی سنٹرل جیل میں تھا جو اس کے گاؤں سے چند ہی میل کے فاصلے پر تھی۔ وہ جیل سے سال بھر پہلے رہا ہو رہا تھا جو اس نے جیل میں اپنے اچھے رویے سے کمایا تھا۔ اسے یہ بھی پتہ لگا کہ اگر وہ چند سال پہلے جیل وارڈن کے مُکا نہ مارتا تو وہ پچھلے سال ہی رہا ہو جاتا۔

جب وہ اس جیل میں آیا تھا تو یہ اتنی بڑی نہیں تھی۔ مگر ان تیرہ برسوں میں جرنیل سنگھ نے اسے کسی نئی آبادی کی طرح بڑھتے دیکھا تھا۔ آج اس جیل میں ڈھائی ہزار قیدی تھے اور ایک اچھی خاصی بستی آباد تھی۔ شروع شروع میں تو اس جیل کی زندگی بڑی سخت اور صبر آزما تھی۔ مگر اب تو اتنی اصلاحیں ہو چکی تھیں کہ جیل میں کئی ایسی سہولتیں تھیں جو جرنیل سنگھ کے گاؤں میں بھی نہیں تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں زندگی بڑی پامشقت تھی مگر پھر محنت کون نہیں کرتا اور جرنیل سنگھ تو جاٹ تھا جس نے ہمیشہ اپنے ہاتھ سے سخت سے سخت محنت کا کام کیا تھا۔

اسے جیل وارڈن اور جیل سپرنٹنڈنٹ کے سوا جیل کے ہر آدمی سے پیار ہو گیا تھا۔ اس کا پیار جیل کی مٹی میں، اس کی اینٹ اینٹ میں سمویا ہوا تھا۔ اس کی اپنی کوٹھری اسے بڑی عزیز تھی۔ دراصل یہ ساری جیل اسے اپنا گاؤں معلوم ہوتی تھی۔ جیل کے قیدی ساتھی، رسوئیے، مالی، بھنگی، سب جرنیل سنگھ کو پہچانتے اور اسے پسند کرتے تھے۔ اگرچہ اس جیل میں قتل اور ڈاکے کے کئی مجرم اور بھی تھے مگر جرنیل سنگھ جیل کے اس گاؤں کا سب سے پرانا رہنے والا تھا۔ اس کے اس امتیاز نے اسے جیل میں ایک خاص مقام دے رکھا تھا۔ اس نے شروع میں تو پتھر توڑنے اور چکی پیسنے کا کام بھی کیا تھا مگر اب تو کئی سالوں سے دریاں بُنا کرتا تھا اور وہ ایک اچھا کاریگر بن گیا تھا۔

یہ خبر کہ جرنیل سنگھ سوموار کو رہا ہو جائے گا جیل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔ کوئی بھی اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ کم سے کم

جرنیل سنگھ تو نہیں، جیل کے کئی اور آدمیوں کی مانند وہ بھی بھول گیا تھا کہ اس نے کبھی رہا ہونا ہے۔ دراصل اب تو کئی برسوں سے اسے یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ اس جیل میں قید ہے۔ یہاں زندگی ایک ضبط میں ڈھلی ہوئی تھی اور اس کے معمول میں ایک سرگرمی تھی جس کی گردش میں باہر کی دنیا کا تصور کیسے تھا۔ اتنے عرصے کی قید کو قید بھلا کون کہے گا۔ اپنی محدود چار دیواری کے باوجود جیل اس کے لیے ایک مکمل دنیا تھی جہاں وہ تیرہ برس جیا تھا!

جرنیل سنگھ جدھر جاتا ادھر ہی اس کی رہائی کے متعلق باتیں ہونے لگتیں۔ جیل میں رہنے والوں کی ایک بہت بڑی تعداد کو یہ دکھ تھا کہ اب جیل کے احاطے میں جرنیل سنگھ نظر نہیں آئے گا اور اس کی جانی پہچانی شکل ایک دھندلکے میں ڈوب جائے گی۔ مگر چونکہ جرنیل سنگھ قید سے رہا ہو رہا تھا، سب ہی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ دینا لانگری بولا:

"جرنیلے تیرے سے ہی جیل میں رونق تھی۔ کبھی کبھی چٹھی لکھیو"

جرنیل سنگھ کی داڑھی اور مونچھیں ایسے پھڑپھڑائیں جیسے وہ کوئی کبوتر تھیں جسے دینا لانگری نے رسوئی کی چھت پر سے پکڑ لیا تھا۔ وہ ایک بے جان سی ہنسی ہنس پڑا۔ دینا پھر بولا:

"اپنی کھیتی سنبھال اور موج کر۔ تیرا لڑکا بھی اب سیانا ہو گیا ہوگا"

لڑکے کا ذکر سن کر جرنیل سنگھ چونک پڑا۔ جب وہ قید ہوا تھا اس کا لڑکا صرف چار سال کا تھا۔ مگر اس کے بعد وہ اپنی بیوی بنتو اور اپنے لڑکے سے صرف دو دفعہ جیل کے پھاٹک پر ملا تھا۔ مدت سے اس نے ان کے بارے میں نہیں سنا تھا اور اگرچہ وہ دونوں اس کے اپنے تھے مگر اتنے لمبے عرصے کی جدائی نے اس کے پیار کو غیر متعلق سا، دھندلا سا کر دیا تھا اور ان کے ذکر نے اسے ایک لمحے کے لیے چونکایا تو مگر اس کے دل میں کوئی تڑپ اور درد پیدا نہیں کیا۔

"کدھر جانے کا بول بھی جرنیلے" دینا نے پھر پوچھا۔

"دینا جنڈیالے جانا ہے اور کہاں جاؤں گا۔ کھیتی دیتی اب کیا ہو گی۔ کرنیل سنگھ نے کچھ سنبھالا ہو تو پتہ نہیں"

سوموار کی صبح کو جرنیل سنگھ معمول سے پہلے ہی اٹھ گیا۔ وہ اتوار کو سب سے مل چکا تھا مگر اس کے باوجود وہ جیل کے کونے کونے میں گھوما اور اس نے اپنے بہت سے ساتھیوں سے الوداع کہی۔ لوٹ کر وہ اپنی کوٹھڑی میں بیٹھ گیا اور اس اثنا میں اس کی رہائی کے کاغذات بنتے رہے۔ وہ اپنی کوٹھڑی میں چپ چاپ ایک مغموم بت کی مانند بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ گیارہ بجے اس نے روٹی کھائی اور دینا نے اسے زبردستی اپنی طرف سے زیادہ کھلائیں۔ بارہ بجے ڈاکٹری معائنہ ہوا اور اسے بغیر نمبر کے پہننے کے لیے دھلے ہوئے کپڑے ملے۔ وارڈن اور سپرنٹنڈنٹ کے سامنے پیش ہوتا ہوا وہ کوئی نین نیچے رہا ہوا اور اسے قاعدے کے مطابق شام کی روٹی کے پیسے اور جنڈیالہ تک پہنچنے کا کرایہ دیا گیا۔ جب وہ آنسو بہاتا ہوا جیل کے آہنی پھاٹک سے باہر نکلا تو پہرے پر کھڑے ہوئے سپاہی نے بھی آگے بڑھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔

جرنیل سنگھ ایک ایسے مجبور بوڑھے کی مانند باہر لڑکھڑایا جسے اس کی مرضی کے بغیر کوئی بچپن عطا کر رہا ہو۔ سر پہر کی چلچلاتی دھوپ تھی اور اس کے سامنے اسی کی طرح سڑک کا کالا لمبا فیتہ بے حس پڑا تھا۔ اس نے تھکی ہوئی اور مشکوک نظروں سے سڑک کی دوری میں جھانکا اور آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ وہ چند قدم جا کر رکا اور مڑ کر جیل کی طرف ایسے دیکھنے لگا جیسے اپنی کوئی چیز بھول آیا ہو۔

وہ پھر چلنے لگا اور جب سڑک کے اس موڑ پر پہنچا جہاں سے مڑنے پر جیل کو نظروں سے اوجھل ہو جانا تھا تو وہ پھر رک گیا اور چند منٹ تک جیل کی طرف منہ کر کے جھانکتا رہا۔ پھر اس نے جیل کی طرف ہاتھ جوڑ دیئے جیسے رخصت مانگ رہا ہو۔

موٹر کے اڈے پر پہنچا تو اس کی آنکھیں ایسے ہو رہی تھیں جیسے وہ کئی راتوں سے جاگ رہا تھا۔ اس نے کرایے کے پیسے نکالے مگر کچھ سوچنے لگا۔ یہاں سے اس کا گاؤں سات میل تھا۔ قید ہونے سے پہلے وہ ہمیشہ گاؤں سے یہاں پیدل آتا تھا اور پیدل لوٹتا تھا۔ وہ راستہ اب بھی جوں کا توں موجود تھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے یہ کل کی ہی بات تھی اور وہ آج بھی اسی طرح شہر سے گاؤں لوٹ رہا تھا۔ اسے کچھ خیال آیا اور اڈے سے بازار کی طرف مڑ گیا۔ شہر میں بہت تبدیلی آ چکی تھی اور وہ چاروں طرف حیرت سے دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ کتنا چھوٹا شہر تھا اور اب کتنا بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے کرایے کے پیسوں سے ایک دکان سے ایک مضبوط سی لاٹھی خریدی جس کے بغیر اس نے کبھی سفر نہیں کیا تھا۔ اس نے لاٹھی کو زمین پہ رکھ کر ہاتھ سے دبا کر دیکھا اور پھر کندھے پر رکھ کر موٹر کے اڈے پر لوٹ آیا۔ اسے بالکل ایسا محسوس ہوا جیسے وہ وہی پرانا جرنیل سنگھ ہے اور زمین آسمان، سڑک، درخت کچھ بھی نہیں بدلا ہے۔ اس کے پاؤں میں وہی گرد بیٹھی ہے۔ جنڈیالہ وہ سامنے ہے، اور وہ تیزی سے چلنے لگا۔

راہ میں اسے شہر آتے ہوئے کئی گاؤں والے نظر آئے مگر نہ وہ کسی کو پہچانتا تھا اور نہ کوئی اسے جانتا تھا۔ اسے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ادھر دیہات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ وہ اتنی مدت کے بعد جا رہا تھا۔ اسے شک سا ہوا کہ اس کا گاؤں ہے بھی یا اجڑ گیا۔ کم از کم وہ جنڈیالہ کی موجودگی کو محسوس کرنے کی تڑپ پانا چاہتا تھا۔ اور جب اس نے ایسے ہی ایک راہگیر سے جنڈیالے کا راستہ پوچھا اور اس نے انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ رہا نا اس طرف" تو اس کا دل بچوں اچھل پڑا۔ اس نے لاٹھی کو زمین پر مارا اور آگے بڑھ گیا

جس وقت جرنیل سنگھ اپنے گاؤں کی پگڈنڈی پر مڑا، سورج افق کی سانولی فضا میں کانپ رہا تھا اور اس کا زرد سونا گاؤں کی منڈیروں کو چھو رہا تھا۔ کئی کسان اپنے بیلوں کو ہانکتے ہوئے لا رہے تھے اور جرنیل سنگھ دو تین کے بارے میں تو یہ کہہ سکتا تھا کہ وہ کون ہیں۔ مگر جرنیل سنگھ کو کسی نے بھی نہیں پہچانا۔ جس وقت وہ گاؤں کے پہلے چند گھروں کو پار کر رہا تھا تو اسے ایک بانکا نوجوان نظر آیا جس کی شکل اس سے ملتی سی تھی مگر وہ نوجوان جرنیل سنگھ کو پاس سے دیکھ کر گزر گیا اور جرنیل سنگھ بھی جان گیا کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ بوڑھا چودھری منگو اپنے مکان کے باہر حقہ پی رہا تھا۔ جرنیل سنگھ نے چودھری کو بلایا تو چودھری کچھ دیر آنکھیں جھپکانے کے بعد سمجھ گیا کہ جرنیل سنگھ ہے۔ وہ فوراً ایسے پیچھے ہٹا جیسے ڈر گیا ہو اور اس نے زور سے اپنے لڑکے کو آواز دی۔ ایک منٹ کیلئے ایسا لگا جیسے اس نے جرنیل سنگھ کو نہیں پہچانا۔ جرنیل سنگھ بولا "چودھری میں ہوں جرنیلا"

"اوہو جرنیلے تو......"

"چودھری میں چھوٹ گیا ہوں۔ میری جیل ختم ہو گئی"

اور چودھری کے سامنے زمین پر لاٹھی ٹیک کر بیٹھ گیا اور چودھری اور پیچھے کھسک گیا۔ آناً فاناً گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ جرنیل سنگھ چھوٹ کر آ گیا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں چودھری کے گھر کے آگے میلہ سا لگ گیا۔ اس بھیڑ میں گاؤں کے وہ لوگ تو تھے ہی جو جرنیل سنگھ کو جانتے اور پہچانتے تھے مگر دوسرے لوگ اور بچے بھی تھے جن کے لیے کسی کا جیل سے چھوٹ کر آنا ہی ایک عجیب بات تھی۔

اب جرنیل سنگھ سے کوئی بھی نہیں ڈر رہا تھا اور اس نے جیل کی کئی باتیں سنائیں اور گاؤں والوں کا لایا ہوا اچھی کھانڈ اور کنوئیں کے پانی کا شربت پیا۔ وہ بھیڑ میں کھوج کھوج کر دیکھ رہا تھا مگر کرنیل سنگھ اس بھیڑ میں نہیں تھا۔ اگرچہ خبر تو سارے گاؤں میں پھیل چکی تھی۔ اس نے چودھری کے گھر کی دیوار کی آڑ میں سے جھانکتے ہوئے گھونگھٹوں میں تلاش کیا مگر بنتو بھی نظر نہیں آئی۔ جب اس کی نظریں بھیڑ میں پگڑیوں پر نہیں رہی تھیں تو چودھری بولا:-

"کرنیل سنگھ دو برس ہوئے یہ کہہ کر چلا گیا کہ فوج میں بھرتی ہوں گا۔ پتہ نہیں کہاں ہے کہاں نہیں۔ سب نے سمجھایا کہ تیری عمر تھوڑی ہے مگر مانا نہیں۔ اس کے کچھ دن بعد تیری بہو بھی اس گاؤں سے چلی گئی۔ اس کے گھر کا پتہ کروایا تھا مگر وہاں بھی نہیں پہنچی اور تیرا سسورا کئی دفعہ یہاں آیا۔ تیرا گھر سارا ٹوٹ پھوٹ گیا ہے۔ میں نے اپنے ڈنگر باندھ دیئے تھے کل کھلوا دوں گا۔"

جرنیل سنگھ جھکا ہوا سنتا رہا اور وہ ایسا بے حس و حرکت تھا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ چودھری کے بات ختم کرتے ہی وہ فوراً جھٹکے کے ساتھ اٹھا اور بڑی تیزی سے پیچھے ہٹا۔ جرنیل سنگھ کو جاتا دیکھ کر چودھری بولا "روٹی لا رہا ہے کاکا کھا کے جائیو۔ اپنا گھر بار دیکھ اور کھیتی سنبھال لے۔ تیرا ایک بیل تو مر گیا تھا۔ دوسرا بنیا لے گیا تھا۔ اگر اس نے چاہا نہیں ہے تو جو کچھ اس کا دینا ہے دے کر چھڑا لے۔"

جرنیل سنگھ رک گیا اور اس نے روٹی کھائی۔ بھیڑیں اس پر جھکتی رہیں حتیٰ کہ ایک گہرا اندھیرا رینگ آیا اور کالی رات ہونے کی وجہ سے سب اس اندھیرے میں سائے سے نظر آنے لگے۔ جرنیل سنگھ اٹھا اور خود بخود بٹتی ہوئی بھیڑ کو چیر کر نکل گیا۔ وہ گاؤں کی گلیوں میں پھرتا رہا اور گاؤں کے لوگ کچھ ڈرتے رہے، کچھ ساتھ چلتے رہے۔ وہ اپنے گھر سے گزرا تو اس نے زور سے اپنی لاٹھی بند دروازے پر ماری اور رکے بغیر آگے بڑھ گیا۔

وہ گاؤں کی ایک ایک گلی میں بے مطلب گھوما۔ پھر وہ باہر کھیتوں کی طرف ہو لیا اور وہاں سے نہر پہ۔ آج کی کالی رات میں نہر کا سفید پانی ہی ارد گرد کا چاند تارا تھا۔ اس نے اپنی پگڑی کھولی، بالوں کو ٹھیک کیا، اور نہر کے کنارے پگڑی بچھا کر لیٹ گیا۔ وہ بہت دیر تک لیٹا رہا اور پانی اپنے بہاؤ پر چلتا رہا۔ اس وقت میں وہ سویا بھی اور جاگا بھی۔ پھر اس نے اپنی پگڑی سمیٹی اور اٹھا کر بغیر باندھے اپنے سر اور ٹھوڑی کے گرد لپیٹ لی۔ وہ کھیتوں سے باہر آ کر جس پگڈنڈی سے آیا تھا اس پگڈنڈی پر ہو لیا۔

سڑک پر پہنچ کر اس نے ادھر ادھر جھانکا اور اپنے گاؤں کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ تاریکی اور فاصلے کے باوجود اس کے ذہن کی آنکھیں گاؤں کی گلیوں میں اس کے اجڑے ہوئے آشیانے کو صاف دیکھ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور اس نے منہ موڑ لیا۔ سڑک گہرے اندھیرے کی گود میں سوئی پڑی تھی اور دائیں بائیں دوری میں کھمبوں پر بجلی کے مدھم سے بلب ٹھٹھر رہے تھے۔ وہ جس رستے سے آیا تھا اسی پر ہو لیا۔ اس کے قدموں میں ایک تیزی تھی اور وہ کبھی کبھی اپنی لاٹھی یونہی سڑک پر مار دیتا تھا۔ اس نے کتنی ہی کنارے لگی ہوئی بیل گاڑیوں اور اونگھتے ہوئے بیلوں کو پار کیا۔ کھیتوں میں گیدڑوں کی آوازوں سے بیگانہ وہ آگے بڑھتا رہا۔ جب وہ کشن گڑھ کے موڑ اڈے پر پہنچا تو آدھی رات ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی پگڑی ٹھوڑی پر سے اتاری، بالوں کو ٹھیک کر کے اسے سر پر باندھا اور ایک گڈے کے کھلونے کی مانند جو چابی سے حرکت کرتا ہے وہ جیل کی سڑک پر ہو لیا۔

اس کا تنفس تیز ہو گیا۔ وہ جیل کے پھاٹک سے کوئی پندرہ بیس گز ادھر ہی سڑک سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور جیل کی طرف گھورنے لگا۔ بند پھاٹک کے باہر ایک لٹکتے ہوئے تیز روشنی کے بلب کے نیچے ایک سپاہی رائفل کندھے پر رکھے لفٹ رائٹ کر رہا تھا۔ جرنیل سنگھ نے

اسے غور سے دیکھا مگر اس کا جانا پہچانا سپاہی نہیں تھا شاید کوئی نیا سپاہی لائن سے آیا ہو۔

دو چار منٹ تک جرنیل سنگھ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی اور آہستہ سے رینگ کر جیل کی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اندھیرے نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ ایک منٹ سانس روکے کھڑا رہا اور پھر وہ آہستہ آہستہ پھاٹک کے اتنا قریب کھسک آیا جتنا وہ بغیر نظر آئے آ سکتا تھا۔ وہ بالکل دیوار سے چپک گیا۔ پہرے والا سپاہی اب اپنی لفٹ رائٹ کو روک کر اس کی طرف پیٹھ کئے کھڑا تھا۔ جرنیل سنگھ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ لپکا اور اس نے لاٹھی کا ایک بھرپور ہاتھ سپاہی کی پیٹھ پر مارا۔ ایک چیخ بلند ہوئی اور سپاہی لڑکھڑایا۔ اندر کی گارد نے حرکت کی، ایک شور سا مچا، خبردار کی آوازیں آئیں، جیل کی خطرے کی گھنٹی بجی مگر جرنیل سنگھ نہیں بھاگا۔ اس نے اپنی پگڑی منہ پر لپیٹ لی اور لاٹھی کو سنبھالے کھڑا رہا۔ اتنے میں باہر کے دوسرے نقطوں کے پہرے دار بھی آ گئے، پھاٹک کھلا اور سپاہیوں کی ایک بڑی تعداد نے، بڑے شور و غل کے درمیان جرنیل سنگھ کو گرفتار کر لیا!

آخری خواہش

رتن سنگھ

وہ کون ہے۔ کیا نام ہے۔ امیر ہے یا غریب۔ گمنام ہے یا کوئی مشہور ہستی۔ ان سب باتوں کا ذکر یہاں فضول ہے۔ صرف اتنا جان لینا ضروری ہے کہ وہ ایک بوڑھا انسان ہے جس نے سُکھ اور دُکھ سے بھری ہوئی زندگی کا ایک لمبا سفر طے کیا ہے۔ اور اب اُسے اس بات کا احساس ہے کہ اُس کی زندگی مختصر ہے۔ بہت مختصر۔ نا معلوم کب اس کی روح اس کے بوڑھے جسم کو چھوڑ کر پرواز کر جائے۔ موت کا احساس یوں تو ہر عمر میں انسان کو رہتا ہے لیکن آج اِسے شدت سے اُس نے اُس وقت کو محسوس کیا تھا۔ جب اچانک سیر کرتے ہوئے ایک بوڑھے شیشم کے پیڑ کو اس نے زمین پر گرے ہوئے پایا۔ اس پیڑ کو وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا۔ اکثر اُس کے تنوں پر بیٹھ کر اُس نے اردگرد کے مناظر کو دیکھا تھا۔ کل تک وہ ہمیشہ کی طرح اپنی جگہ پر کھڑا تھا۔ لیکن رات کو آندھی آئی تھی۔ تیز ہوا چلی تھی اور اس وقت وہی پیڑ زمین پر چت پڑا تھا۔ اس پیڑ کو گرتے ہوئے دیکھ کر اس کے اپنے قدم جیسے ڈگمگا گئے ہوں۔ اُس دن وہ بہت اُداس رہا۔

زندگی کی طرح موت کا تصوّر بھی ایک فطری جذبہ ہے جو انسان کو اس کے بارے سوچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اسی جذبے کے پیشِ نظر اُس کے دل میں ایک عجیب سا خیال آیا۔ کیوں نہ وہ اپنی قبر کے لیے ابھی سے جگہ پسند کر لے۔ ہر صبح کو سیر کرنے وہ جاتا ہی ہے۔ ہرے بھرے کھیتوں کا وہ بچپن سے دلدادہ ہے۔ جہاں ہرے بھرے پودے معصوم اور الہڑ کنواریوں کی طرح مِل کر ناچتے ہیں۔ جہاں قدرت ہر وقت زندگی کا ایک خاموش سا پیغام دیتی ہے۔ جہاں سرسراتی ہوا کانوں میں میٹھا گیت گنگناتی ہے۔ ایسی جگہوں پر شہری زندگی کے شور و غل کے برعکس اس کی رُوح کو بہت سکون ملتا ہے۔ کبھی کبھی تو وہ چاہتا ہے کہ ایسے ماحول میں بھری ہوئی ساری مٹھاس ایک ہی سانس کے ساتھ اپنے اندر بھر لے۔ اور پھر وہ لمبے لمبے سانس لینا شروع کر دیتا ہے۔ ایسے موقعوں پر جب اُسے خیال آتا ہے کہ اب دن بدن بلکہ ہر لمحے میں موت کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ اور قدرت کا یہ حُسن، یہ نظارے پھر دیکھنے کو نہ ملیں گے تو وہ اداس ہو جاتا ہے۔ اور اسی لیے وہ اپنی قبر کے لیے کوئی ایسی جگہ منتخب کرنا چاہتا ہے۔ جو قدرت کی تمام رنگینیاں لیے ہوئے ہو۔

وہ بہت دنوں تک اپنے گھر کے گرد و نواح میں کسی ایسی ہی پُرسکون جگہ کی تلاش میں رہا۔ اُسے کوئی جگہ پسند ہی نہ آ رہی تھی۔ جس طرح انسان زندگی میں مکان بنانے سے پہلے ہر پہلو پر سوچ لیتا ہے کہ آبادی کیسی ہے۔ آمد و رفت کے وسائل کیسے

ہیں۔ اڑوس پڑوس کیسا ہے۔ مکان ہوادار ہے یا نہیں۔ اسی طرح وہ ہر جگہ کو بہت سے پہلوؤں سے دیکھتا۔ کوئی جگہ اُسے زیادہ کھلی معلوم ہوتی، کوئی بالکل درختوں سے گھری ہوئی۔ کوئی عام راستے سے بہت زیادہ ہٹ کر ہے تو کوئی راستے کے بالکل قریب۔ لیکن وہ مایوس نہیں ہوا۔ وہ اپنے من پسند کی جگہ تلاش کرنا چاہتا تھا۔ جہاں سکون بھی ہو اور زندگی کا پیغام بھی۔

جس طرح اچھا مکان بنانے میں بہت سی دشواریاں آتی ہیں۔ لیکن آدمی اگر مصمم ارادہ کرے تو دشواریاں دور ہوتے بھی دیر نہیں لگتی۔ ٹھیک اسی طرح وہ بھی پوری دھن سے اپنی قبر کے لیے عمدہ سی جگہ تلاش کرنے میں مصروف رہا۔ پہلے وہ صبح گھنٹہ دو گھنٹے سیر پر صرف کرتا تھا۔ لیکن اب اس کی سیر کا دائرہ اور زیادہ وسیع ہو گیا۔ اکثر ایسا ہوا کہ وہ صبح کا گھر سے نکلا ہوا دوپہر کو گھر لوٹتا۔ آخر اتنی انتھک محنت کے بعد اُسے ایک جگہ پسند آ ہی گئی۔ یہ جگہ دریا کے کنارے سے بیس پچیس گز کے فاصلے پر واقع تھی۔ وہاں سے دریا کا بہتا ہوا پانی بخوبی دیکھا جا سکتا تھا۔ زمین کے اسی قطعے پر تین چار شیشم کے پیڑ تھے۔ ایک ببول کا پیڑ تھا۔ جس کے نیچے کچھ جنگلی پھول کھلے ہوئے تھے۔ اسی قطعے کے نیچے کھیتوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔

اُس نے سوچا۔ یہ جگہ بہت اچھی رہے گی۔ ایک طرف قدرت ہری پوشاک پہنے ہے۔ دوسری طرف دریا کی لہروں کا شانت سنگیت ہے۔ اور پھر یہ جنگلی پھول بھی۔ ایسے ماحول میں اُسے مرنے کے بعد یقیناً شانتی ملے گی۔ یہ جگہ اُسے ایسی پسند آئی کہ ایک لمحے میں اُس نے سوچ ڈالا جیسے وہ مر گیا ہے۔ اُس کے احباب سفید کفن میں باندھے ہوئے پھولوں سے ڈھکے اور سجے بیان کو اس طرف لا رہے ہیں۔ جب لوگ اُسے اٹھائے ہوئے کسی دوسری طرف سے جانے لگے۔ تو جیسے وہ خود ہی بول پڑا۔ اُدھر نہیں۔ ادھر۔ میری قبر یہاں بنے گی۔" پھر خود ہی اُسے اپنی حماقت پر ہنسی آ گئی۔ بھلا میں اُس وقت ان کو یہ کیسے بتا سکوں گا کہ مجھے کہاں دفنایا جائے۔ اس سے اس کے سامنے نیا مسئلہ آ کھڑا ہوا۔ وہ کیونکر اپنے کسی دوست یا عزیز پر یہ خواہش ظاہر کر سکے؟

بہرحال اس دن وہ سیر سے بہت خوش خوش لوٹا۔ جیسے اُس نے اپنے لیے تاج محل تعمیر کروا لیا ہو۔ راستے بھر وہ سوچتا رہا کہ کس طرح میں اپنے گھر والوں پر یہ خواہش ظاہر کر سکوں۔ تین دن وہ اسی مسئلے پر غور کرتا رہا۔ لیکن اس بیچ میں وہ ہر روز سیر کرنے دریا کے اسی کنارے کی طرف جاتا۔ وہاں پہروں کھڑا رہتا۔ وہیں کھڑا ہو کر دور سے بہتے ہوئے دریا کو دیکھتا رہتا۔ محظوظ ہوتا رہتا۔ پھر وہ گھوم کر لہلہاتے کھیتوں کی طرف دیکھتا۔ جھومتی ہوئی فصلوں کے ساتھ ہی اس کا دل بھی انہی کے دل میں ناچنے لگتا۔

اب تک اُس نے صرف زمین کے اس قطعے کو پسند کیا تھا۔ لیکن اُس خاص جگہ کا انتخاب ابھی باقی تھا۔ جہاں پر اُس کی قبر بنے گی۔ اس کے لیے ابھی تک وہ پورا فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔ بہت سی جگہیں رد کرنے کے بعد بڑی مشکل سے آخر اس نے اس جگہ کو بھی پسند کر لیا۔ یہ آخری فیصلہ تھا۔ جو اس کے خیال میں بہت اچھا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی۔ جہاں سے سورج کو طلوع اور غروب ہوتے دیکھا جا سکتا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں سے دریا کی لہروں کا سنگیت سنا جا سکتا تھا۔

اب وہ چاہتا تھا کہ جلدی سے اپنے بیٹے کو یہ سب سمجھا دے کہ قبر کہاں بنے گی۔ قبر کا رخ کیا ہو گا۔ لیکن اس کا لڑکا دور رہتا تھا۔ کسی دوسرے شہر میں۔ اس کا جلد واپس آنا ممکن نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے سوچا کیوں نہ میں یہ بات اپنے پوتے کو بتا دوں۔ وہ میرے مرنے پر گھر والوں کو بتا دے گا۔ لیکن اگر وہ بھول گیا تو۔ آخر بچہ ہی ہے نا۔ پھر بھی ایک صبح وہ اپنے پوتے کو اسی مقصد سے لے کے چلا — اُس نے راستے میں اُسے کچھ بتانا چاہا۔ اپنے مرنے کے بارے میں۔ لیکن اُس بچے نے کچھ ایسے سوالات کیے کہ بچے کو جگہ دکھائے بغیر ہی وہ

واپس سے آیا۔ اس نے سوچا۔ اس ننھے سے بچے کو ابھی زندگی کی کئی بہاریں دیکھنا ہیں۔ اس سے ابھی سے موت کے بارے میں باتیں کرنا ایسا ہوگا جیسے ایک ان کھلی کلی کو خزاں کی باتیں بتانا، جس نے ابھی موسم بہار کی رنگینیوں کا لطف بھی نہ اٹھایا ہو۔

آخر اس نے اپنے لڑکے کو تار دے دی۔ جب اس کی تار کا کوئی جواب نہ آیا تو وہ بہت پریشان ہو گیا۔ اُسے یہ بھی شبہ تھا کہ ہو سکتا ہے۔ لڑکے کو بتانے پر بھی میری یہ آخری خواہش پوری نہ ہو سکے۔ ہو سکتا ہے۔ وہ کہیں باہر گیا ہوا ہو۔ یا میری موت ہی اس جگہ سے کہیں دور واقع ہو جائے۔ اِس سے اس کی پریشانی اور زیادہ بڑھ گئی

ایک دن اسی قطعہ زمین پر کھڑے کھڑے جب وہ قدرت کے مناظر دیکھنے میں محو تھا۔ اُس نے کچھ تھکاوٹ سی محسوس کی۔ اس کا لیٹ کر آرام کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ معاً اُسے خیال آیا۔ کیوں نہ اپنی قبر بننے والی جگہ پر لیٹ کے دیکھوں۔ یہ خیال آتے ہی اُس کے جسم نے اس کا ساتھ دیا۔ اور دوسرے لمحے وہ اس زمین پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ پاؤں جُڑے ہوئے۔ ہاتھ جسم کے ساتھ لگے۔ نرم گھاس پر بکھرے ہوئے شبنم کے موتی ٹوٹ گئے۔ اور اُن کی نمی کو اپنے جسم کے اندر محسوس کرنے لگا۔ ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ اور اس کے کانوں میں کوئی گیت گنگناتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ اوپر آسمان اپنی نیلی چادر بچھائے تھا۔ فضا میں سورج کی شفاف کرنوں سے دُھلے ہوئے سفید بادل آہستہ آہستہ تیر رہے تھے۔ کچھ دیر بعد رنگ برنگی ننھی منی چڑیوں کا ایک غول پر پھڑپھڑاتا ہوا اس کے اوپر سے نکل گیا۔ اور اس کی آنکھیں دور تک چڑیوں کے اِس قافلے کا پیچھا کرتی رہیں۔ پھر اس کی آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ آنکھیں بند کیے ہوئے کھیتوں کی آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ گیت بہت میٹھا تھا۔ اُسے بہت بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر لیٹے رہنے کے بعد اُسے نیند آنے لگی۔ اُس نے سوچا۔ کیوں نہ سو جاؤں۔ آخر مرنے کے بعد بھی تو یہیں سونا ہے۔

اور وہ سو گیا۔ خوش خوش۔ ایسی نیند۔ جس سے آج تک کبھی کوئی نہیں جاگا۔

ریت کی دیوار

احمد شریف

میں اپنے مکان کی چھت پر بجھروکوں کے نیچے بیٹھا پڑوسی کے گھر میں جھانک رہا تھا۔ چونکہ یہ مذموم حرکت میں پہلے بھی کئی بار کرچکا تھا۔ اس لیے اس گھر کے چپے چپے سے واقف تھا۔ میں نے ہمیشہ چاہا تھا کہ اپنے آپ کو اس حرکت سے باز رکھوں مگر اس گھر میں رانی اور شہزادی جیسی لڑکیاں رہتی تھیں۔ میرے جیسا تنہائی سے اکتایا ہوا دنیا تک جھانک کئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس گھر میں بھی رونقیں دیکھ کر میرے دل نے کئی بار انجانی دھڑکنیں گنی تھیں۔

رانی بڑی اور شہزادی چھوٹی تھی۔

لیکن اس وقت مجھے کپکپی چھڑی ہوئی تھی اور میرا رواں رواں گوش برآواز تھا ——— تھوڑی دیر پہلے وارداتِ ہی ایسی گزری تھی ———

نانی اپنے چہرے کی طرح سوکھی ہوئی چونٹی کی نوک شہزادی کی نازک پسلیوں میں گاڑ کر غصے اور نفرت سے پھنکاری۔

"ابھی سے آگ لگ گئی ہے!"

شہزادی پسلی پکڑ کر دوہری ہوگئی۔ یوں جھکنے سے اس کی ادھورا نی رنگین قمیص کا گریبان ڈھلک گیا اور رذرا ذرا سی گولائیوں کی درمیانی لکیر قدرے گہری ہوگئی۔ شانوں کی نازک ہڈیاں ابھر آئیں اور ریڑھ کی ہڈی کے ساتھ ساتھ کمر کا خم بھی نمایاں ہوگیا۔ اس کا جسم ایسا لچکیلا تھا کہ ذرا سا بل کھانے سے ڈھکی چھپی حقیقتیں آپ ہی آپ آشکار ہو جاتیں۔ میں ان دنوں ایسے دور سے گزر رہا تھا کہ نرم نرم اور گداز جسم کے خیال ہی سے تنہائیوں میں لذت کا انوکھا احساس جاگ اٹھتا۔ وقتی طور پر میرا اور ماحول کا باہم رشتہ ٹوٹ سا جاتا۔

اس وقت بھی جیسے میں جاگتے کا خواب ہی دیکھ رہا تھا۔ سورج کی تپش سے میرے سر پر گرم گرم توا سا رکھا ہوا تھا۔ پسینے کی بوندیں کنپٹیوں سے ہوتی ہوئی مسلسل گردن کی طرف ڈھلک رہی تھیں۔ اکڑوں بیٹھے بیٹھے میرے پاؤں سو گئے۔ میں نے رومال نکال کر پسینہ خشک کیا اور نئی پتلون کا خیال کئے بغیر گندے فرش پر بیٹھ گیا۔ میری آنکھیں پڑوسی کے گھر میں دو چھتی تلے شہزادی اور اس کی نانی پر لگی ہوئی تھیں۔

نانی نے خونخوار نگاہوں سے شہزادی کی طرف دیکھا اور سہمی سہمی، گٹھڑی بنی دیکھ کر اس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

اس نے دانت پیس کر ایک دوہتھڑ شہزادی کی کمر پہ مارا اور غرا کر پوچھا۔

"کیوں گئی تھی وہاں؟"

نانی کی سوکھی ہڈی کلائی میں پڑا گلٹ کا کنگن شہزادی کے شانے کی ہڈی سے ٹکرایا اور بے ساختہ اس کی چیخ نکل گئی۔ اس کی چیخ سن کر میں اپنی جگہ کسمسا کر رہ گیا۔ لمحہ بھر کے لیے نانی بھی گھبرا گئی۔ اس نے کنگن کو کلائی میں اوپر کی طرف گھسیٹ کر کہنی کے قریب ہڈی میں پھنسا لیا۔ میں نے شہزادی کا جواب سننے کے لیے کان جھروکے کے ساتھ لگا دیئے۔ لیکن وہ شانے کی ہڈی سہلاتے ہوئے سسکیاں لیتی رہی۔

رانی نے دالان کے دروازے میں کھڑی ہو کر دہلیز سے ایک نظر ڈالی اور دبے پاؤں باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شہزادی بھی لپک کر باورچی خانے میں جا گھستی اور تھوڑی دیر بعد باورچی خانے میں سونے کی گھتیاں بٹنے لگتیں۔ باورچی خانے کی ایک کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ اور گلی سے گزرنے والوں کا نہ جانے کون سا انوکھا پن ان کے کنوارے جسموں کو گدگداتا تھا۔

شہزادی اور نانی نے شاید رانی کے قدموں کی آہٹ سنی ہی نہیں تھی۔ ورنہ رانی کی کر بہ پائی پہ نانی جل بھن کر رہ جاتی۔ اور وہ تو موقعہ ہی ایسا تھا کہ وہ خواہ مخواہ رانی پر برس پڑتی۔ نانی اس گھر کی مختار کل تھی۔ اس کا پہلوان داماد تک اس سے دبتا تھا۔ ذرا سی بات پر اس کی کرخت آواز اس طرح گونجتی جیسے اندھے کنوئیں میں منہ دے کر کوئی چیخ رہا ہو۔

پڑوسی کے گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کبھی کبھی شہزادی کی سسکی اس طرح سنائی دیتی جیسے وقت نے آہ بھری ہو۔ گو سایے ڈھل چکے تھے پھر بھی دھوپ کی تپش ابھی تک کم نہیں ہوئی تھی۔ نانی چولہے پہ دھری دیگچی کی طرح کھول رہی تھی۔ اس نے دھندلی آنکھیں نیم وا کر کے شہزادی کی طرف دیکھا اور جھنجھلا کر اس کی چوٹی مروڑتے ہوئے بولی۔

"بولتی کیوں نہیں مردار۔ کیوں گئی تھی وہاں؟"

چوٹی مروڑنے سے شہزادی کی گردن میں بل پڑ گیا۔ اس نے اپنی لمبی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سرخ آنکھیں اٹھا کر نانی کی طرف دیکھا۔ بھیگی ہوئی پلکوں کے لمبے اور گھنیرے سائے آنسوؤں سے تر دہکتے رخساروں پر پھیل گئے۔ اس کے تازہ خون کی طرح سرخ ہونٹ کپکپائے اور وہ دوپٹے کے آنچل میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نانی نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا اور تلملائی ہوئی اٹھ کر صحن میں دھوپ کے کنارے آ بیٹھی۔ اس نے دھوپ میں پڑا بجھا ہوا حقہ اپنی طرف گھسیٹا اور گڑگڑاتے ہوئے بولی۔

"دیکھوں تو کیسے نہیں بولتی۔ تیری اور اپنی جان ایک نہ کر دی!"

میں خوفزدہ سا ہو کر ذرا پیچھے کھسک گیا۔ دراصل شہزادی کی خاموشی کے ساتھ میرے دل کا تار بندھا ہوا تھا۔ اب آپ سے کیا چھپاؤں۔ شہزادی میرے ہی ہاں سے گئی تھی۔ اور میرے گھر سے نکلتے وقت اس کی نانی نے دیکھ لیا تھا۔ میرا خیال ہے آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے۔ کیونکہ عورت کے معاملے میں مرد ہمیشہ بدگمانی میں مبتلا رہا ہے۔ لیکن بات ذرا سی ہے۔ اس دوپہر وہ میرے ہاں آئی تھی۔ اس کی بے چین آنکھیں کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ غالباً جس شے کی اسے جستجو اور تلاش تھی اس کی حقیقت

سے وہ خود بھی ناآشنا تھی۔ جس وقت وہ آئی تنہا تھی۔ وہ تھی اور میں تھا۔ اس کی متلاشی آنکھوں کی شہ پا کر محض تجسس کے زیر تحت میں نے اس کے سراپا کا بھرپور جائزہ لیا تھا۔ اس وقت ایک خوشگوار سا خیال بھی میرے ذہن میں آیا تھا جس کا تعلق مستقبل قریب سے تھا۔ کیونکہ شہزادی لڑکپن اور جوانی کے دوراہے سے دو ہی قدم کے فاصلے پر تھی۔

وہ اس سے پہلے بھی کئی بار میرے ہاں آئی تھی۔ ایسے جیسے تھانیدار تلاشی لینے کسی کے گھر آگھسا ہو۔ حیرانی سے پہلے ہی نہ جانے اس کے ذہن میں کیسی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ پھر میں یہ سوچ کر مسکرا دیتا کہ بچی آنے والے دنوں کی لطافتوں کے تصور سے بلوغی ہو رہی ہے۔

لیکن ذرا سی بات کا افسانہ بنتے دیکھ کر میں بوکھلا گیا۔

میرے ذہن میں ایک نعل سا الٹا لٹکا ہوا تھا —— اب کیا ہوگا! ... محلے والے پہلے ہی میرے ساتھ کھنچے کھنچے رہتے تھے۔ صرف اس لیے کہ میرے پاس دو منزلہ مکان تھا۔

میری بھنوؤں میں جمع پسینے کی ایک دھار آنکھوں کی طرف بہہ نکلی اور لمحہ بھر کے لیے بڑی گھڑبڑ سا ہو گیا۔ میں نے رومال سے آنکھیں صاف کیں۔ دھندلاہٹ چھٹتے ہی میری نظر پہلوان پر پڑی جو کمر پہ ہاتھ رکھے، ڈیوڑھی کے اندر خاموش کھڑا گرد و پیش کو بغور تک رہا تھا۔ اس کی اچانک آمد سے میرے وجود میں بجلی کا کوندا سا لپک گیا۔ وہ نانی کے قریب آکر فرش پر بیٹھ گیا اور حقے کی نے اپنی طرف کھینچ کر پوچھنے لگا۔

”کیا ہوا اماں؟“

”ارے تو جا، جا کے بھلی نیچ۔ کھسن ماں کے موئے بال۔ تجھے کیا لگے اس گھر سے۔“

نانی نے اسے الٹے ہاتھ سے جھڑک دیا اور منہ پرے کر کے کپا ہو کر بیٹھ گئی۔ پہلوان نظریں نیچی کر کے پلی ہوئی مونچھیں سہلانے لگا۔ اس سے پہلے بھی میں نے اسے نانی کے سامنے نظریں جھکا کر چپ ہو جاتے دیکھا تھا۔ پہلے پہل اس کی سعادت مندی اور فرمانبرداری نے مجھے بہت متاثر کیا تھا۔ لیکن جب مجھے پتہ چلا کہ وہ گھر داماد ہے تو میں اس سے ڈرنے لگا۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ اس جیب کترے کا خیال آتا جس کی نظریں دوسروں کے مال پر لگی رہتی ہیں۔ اور اب موقعہ سے فائدہ اٹھا کر وہ مجھے بلیک میل کر سکتا تھا۔ میں تو کانپ اٹھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

”خدا کرے شہزادی گونگی ہو جائے۔“

میں حیران تھا کہ میرے اور شہزادی کے درمیان کوئی تعلق نہ ہوتے ہوئے بھی کتنا گہرا تعلق پیدا ہو گیا تھا۔

اتنے میں رانی اپنا جسم دوپٹے میں چھپائے پرات لیے باورچی خانے سے نکلی اور گھڑونچی کے قریب بیٹھ کر آٹا گوندھنے لگی۔ نانی نے خونخوار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے کڑک کر پوچھے گی —— آٹا گوندھتے تیرا سر کیوں ہل رہا ہے؟ —— لیکن وہ تھوڑی دیر تک خاموش بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اپنی بیٹی کو ثواب پہنچانے لگی۔

”حرامزادی آپ تو مر گئی اور چھنالوں کو چھوڑ گئی میری جان کا عذاب۔“

لگتا تھا اس کی بے نور سی آنکھوں کے سوکھے سوتوں سے میلا میلا پانی رسنے لگے گا۔ اور وہ سوکھی سڑی باہیں پھیلا کر بین کرنے

لگے گی۔ پہلوان نے اس کے بدلے ہوئے تیور دیکھے اور حقہ اٹھا کر اسے دیوار کے سائے میں رکھ کے چپکے سے باہر نکل گیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میری جان جو تنگ نالی میں پھنسی ہوئی تھی کسی حد تک آزاد ہو گئی۔

رانی اپنے دھیان آٹا گوندھ رہی تھی۔

شہزادی دو چھتی تلے گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے بیٹھے شاید سو گئی تھی۔ نانی نے پہلوان کے یوں کھسک جانے پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ بیٹھی خلا میں گھورتی رہی۔ دیر تک ماحول پر کربناک خاموشی چھائی رہی۔ معاً پرات فرش سے ٹکرانے سے شور اٹھا اور نانی اپنے خیالوں سے اس لڑکی کی طرح چونکی جس کو اپنے محبوب سے چوری چھپے ملاقات کے لیے جاتے کسی نے دیکھ لیا ہو۔ اس نے مڑ کر قہر آلود نگاہوں سے شہزادی کی طرف دیکھا تڑپ کر اٹھی اور ایک بھرپور لات اس کی کمر پہ مار کر چلائی۔

"بولتی کیوں نہیں کمبخت۔ کیوں گئی تھی وہاں؟"

اچانک وار سے شہزادی پہلو کے بل فرش پہ ڈھیر ہو گئی۔ لمبی زلفیں اس کے چہرے پر بکھر گئیں۔ اسے خاموش پا کر نانی مسلسل ٹھوکریں مارتے ہوئے پاگلوں کی طرح چیخنے لگی۔

"کیوں گئی تھی وہاں! کیوں گئی تھی وہاں!! کیوں گئی تھی وہاں!!!"

شہزادی فرش پہ لیٹے لیٹے تڑپی۔ اس نے ایک کہنی فرش پر ٹیک کر اپنے بدن کا بوجھ سنبھالا اور سر اونچا کر کے سرخ سرخ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے نانی کی طرف دیکھا۔ پھر وہ نچلا ہونٹ لٹکا کر یکبارگی دھاڑیں مار کر رو دی اور کہنے لگی۔

"رانی بھی تو جاتی ہے وہاں"

میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں زینے پھلانگتا ہوا نیچے آیا اور اسی وقت کسی دوسرے محلے میں مکان تلاش کرنے چل دیا۔

حوّا بیسویں صدی میں

ایک ریڈیائی تمثیل

اختر جمال

کردار

حوا ـــــ ایک خوبصورت اور جوان عورت۔ سانولا رنگ، بید دلکش خد و خال بہت زیادہ جذباتی ہو کر باتیں کرتی ہے۔

آدم ـــــ ایک حساس اور محنتی جوان آدمی جس کی آواز نرم اور پُروقار ہے اور لہجے میں ٹھہراؤ ہے۔

سانپ ـــــ ایک بوڑھے اور تجربہ کار آدمی کی آواز میں باتیں کرتا ہے اس کی آواز بھاری ہے لیکن اس میں کرختگی نہیں ہے وہ ٹھہر ٹھہر کر سمجھانے کے انداز میں باتیں کرتا ہے۔

سائنس دان ـــــ ایک پچاس سالہ آدمی جس کا لہجہ سنجیدہ ہے۔

(چند مرد، عورتیں اور بچے جن کی مختلف قسم کی آوازیں ہیں)

(ہلکی اور پُرسکون موسیقی جو آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے۔)

حوا - آدم ـــــ ہم پھر اس دنیا میں آ گئے ـــــ کہیں یہ خواب تو نہیں ہے۔ یہ زمین یہ آسمان یہ روشن سورج ـــــ اور یہ مٹی ـــــ یہ اب تک ویسی ہی نرم اور گداز ہے۔ اور دیکھو یہ سامنے کے پہاڑ ـــــ یہ سب چیزیں بالکل ویسی ہی ہیں ـــــ یہ دنیا ذرا بھی تو نہیں بدلی ـــ میں آج بہت خوش ہوں!

آدم - حوا مجھے وہ دن یاد آ رہا ہے جب ہم نے پہلے پہل اس زمین پر قدم رکھا تھا۔ تیز بارش اور آندھی نے ہمیں گھیر رکھا

تھا - چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا - اور ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر پہاڑ کے ایک غار میں پناہ لی تھی -

حوّا - کتنی سرد ہوا چل رہی تھی - میں کانپ رہی تھی - اور جب میں نے اپنا سر تمہاری گود میں رکھا تو میں سردی اور اندھیرے کو بالکل بھول گئی (جذباتی ہو کر) اور مجھے ایسا لگا ——— جیسے یہ دنیا میرے لئے نئی جگہ نہیں ہے میں یہاں ہمیشہ سے رہتی آئی ہوں اور رہتی رہوں گی ——— اور پھر چاند نکل آیا تھا - ہم نے خوش ہو کر چاند کو دیکھا تھا ہم نے آواز دی ——— اس کے سامنے رقص کیا ——— اور جب اس نے ہماری آواز نہیں سنی اور ہماری پرواہ نہ کی تو ہم چاند اور سورج کے گونگے پن کو سمجھ گئے - ان کی روشنی میں ہم نے اپنے لئے راہیں بنائیں - اور ———

آدم - اور آج ہم پھر یہاں آئے ہیں کھوئی ہوئی راہوں پر ——— واقعی یہ دنیا ذرا بھی نہیں بدلی ہر چیز اسی طرح ہے یہ سبزے کی ہریالی اور شاداب پہاڑوں کا پُرسکون سناٹا - شبنم کی روپہلی بوندیں - اور بیر بہٹی ویسی ہی پُرکشش ہے -

سانپ - (بوڑھے آدمی کی آواز میں) نہیں ——— یہ دنیا بہت بدل گئی ہے - !

حوّا - (چونک کر) کون ——— سانپ تم ہو ——— میرے پرانے ساتھی تم نے ہمیں پہچان لیا !

سانپ - میں تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں - میں بوڑھا ہو گیا ہوں - مگر تم دونوں اب تک جوان ہو ——— بالکل ویسے ہی ہو جیسے دنیا میں آئے تھے !

آدم - ہاں آج ہم اپنے اسی روپ میں دنیا کی سیر کو آئے ہیں -

سانپ - حوّا ! مجھے نہ اٹھاؤ ——— مجھے اپنے گلے میں ہار کی طرح نہ پہنو - میرے سر پر محبت سے ہاتھ نہ پھیرو - تم مجھ سے ڈرتی کیوں نہیں تمہاری اولاد تو مجھے اپنا دشمن سمجھتی ہے -

حوّا - تم میری اولاد کے دشمن کیسے ہو سکتے ہو - ؟ تم نے ہی مجھے تخلیق کا راز بتایا تھا اور وہ راز جان کر میں مامتا کے جذبہ سے سرشار ہو گئی تھی میں نے کتنے دکھ اور درد اٹھا کر اولاد پیدا کی تھی ——— اور اب ہزاروں سال گذرنے کے بعد میں اپنی اولاد کو دیکھنے آئی ہوں -

(آسمان پر ہوائی جہاز کا شور سنائی دیتا ہے - یہ شور ہلکا ہلکا ہو کر فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے)

حوّا - اُف یہ کیسی چیخ ہے ——— اتنا شور !

سانپ - (ہنس کر) حوّا یہ چیل نہیں ہے - یہ ہوائی جہاز ہے اس میں بیٹھ کر تمہارے بچے چیلوں سے بھی زیادہ تیزی کے ساتھ دنیا کے ہر کونے میں جا سکتے ہیں -

حوّا - "ہوائی جہاز" ——— کیا یہ لفظ تم نے ہی بنایا تھا جس طرح تم نے "تخلیق" "محبت" "عقل" "موت" اور "نفرت" جیسے الفاظ بنائے تھے !

سانپ - نہیں ——— یہ لفظ بھی تمہارے بچوں نے بنایا ہے - دراصل جب کوئی چیز جنم لیتی ہے تو وہ اپنا نام بھی ساتھ لاتی ہے -

حوّا — آدم مجھے یاد پڑتا ہے جب ہم پہلی بار دنیا میں آئے تو کوئی اس سے ملتی جلتی سواری تھی —— جو ہمیں دنیا میں لائی تھی!

آدم — اس کی شکل انڈے سے ملتی تھی۔ اور وہ انڈا زمین پر گرتے ہی اچانک پھوٹ گیا تھا اور ہم کود کر زمین پر کھڑے ہو گئے تھے۔

سانپ — ہاں شاید یزداں کی بنائی ہوئی وہ عجیب سواری انسان کے لاشعور میں تھی۔ اب چیلوں کی پرواز دیکھ کر وہ یاد لاشعور سے شعور میں اُبھری اور انسان نے یہ عجیب و غریب اڑن کھٹولے بنا لئے۔

حوّا — آؤ ذرا سامنے کی اس پہاڑی پر چڑھ کر وادی کا نظارہ کریں۔ اور دیکھیں ہمارے بچوں نے دنیا کو کیسا خوبصورت بنا دیا ہے۔ سانپ تم بھی چلو —— تمہاری اولاد تو اب تک صرف زہر پیدا کر سکی ہے!

سانپ — حوّا جب تمہاری اولاد نے میرے بچوں کو ستایا تو زہر خود بخود ان کے منہ میں پیدا ہو گیا —— اپنی حفاظت کے لئے! مگر آج میرے بچے تمہارے مقدس قدموں کو بوسہ دینے آئیں گے!

حوّا — آدم میرا ہاتھ پکڑ لو —— میرا پیر پھسل رہا ہے۔

آدم — یہ سرمئی چٹانیں کس قدر چکنی ہو گئی ہیں

حوّا — اوہ —— میں تھک گئی۔ آؤ ذرا اس چوٹی پر دم لینے کو بیٹھ جائیں۔

آدم — یہاں سے سب چیزیں کتنی خوبصورت دکھائی دے رہی ہیں۔

حوّا — یہ باغ —— یہ نہریں —— اور یہ کالی لکیریں سی کیا ہیں؟ سانپ تمہاری نسل اس قدر پھیل گئی ہے!

سانپ — (ہنس کر) یہ میری نسل نہیں —— یہ تو ریل کی پٹڑیوں کا جال بچھا ہوا ہے۔

(ریل کے گزرنے کی آواز دور سے انجن کی سیٹی سنائی دیتی ہے)

سانپ — دیکھو —— یہ پٹڑی پر ریل جا رہی ہے اس میں تمہارے بچے ایک جگہ سے دوسری جگہ سفر کرتے ہیں۔

حوّا — اچھا یہ ریل ہے —— سانپ! یہ تو بالکل تمہاری طرح چلتی ہے۔

سانپ — تم اگر شہر کے اندر جاؤ تو تمہیں طرح طرح کی سواریاں نظر آئیں گی ایک میل سے کم کا فاصلہ بھی یہ لوگ بغیر سواری کے طے نہیں کرتے۔ اس لئے یہ دن بہ دن کمزور ہوتے جا رہے ہیں آدم ان میں سے کسی بھی جوان آدمی کو اٹھا کر پھینک سکتا ہے۔

حوّا — آدم کے بازو اب تک خوبصورت اور مضبوط ہیں۔

سانپ — انسان کا جسم تو چھوٹا اور کمزور ہوتا جا رہا ہے لیکن اس کا دماغ بڑھ رہا ہے۔ ان کے بچے بھی آدم سے زیادہ سمجھدار ہیں۔

حوّا — آدم تم کیا سوچ رہے ہو —— دیکھو وہ سامنے وادی میں اس مکان کی گیلری پر ایک عورت کھڑی ہے —— کتنی خوبصورت ہے!

سانپ - اگر تم قریب سے دیکھو تو اس کی ساری خوبصورتی مصنوعی ہے - اس کی بھنویں پلکیں ——— ہونٹوں اور گالوں کی سرخی ——— بالوں کی لہریں ——— سب چیزیں بناوٹی ہیں - اس دنیا کی کوئی عورت حوا سے زیادہ خوبصورت نہیں ہے -

آدم - حوا خدا کی بنائی ہوئی پہلی عورت ہی نہیں اس کا شاہکار ہے !

حوا - مجھے کیوں بناتے ہو اس کا شاہکار تو تم ہو -

سانپ - آدم نقشِ اول ہے اور حوا نقشِ ثانی ———!

حوا - ارے وہ اس مکان کے نیچے تو دیکھو کتنا بڑا چوہا ہے ——— ارے اس نے اندر میں تو پھاوڑا ہے وہ کھود رہا ہے ———!

سانپ - حوا یہ چوہا نہیں ہے یہ بھی خدا کا ہے اسے مزدور کہتے ہیں -

آدم - اس کے جسم پر گوشت تو نظر ہی نہیں آتا یہ تو ہڈیوں کا ڈھانچہ ہے -

حوا - (دکھ سے) سانپ کیا ایسے ادنیٰ انسان ہیں ؟ آہ ——— میرے ان بچوں کو کیا بیماری ہے -

سانپ - حوا یہ ایک دکھ بھری کہانی ہے - تم نہ سن سکو گی ——— میں ان کے بازاروں میں گھومتا ہوں یہ شراب کے نشہ میں مدہوش ہو کر جو دھوکے اور فریب کی باتیں کہہ جاتے ہیں وہ سنتا ہوں اور میں ایسی گندی اور بدبودار جگہوں میں بھی گیا ہوں جہاں چھوٹی چھوٹی اندھیری کوٹھڑیوں میں لوگ رہتے ہیں ——— غلاظت ——— بیماریاں اور بھوک ——— یہ سب چیزیں میں نے دیکھی ہیں - !

حوا - تو پھر اس دنیا میں انسان ہے مگر انسانیت نہیں رہی !

سانپ - تم ٹھیک کہتی ہو ——— یہاں انسان ہے مگر انسانیت نہیں ہے - پہلے نوعِ انسان مذاہب میں تقسیم ہوئی - پھر فرقوں میں اور اب قوموں اور طبقوں کی تقسیم ہے !

حوا - میں تمہاری باتیں نہیں سمجھ سکی ———

سانپ - تم انہیں سمجھنے کی کوشش مت کرو - ہمیں مستقبل سے مایوس نہ ہونا چاہیئے شاید یہ دنیا ایک دن ویسی ہی خوبصورت بن جائے جیسی تمہیں بہت دور سے دکھائی دی تھی - !

حوا - آدم ——— اف تمہاری یہ پیدائشی سوچ ——— کیا یہ کبھی نہیں جائیگی ! آؤ ذرا اس پہاڑی کے دوسری جانب دیکھیں ———!

آدم - آؤ ——— دیکھو ! آسمان سے باتیں کرتے ہوئے مکان !

حوا - ان میں لوگ ہنستے اور کودتے جا رہے ہیں - میں انہیں بہت اچھی طرح دیکھ سکتی ہوں ——— سانپ ان کے ہاتھوں میں کیا ہے ؟

سانپ - حوا یہ طالب علم ہیں اور ان کے ہاتھوں میں کتابیں ہیں ؟

حوا — کتاب کیا ہوتی ہے۔

سانپ — تم اور آدم اگر اپنے پرانے تجربات لکھ دو تو اس طرح کتاب بن جائیگی۔ مثلاً آدم نے کس طرح دھرتی کی چھاتی میں گیہوں اور دھان بوئے تھے ——— تم نے کس طرح ناریل کے ریشے کی رسّی بنائی تھی اور جیبڑے کے بالوں سے آدم کے لئے کپڑے بنے تھے ——— یہ سب علم ہے۔ یہ علم ترقی کر کے اب بہت آگے بڑھ چکا ہے اور اب ان کتابوں میں وہ سب ہے جو تمھیں اس دنیا میں نظر آتا ہے۔

آدم — سانپ ہم جنت سے بالکل خالی ہاتھ نہیں آئے تھے۔ ہم وہ دولت لائے تھے جسے نہ کوئی چھین سکتا تھا نہ چرا سکتا تھا۔ وہ جس کی وجہ سے فرشتے ہمارے رقیب بن گئے تھے۔ وہ چیز علم ہے!

سانپ — ہاں آدم ——— اور یہ علم خالق کی ذات کی طرح وسیع اور بیکراں ہے۔ لامحدود ہے۔

حوا — شام ہو چکی ہے ——— ارے ——— یکایک یہ کیا ہوا۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ چاند اور سورج کا شہر بیٹھے ہیں۔

سانپ — (ہنس کر) یہ بجلی کی روشنی ہے۔ شام ہوتے ہی تمام سڑکیں ——— مکان اور باغ ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے نور کی بارش ہو رہی ہے۔!

حوا — مجھے تو ایسا لگا جیسے اچانک بہت سے ننھے ننھے چاند تارے نکل آئے۔

سانپ — تم یہ جان کر خوش ہو گی کہ اب انھوں نے چاند بھی بنا لیا ہے ——— اور وہ دوسرے ستاروں کے ساتھ گردش کر رہا ہے۔

آدم — (خوش ہو کر) سچ ——— تو کیا آدم اب آسمان میں سیڑھیاں بنا کر اپنی کھوئی ہوئی جنت پھر حاصل کرے گا۔

سانپ — انسان نے چاند پر اپنا جھنڈا گاڑ دیا ہے ——— اور اب وہ دوسرے سیاروں کو تسخیر کرنا چاہتا ہے۔

حوا — یہ کتنی خوشی کی بات ہے ہماری پہلی منزل زمین تھی اور اب دوسرے سیارے انسان کے قدموں کا انتظار کر رہے ہیں ——— !

سانپ — ہاں ——— اور جب پہلا انسان اور پہلی عورت نئے سیاروں میں داخل ہوں گے اور ارتقا کی کہانی دہرائی جائیگی تو جانتی ہو وہ کیا کہیں گے؟

حوا — وہ کہیں گے ہم آدم اور حوا کی اولاد ہیں کتاب اور قلم ہمارے پاس خدا کی امانت ہے جسے ہم دوسرے سیاروں میں لے کر آئے ہیں۔

سانپ — (ہنس کر) نہیں وہ تو اس پہلے آدمی اور پہلی عورت کے وجود سے بھی انکار کر دیں گے جس نے ان کے سیارے کو آباد کیا تھا۔ وہ کہیں گے بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ آدمی اور ایک عورت آسمان سے زمین پر ٹپک پڑے تھے! ان کے عقلمند آدمی اس سوچ میں عمریں صرف کر دیں گے کہ انسان کیسے پیدا ہوا؟ اور اس سوچ کا حاصل یہ ہوگا کہ گرمی ہوا اور پانی سے زندگی ننھے ننھے کیڑوں کی صورت میں جنم لیا تھا۔ اور انسان ان کیڑوں کا انتہائی ارتقا ہے۔

حوّا - (ہنستی ہے) اچھا تو ہمارے متعلق ان کا یہ خیال ہے۔

سانپ - ہاں تم دونوں کا وجود محض یزداں کی شاعری ہے۔

آدم - بہت خوب ——— لیکن یہ یزداں کو تو مانتے ہیں۔؟

سانپ - ان میں سے بہت سے لوگ یزداں کے بھی قائل نہیں ہیں وہ ہر اس چیز کو مانتے ہیں جو حواس خمسہ کی مدد سے محسوس کی جا سکتی ہے۔

حوّا - تو کیا یہ لوگ محبت اور نفرت نہیں کرتے۔ یہاں سچ اور جھوٹ نہیں ہے۔ نیکی اور بھلائی اور وفا ——— دشمنی کینہ اور بے وفائی ——— یہ سب چیزیں اب ختم ہو گئی ہیں جن کی وجہ سے میری اولاد نے ایک دوسرے کا خون کیا تھا۔!

سانپ - سچ اور جھوٹ ازل سے ہیں اور ابد تک رہیں گے۔ ان دونوں کی کشمکش کا نتیجہ ارتقا ہے۔ ———!

حوّا - تو جب یہ لوگ حواس خمسہ کی مدد کے بغیر محبت اور نفرت سچ اور جھوٹ کو محسوس کر سکتے ہیں تو یزداں اور اہرمن کے وجود سے کیوں انکار کرتے ہیں جو ہر دو طاقتوں کے ترجمان ہیں۔

آدم - ہر حقیقت کسی نہ کسی تضاد سے جنم لیتی ہے، اور تضاد خود بخود پیدا ہوتا ہے۔ تضاد کے بغیر حقیقت اپنی پرکھ کیونکر کر سکتی ہے۔

سانپ - آدم تم تو پیدائشی فلسفی ہو ———! ایک دلچسپ خبر اور سنو۔ انسان سے پہلے کی ارتقائی منزل بندر اور گوریلا ہیں ——— جو ارتقا کی دوسری منزل میں انسان بن گئے!

حوّا - (ہنس کر) بہت مزے کی بات سنائی۔ بندر اور بندریاں تو میرے گڈے اور گڑیاں ہیں جن سے میں آدم کی غیر موجودگی میں جی بہلایا کرتی تھی۔ بہر حال ——— مجھے یہ دنیا بڑی اچھی لگ رہی ہے۔ کاش میں ایک بار پھر دنیا میں پیدا ہو سکتی ——— ان روشنیوں میں رہ سکتی ——— ان لڑکیوں کی طرح کتابیں ہاتھ میں لے کر پڑھنے جاتی اور ان رقص گاہوں میں گا اور ناچ سکتی۔! میری اولاد نے کتنی ترقی کی ہے۔ مجھے ان خوبصورت اور سمجھدار بچوں پر ناز ہے میں تم سے کہا کرتی تھی کہ مجھے کھودنے اور مارنے کا کام پسند نہیں ہے۔ لیکن تم ہمیشہ کھودتے رہے اور تمہارا بیٹا خون کرتا رہا ——— میں چاہتی تھی میرے بچے کوئی اور کام کریں بہت بڑے بڑے کام اور اب دیکھو!

آدم - ہاں حوّا میں بہت خوش ہوں یہ دنیا تمہارے حسین خوابوں کی تعبیر ہے۔ میری ساری عمر زمین کھودتے ہی گذر گئی۔

حوّا - اور میری چرخہ کاتتے میں ——— !

سانپ - لیکن آدم اگر تم نے کھودا نہ ہوتا ——— اور حوّا نے کاتا نہ ہوتا تو یہ سب چیزیں بھی نہ ہوتیں تمہارے ان کاموں کا ارتقا یہ ہے!

آدم - تم ٹھیک کہتے ہو!

حوّا - مجھے وہ خوبصورت شام آج بھی یاد ہے جب آدم نے پہلی بار زمین کو کھودا تھا۔ اس کے خوبصورت پیر نرم نرم چمکدار

مٹی میں بھرے ہوئے تھے۔ دھوپ میں اس کے بازو چمک رہے تھے اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ یا گرمی حرارت ——— زندگی! اس خوبصورتی میں کھو کر میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور میں نے سوچا تھا کہ مجھے جنت چھوڑنے کا کبھی دکھ نہ ہوگا۔ میں اس آدمی کے ساتھ ہر جنم میں سکھی رہوں گی۔

آدم - اور جب میں تھک کر حوا کے پاس گیا اور میں نے اس کے ہونٹوں کو چھوا تو مجھے محسوس ہوا کہ میری ساری تھکن اتر گئی ہے۔ حوا نے تازہ پھل اور دودھ سامنے رکھا۔ میرے بیٹھنے کے لئے جگہ صاف کی، اس لمحہ مجھے اتنی آسودگی اور راحت کا احساس ہوا۔ حوا مجھے بہت پیاری معلوم ہوئی۔ اور میں نے سوچا کہ میں ہمیشہ محنت کرونگا اور اسے خوش رکھونگا۔ اس کے لئے جنت کا سا خوبصورت گھر بناؤں گا۔ اور چلنے کے لئے صاف اور آرام دہ راستہ! تاکہ اسے اپنی غلطی پر کبھی پشیمانی نہ ہو ——— ہر وہ جگہ جہاں حوا ہے وہ جنت ہے!

حوا - جنت خوشی ہوتی ہے اور آج ——— آج میں بہت خوش ہوں! سچ آدم میری خوشی اور غرور کی انتہا نہیں رہی ہے۔ سانپ دیکھو ———! یہ خوبصورت روشنیاں ——— یہ ہرے بھرے باغ ——— یہ عالیشان عمارتیں ——— اور یہ آئینہ کی طرح چمکتی ہوئی سڑکیں ——— یہ سب چیزیں آدم نے میرے لئے بنائی ہیں۔ آدم نے ہر جنم میں مجھے پیار کیا ہے۔ اور میرے لئے دکھ اٹھائے ہیں۔ کبھی مجنوں بن کر صحرا کی خاک چھانی ——— کبھی فرہاد بن کر دودھ کی نہر نکالی۔ اور جب مجھے اس طرح حاصل نہ کر سکا تو اس کے جنوں نے خرد کا جامہ پہن لیا۔ وہ فلسفی بنا ——— طبیب بنا ——— موجد بنا ——— پہلے جنم میں یزداں نے اس کی سعادتمندی کے انعام میں مجھے اس کے حوالے کیا تھا، مگر پھر ہر جنم میں اس نے مجھے اپنی محنت سے حاصل کیا ہے!

آدم - رنگ، خوشبو، تناسب اور حسن یہ سب چیزیں تمہاری ذات سے ہیں اس خوبصورتی کی خالق تم خود ہو!

حوا - اور اسی لئے آج میں غرور سے سر اٹھائے کھڑی ہوں جنت کی کسی حور کے لئے یہ سب نہیں کیا گیا ——— وہ تو محض ایک انعام ہے!

سانپ - حوا تم بہت خوش ہو۔ لیکن ایک تلخ حقیقت تمہیں سننا ہوگی۔

حوا - کہو!

سانپ - یہ سچ ہے کہ آدم تمہارے لئے مجنوں بنا ——— فرہاد بنا ——— ارتقا کی سیڑھیاں طے کرنے کے لئے دیوانہ وار دوڑتا رہا۔ لیکن اس کی تمام جد و جہد کوشش اور محنت آج تمہارے لئے نہیں ہے!

حوا - چونک کر کیا کہا ——— میں اس تمام جد و جہد میں اس کی شریک رہی ہوں مجھ سے زیادہ اس کی محبت کا حقدار کون ہو سکتا ہے؟

سانپ - تمہارا دیوانہ اب زلف و کاکل کا اسیر نہیں رہا موسم گل میں گریباں چاک کرنا اب اس کا شیوہ نہیں ہے۔

حوا - اور میں خوش ہوں کہ اسے ہوش آگیا ہے وہ ستاروں پر کمندیں پھینک رہا ہے اور میرے لئے نئے جہان تلاش کر رہا ہے۔

سانپ - نہیں حوّا یہ بات نہیں ہے —— اب اسے کسی اور سے محبّت ہوگئی ہے -

حوّا - خدا کے لئے مجھے پریشان مت کرو یزداں نے کوئی تیسری جنس نہیں بنائی تھی۔ آخر وہ کون ہے —— اس کا نام لو —— میں اس کا منہ نوچ لوں گی —— میں اسے گنجا کردوں گی —— میں اسے مار ڈالوں گی۔ !

سانپ - وہ تیسری جنس آدم نے خود ہی بنائی ہے اور اس کا نام ہے روپیہ - کل سونا اور چاندی تمھارا زیور تھے آج وہ انسان کا سرمایہ ہیں - اسے روپیہ کی کھنک پائل کی جھنکار سے زیادہ پسند ہے۔ تمھارے رخسار ولب سے زیادہ اسے سنہری اور روپہلی سکوں کی چاہت ہے وہ روپیہ کا دیوانہ ہے -

آدم - سانپ ! ہوسکتا ہے یہ روپیہ بھی وہ حوّا اور اس کے بچوں کے لئے چاہتا ہو۔ شاید آج دنیا کی سب سے بڑی قدر روپیہ ہے اور حوّا کو جیتنے کی پہلی شرط —— !

حوّا - نہیں —— نہیں۔ —— ! مجھے روپیہ سے نہیں جیتا جا سکتا - مجھے صرف محبّت سے جیتا جا سکتا ہے -

(دور سے شور کی آواز بلند ہوتی ہے انسانی آوازوں کا
ملا جلا شور سنائی دیتا ہے —— اور پھر ڈوب جاتا ہے)

آدم - یہ کیا —— یہ کیا —— ! دور کہیں ساحل پر شور سنائی دے رہا ہے —— یہ آگ —— اور دھواں —— چلو اسی طرف چلیں شاید ہم کچھ مدد کرسکیں -

حوّا - ہاں دور اس جزیرے میں آگ ہی آگ نظر آرہی ہے —— اور دھواں ہی دھواں —— چلو آدم جلدی کرو —— ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیئے -

سانپ - وہاں نہ جانا ورنہ تمھیں نقصان اٹھانا پڑیگا -

حوّا - کیوں —— نقصان کیوں اٹھانا پڑیگا ؟

سانپ - وہاں بموں کے تجربے ہو رہے ہیں -

حوّا - یہ بم کیا چیز ہوتی ہے - ؟

سانپ - یہ دنیا کو تباہ و برباد کرنے والا سب سے خوفناک ہتھیار ہے -

حوّا - مگر کس لئے —— ؟

سانپ - ہابیل اور قابیل کی لڑائی کے لئے - ان بموں سے شہر کے شہر نیست و نابود ہوجاتے ہیں -

حوّا - ہاں مجھے یاد آیا —— ہیروشیما اور ناگاساکی کی پریشان اور تباہ حال روحیں میرے پاس آکر روئی تھیں - اُف - یہ سب کیا ہے ! میں کتنی خوش تھی اور اب کس قدر اداس ہوں —— یہ بم کون بناتا ہے ؟

سانپ - جنھوں نے یہ روشنیاں —— یہ جہاز —— یہ ریلیں یہ ساری عجیب وغریب چیزیں بنائی ہیں ! ان ایجادوں کو جن پر انسانیت کو ناز تھا اب یہ خود ختم کرنا چاہتے ہیں -

حوّا - مگر یہ ایسا کیوں کررہے ہیں -

آدم - تم یہ سب نہ سمجھ سکو گی تمہارے بیٹے نے جب اپنے دوسرے بھائی کو مار ڈالا تھا تب بھی تم کچھ نہ سمجھ سکی تھیں۔ ہم اسے صرف دیوانگی کہہ سکتے ہیں۔

سانپ - ہاں آدم ——— تم سچ کہتے ہو۔

آدم - اس سے تو میرا کھودنے کا کام بہت اچھا تھا ——— میں نے زندگی بھر دھرتی میں بیج بوئے ——— فصلیں لگائیں ——— اور اب اس دھرتی کی چھاتی میں لوگ انگارے ہی انگارے بھرنا چاہتے ہیں۔ یہ کیسا ارتقا ہے!

حوا - آدم ——— میں نے انھیں اپنی کوکھ سے جنم دیا ہے ——— میں جانتی ہوں ان کے دل محبت کے لئے ہیں نفرت کے لئے نہیں ——— ! آدم میں یہ سب نہیں ہونے دوں گی ——— آہ میں کتنی دکھی ہوں ——— یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ یہ دنیا جہاں جنت سے بھی زیادہ زندگی کا سرور ہے یہ ختم ہو جائے گی ——— یہ روشنیوں کے شہر اندھیرے میں ڈوب جائیں گے ——— نہیں نہیں ——— یہ نہیں ہو سکتا۔ آدم ہم کیا کریں۔!

آدم - ہم صرف دعا کر سکتے ہیں۔

حوا - (چلا کر) نہیں آدم میں اس طرح دور سے تماشا نہیں دیکھ سکتی۔ کیا تمھیں معلوم نہیں میں نے کتنے دکھ اٹھا کر انھیں پیدا کیا تھا۔ میں نے کتنے خوبصورت خواب دیکھے تھے۔ ! حوا اور آدم کے پیار کی تخلیق ——— ! یہ انسان ——— اتنے دماغ۔ ! یہ ارتقا پذیر دنیا ——— یہ روشنیوں کے جگمگاتے ہوئے شہر ——— یہ سب مٹ جائیں ——— فنا ہو جائیں ——— نہیں ——— نہیں (بھرائی ہوئی آواز سے) میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔

آدم - ان آنسوؤں سے کیا ہوگا تم کیا کر لوگی؟

حوا - میں اس بم بنانے والے کے پاس جاؤں گی اسے سمجھاؤں گی۔ سانپ کل تم ہم کو وادی میں لیکر چلنا ——— میں ان لوگوں کو قریب سے دیکھوں گی ان سے باتیں کروں گی۔ اور میں بم بنانے والے کے پاس جاؤں گی!

سانپ - اسے تو بس رات کے ان چند گھنٹوں میں فرصت ملتی ہے جب وہ بستر پہ لیٹتا ہے۔ ہم سویرے ہی وادی میں جائیں گے تم سارے دن سیر کرنا اور رات کو بم بنانے والے کے پاس چلی جانا ——— لیکن دنیا کو قریب سے دیکھ کر شاید تمھیں اور زیادہ مایوسی ہوگی۔!

(وقفہ ——— انسانی آوازوں کا ملا جلا شور سنائی دیتا ہے پھر آوازیں صاف آنے لگتی ہیں۔)

بچے - سانپ والے ——— ! او سانپ والے ادھر آؤ۔!

ایک مرد - انھوں نے تو سانپوں کو ہاروں کی طرح پہن رکھا ہے عجیب و غریب سپیرے ہیں۔

دوسرا مرد - ان کا لباس تو دیکھو ——— یہ بھیڑ کی کھال ——— ایسا لگتا ہے جیسے وحشت کے زمانے کی کوئی مخلوق ہے اس عورت نے تو آدھا جسم سر کے بالوں سے ہی چھپا رکھا ہے۔

تیسرا مرد - ایسا لگتا ہے آسمان سے کوئی حور اتر آئی ہے اور مرد کی سیاہ گھنی داڑھی۔ شکل و صورت اور شاندار جسم ———

خدا کی قسم یہ انسان نہیں لگتے یہ فرشتے اور انسان کے مابین کوئی مخلوق ہے آؤ قریب چل کر دیکھیں۔

پہلا مرد۔ انھیں تو بچوں نے گھیر رکھا ہے۔

(الغوزہ بجانے کی آواز جو چند سیکنڈ بعد فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

دوسرا مرد۔ خدا کی قسم ایسا عجیب و غریب تماشا آج تک نہ دیکھا تھا۔ سپیرے تم کہاں سے آئے ہو۔ تمھارے سانپ تو بہت اچھے ہیں۔ یہ موٹا ناگ، ایسا لگتا ہے افریقہ کے کسی جنگل کا ہے۔

تیسرا مرد۔ یہ شیش ناگ ہے۔ بابا تم کہاں کے رہنے والے ہو۔؟

آدم۔ اس پہاڑ پر سے آیا ہوں۔ ارے یہ تم کیا پھینک رہے ہو میرے سانپوں کے نہ لگ جائے (ہنسی کی آوازیں)

ایک آدمی۔ ارے تم اتنا بھی نہیں جانتے یہ پیسے ہیں۔ پیسے!

حوا۔ کیا کہا پیسے ——!

دوسرا آدمی۔ ہاں پیسے —— اکنیاں، دونیاں —— روپے ——!

حوا۔ روپے!! میں انھیں ہاتھ بھی نہ لگاؤں گی۔ (گھبرا کر آدم سے) تم بھی انھیں ہاتھ نہ لگانا ——

تیسرا آدمی۔ عجیب لوگ ہو تم ——!

آدم۔ دراصل —— بھائی بات یہ ہے کہ میں جس جگہ رہتا ہوں وہاں یہ پیسہ نہیں ہوتا ——!

دوسرا آدمی۔ جاہل اور اجڈ لوگ ہیں۔ غالباً ان کے ہاں بارٹر سسٹم ہو گا۔

تیسرا آدمی۔ وہ آدمی کس تیزی سے ان کی تصویریں اتار رہا ہے غالباً کسی اخبار کا نامہ نگار ہے۔

پہلا آدمی۔ اس کے سامنے پیسوں کا ڈھیر ہے اور یہ اتنا بھی نہیں جانتا کہ پیسہ کیا ہے۔؟

چوتھا مرد۔ بابا اگر تم مجھے کمیشن دو تو میں تمھارا کھیل نمائش میں بھی کرا دونگا۔ تم مالدار ہو جاؤ گے اتنی شاندار پبلسٹی کر دوں —— تمھارا حساب کتاب رکھونگا کوئی تمھیں سیدھا سادا دیکھ کر لوٹ نہ لے —— تم مجھے کمیشن دینا بس ففٹی ففٹی۔

ایک مرد۔ ارے میاں تم بھولے بھالے آدمی ہو اس کے پھندے میں نہ آنا یہ پکا چار سو بیس ہے تمھیں لوٹ کر رفو چکر ہو جائیگا۔

چوتھا مرد۔ تم بیچ میں ٹانگ اڑانے والے کون ہو؟

دوسرا مرد۔ ایک سیدھے سادے پہاڑی کو بیوقوف بناتے تمھیں شرم نہیں آتی۔

چوتھا مرد۔ تمھیں پرائے معاملہ میں ٹانگ اڑاتے شرم نہیں آتی۔ بچہ جی یاد رکھنا ایسا سیدھا کروں گا کہ سو پشتیں یاد کریں گی

دوسرا مرد۔ کیا کہا —— سیدھا کریگا —— تیری یہ مجال —— ذرا آ تو —— میں بھی دیکھوں کس ماں کا دودھ پیا ہے

حوا۔ ارے بھائی مت لڑو —— سنو تو ——!

تیسرا مرد۔ تم دونوں اپنا راستہ لو ان کا تو کام یہی ہے کھانا اور ستانا یہ سامنے والی سڑک جو ہے اس پر جاؤ وہاں بڑے بڑے آدمیوں کے گھر ہیں —— وہاں سے تمھیں بہت پیسے ملیں گے۔ لو یہ رومال اس میں پیسے باندھ لو —— پیسے

حفاظت سے رکھنا۔ تم سیدھے سادے لوگ ہو کسی نے لوٹ لیا تو بھوکے مر گئے ۔

حوّا ۔ کیسا خوبصورت اور نرم کپڑا ہے ——— جیسے جنت کے کپڑے ——— تمھاری بڑی مہربانی ——— لو آدم یہ رومال ——— !

آدم ۔ اچھا بھائی اب ہم اس سڑک پر ہی جائیں گے ۔

حوّا ۔ ارے آدم تم یہ سارا روپیہ اٹھا رہے ہو سانپ سچ کہتا تھا تم پر بھی اس کا جادو چل گیا۔

آدم ۔ پگلی ——— میں اس کی طاقت دیکھنا چاہتا ہوں۔ آخر دنیا اس کی دیوانی کیوں ہے ؟ اچھا چلو۔ (مغنو نے کی آواز)

عورت ۔ لو ——— بچو ! انھیں یہ روپیہ دے دو۔ بیچارے پہاڑی لوگ ہیں ——— ارے آیا اس عورت کو اندر بلانا ——— کتنی خوبصورت ہے !

حوّا ۔ تم بڑی اچھی ہو۔ اور تمھارا گھر کتنا خوبصورت ہے ایسا گھر تو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

عورت ۔ ان کھالوں میں تمھارا جسم نظر آتا ہے اس شہر کے لوگ بڑے خراب ہیں اندر آؤ میں تمھیں کپڑے دونگی۔ زمین پہ نہیں قالین پہ بیٹھو۔ !

حوّا ۔ تم بہت اچھی ہو ——— تمھارے گلے میں کیا ہے بڑی خوبصورت چیز ہے ۔ ؟

عورت ۔ یہ سچے موتیوں کا ہار ہے ——— !

حوّا ۔ ذرا دکھانا ——— !

عورت ۔ (ہنس کر) لو ——— دیکھ لو ———

آیا ۔ (سرگوشی میں) یہ تو بڑی چلتی پرزہ معلوم ہوتی ہے کس طرح ہار کو دیکھ رہی ہے ۔

عورت ۔ آیا تم جا کر ان لوگوں کے لئے کھانا لاؤ۔ دونوں بھوکے معلوم ہوتے ہیں۔ آج سویرے سویرے منی کی طبیعت خراب تھی میں نے سوچا بھی تھا کہ دو آدمیوں کو اللہ نام پر کھانا کھلاؤں گی۔ !

حوّا ۔ اور یہ تمھارے ہاتھوں میں کیا ہے ——— ؟

عورت ۔ یہ بھی دیکھو ——— میرا ہاتھ پکڑ کر دیکھو ——— !

حوّا ۔ ایسا لگتا ہے انھیں سورج کی کرنوں سے بنایا ہے ۔

عورت ۔ (ہنستی ہے) تم تو شاعرہ ہو ! اچھا یہ ساری لو ——— ادھر آؤ میں تمھیں باندھنا سکھاؤں ——— ہاں ——— ایسے ۔ اب ٹھیک ہے ۔ تم تو بہت خوبصورت لگ رہی ہو ——— ؟ کیا تمھارے ہاں کی سب عورتیں ایسی ہی خوبصورت ہوتی ہیں ۔ تمھارا نام کیا ہے ؟

حوّا ۔ میں تمھیں اچھی لگتی ہوں ——— یہ کتنی خوشی کی بات ہے ——— ہاں ——— میرا نام حوّا ہے !

عورت ۔ سچ تو کہا تمھارے ہاں نام بھی حوّا اور آدم کے زمانے کے چلے آتے ہیں ۔ تمھارے میاں کا نام آدم ہوگا ——— (ہنستی ہے)

حوّا ۔ ہاں اس کا نام آدم ہے ۔

عورت ۔ خوب ہے !

حوّا ۔ وہ سامنے کون آ رہا ہے ؟

عورت ۔ وہ میرے میاں ہیں ۔

حوّا ۔ بڑا خوبصورت ہے بھولا بھالا سا ——— ہنستی ہے ۔

عورت ۔ (اچانک خفا ہو کر) تمھیں ان کی خوبصورتی سے مطلب ؟

حوّا ۔ میں تمھاری بات نہیں سمجھی ۔

عورت ۔ (جھڑک کر) چپ رہو !

میاں ۔ بیگم یہ عورت کون ہے ۔ ؟

عورت ۔ حوّا (ہنس کر) اور آدم باہر کھڑے ہیں ۔

میاں ۔ ہاں اسے بھی دیکھ کر آ رہا ہوں بڑے دلچسپ نام ہیں ۔ مگر میرا خیال ہے حوّا بھی اتنی حسین نہ ہو گی !

حوّا ۔ (ہنستی ہے)

بیگم ۔ ارے تو اس طرح ہنس ہنس کر کیا دیکھ رہی ہے ۔ جا ادھر کونے میں بیٹھ ۔ ارے آیا ! انھیں لے جا کر کھلا دے ۔ !

حوّا ۔ (مرد سے) تم نے سر پر کیا لگا رکھا ہے ۔ بڑا اچھا لگ رہا ہے ؟

میاں ۔ (ہنس کر) ٹوپی ہے ۔

حوّا ۔ اور تمھارے پیروں میں یہ چمکتے ہوئے ناگ جیسے ——— یہ کیا چیز ہے ؟

میاں ۔ ارے اس نے تو جوتے بھی نہیں دیکھے ۔ ؟ (ہنس کر) یہ جوتے ہیں !

بیگم ۔ گنوار کہاں ناگن ہے ناگن ——— اسے ہر جگہ ناگ ہی ناگ نظر آتے ہیں ۔

حوّا ۔ تم کیا کام کرتے ہو ——— ؟ کیا تم بم بناتے ہو ؟

میاں ۔ (قہقہہ لگا کر) خبطی ہے کہیں سے بم کا نام سن لیا ہے ۔ !

بیگم ۔ ارے تم سے کہا کونے میں بیٹھ جاؤ ——— توبہ ہے ان لوگوں کو منہ لگانا بھی غضب ہے ۔ ننگی بھوکی بچی تھی ۔ اب سر پر چڑھی جاتی ہے ! ارے آیا ——— ! (چلّا کر) آیا ——— سنتی نہیں اسے لے جا ۔ !

میاں ۔ اس قدر غصّہ کیوں ہو رہی ہو جنگلی ہے ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہی ہے ۔

بیگم ۔ بس رہنے دو اس کے سامنے خوبصورتی کی تعریف کر دی وہ کھل اٹھی ۔ دماغ آسمان پر پہنچ گئے باتیں بنانے (نقل اتار کر) کیا کام کرتے ہو ؟ جادوگرنی اسی طرح یہ عورتیں مردوں کو پھانستی ہیں ۔ اس کے بھولے پن پر جا رہے ہیں !

میاں - (چلا کر) میں اسے جا کر نہیں لایا ہوں نصیبن نے بٹھا رکھا تھا۔ ذرا سی بات منہ سے نکل گئی تھی پیچھے پڑ گئی ہیں مصیبت میں جان ہے!

حوا - تم آپس میں لڑتے کیوں ہو ——— ! تم نے مجھے کپڑے دیئے۔ اچھی اچھی باتیں کیں اور اب ایک دم ایسا لگتا ہے جیسے تم خفا ہو گئی ہو ——— ! تم کپڑے واپس لینا چاہو تو لے لو ——— ہم کھانا بھی نہیں کھائیں گے آدم مجھے آواز دے رہا ہے۔

بیگم - نہیں کھانا تو نہ کھاؤ ——— جاؤ دفع ہو جاؤ ——— راستے جاتے ہوئے بھی کس طرح دیکھ رہے ہیں ہر چھ بچوں کے باپ ہو گئے مگر رنگین مزاجی نہ گئی۔

میاں - تمہاری تو خواہ مخواہ الجھنے کی عادت ہے!

بیگم - (اچانک) ارے ——— ! میرا ہار ——— میرا ہار! چور ڈائن ——— ارے آیا دیکھو تو چوکیدار سے کہنا اسے روک لے ———!

آیا - (چلا کر) چوکیدار ——— ! اس عورت کو روکنا ——— بیگم صاحب کا ہار چرا لیا۔

چوکیدار - ٹھہر جاؤ ——— اے عورت کہاں جاتی ہے ——— ادھر آ میں تیری تلاشی لوں گا ——— اور اس آدمی کی بھی ———!

حوا - ہٹ جاؤ ——— مجھے کیوں پکڑتے ہو میرے پاس کچھ نہیں۔ بس یہ لمبا سا کپڑا ہے یہ لینا چاہو تو لے لو اسی نے پہنایا تھا ——— اس سے میری بھیڑ کی کھال ہی اچھی ہے۔

آدم - الگ ہٹو اسے دھکا کیوں دیتے ہو ——— ہمیں جانے دو۔ کیسا ہار ہے ہم نے نہیں دیکھا!

حوا - میرے پاس نہیں ہے میرے کپڑے مت کھینچو ——— لو میں خود اتارتی ہوں۔

بیگم - (چلا کر) ارے آیا ——— انہیں جانے دے ——— ہار میز پر رکھا ہے۔ (آہستہ سے) میں ——— بھول گئی تھی!

(الغوزے کی آواز)

حوا - آدم، سانپوں کو اس درخت کے نیچے چھوڑ دو ——— دیکھو کھانے کی خوشبو آ رہی ہے۔ دیکھو اس جگہ سے ——— وہ لوگ کھانا کھا کر آ رہے ہیں۔ مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔؟

آدم - میں یہاں بیٹھتا ہوں تم اندر جاؤ تم نے ان جیسے کپڑے پہنے ہیں ——— اگر کھانا دیں تو مجھے بلا لینا!

حوا - اچھا میں جاتی ہوں ———

(ہلکی موسیقی فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

حوا - کیا تم مجھے کھانا کھلاؤ گے؟

آدمی - ارے یہ بڑی دلچسپ عورت ہے اور کتنی خوبصورت ہے۔ کیا کھاؤ گی جانی! کھانا تو کیا میری تو جان بھی حاضر ہے!

حوّا - (ہنستی ہے) بڑے مزے کی باتیں کرتے ہو۔ اچھا میں ابھی آئی۔

دوسرا آدمی - یہ کوئی اچھی عورت نہیں معلوم ہوتی ایک اجنبی سے کس قدر ہنس ہنس کر بے تکلفی سے بول رہی تھی۔

تیسرا آدمی - اے عورت اس بھکاری کو کیوں ساتھ لا رہی ہے یہ شریف آدمیوں کی جگہ ہے لنگر خانہ نہیں ہے۔ پیسے ہیں تمہارے پاس؟

آدم - ہاں ہمارے پاس بہت پیسہ ہے۔ یہاں سب چیزیں پیسہ کی آتی ہیں!

بیرا - کتنی؟ بھیک جمع کر لی بڑی شان دکھا رہے ہو۔

آدم - بھیک ——— لوگ ٹوٹے پیسہ کہتے ہیں۔

بیرا - اچھا باہر فرش پر بیٹھو میں وہیں کھانا لاتا ہوں۔ عجیب لوگ ہیں۔!

آدم - لو یہ رومال ——— اس میں پیسے ہیں۔

بیرا - اتنے پیسے ———!

ایک آدمی - نہ صرف چند روپے لے لو ———؟

آدم - تم خود اٹھا لو ———

بیرا - یہ لو ——— میں نے چار روپے لے لئے۔ انہیں گننا بھی نہیں آتا۔ اب یہاں زمین پر بیٹھ جاؤ ——— پلاؤ زردہ کھاؤ گے ——— تم بھی کیا یاد کرو گے ——— اور ہاں سیخ کے کباب ——— آج تمہارے ٹھاٹھ ہیں ———! میں ابھی آیا۔

ایک آدمی - لاؤ یہ رومال مجھے دو میں تمہیں گنتی سکھا دوں ——— ہاں کہو ایک دو ——— تین ——— چار۔

آدم - ایک - دو - تین - چار -

ایک آدمی - تم کھانا کھا لو پھر گننا -

آدم - آؤ بھائی تم بھی کھاؤ -

ایک آدمی - مہربانی ——— دو دن سے بھوکا ہوں ——— تم کہاں کے رہنے والے ہو یہاں تو آدمی روٹی پر کتوں کی طرح جھپٹتے ہیں - (گہرا سانس لیتا ہے) مجھے ذرا ایک ضروری کام ہے تم کھانا کھاؤ میں ابھی آیا پھر تمہارے ساتھ کھانا کھاؤں گا -

(وقفہ موسیقی ...)

آدم - بہت اچھا کھانا ہے -!

حوّا - میں نے بہت کھانا کھایا ہے بہت مزے کا تھا - اچھا اب چلیں ارے ہمارا ساتھی اب تک نہیں آیا وہ تو کھانے کو بھی کہہ رہا تھا -

آدم - اور وہ رومال ——— رومال کہاں ہے؟

حوّا - وہ بھی اسی کے پاس تھا ——— شاید اسے پیسوں کی ضرورت ہوگی اچھا کیا جو لے گیا - آؤ چلیں سانپ انتظار

کر رہے ہوں گے ۔

(ہلکی ہلکی موسیقی جو آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

آدم ۔ (تم) ان سانپوں کو گلے میں پہن لو میں پھر بین بجاتا ہوں ۔ اب ہمیں کچھ اور پیسے اکٹھے کرنے چاہئیں ۔

حوا ۔ ہاں ٹھیک ہے ۔ (الغوزے کی آواز)

ایک آدمی ۔ ارے سانپ والے ادھر آؤ ——— تم سڑکوں پر تماشا دکھاتے پھر رہے ہو ۔ میرے ساتھ آؤ میں تمہیں مالا مال کر دوں گا ——— مجھے بالکل ایسے ہی اداکاروں کی تلاش تھی ۔

آدم ۔ ہم تمہاری بات نہیں سمجھے ۔

آدمی ۔ (ہنس کر) تم میری بات نہ سمجھ سکو گے ۔ میرے ساتھ چلو اس موٹر میں بیٹھ جاؤ ۔

(موٹر کا دروازہ کھولنے اور بند کرنے کی آواز ۔ موٹر اسٹارٹ ہوتی ہے پھر آواز فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

آدمی ۔ اب تم اس جگہ بیٹھ جاؤ ۔ مگر یہ لباس اتارنا ہو گا تم یہ کپڑا لپیٹ لو ——— تم بہت خوبصورت ہو یہ کپڑے تمہاری خوبصورتی چھپاتے ہیں ۔ یہ سانپ تمہاری رانوں پر ہوں گے اور گلے میں وہ موٹا بڑا سا سانپ اور لے آدمی ——— تم اس عورت کے پاس کھڑے ہو کر بین بجاؤ ———

حوا ۔ میں یہ ذرا سا چیتھڑا نہیں پہنوں گی ——— تمہارے پاس اتنے اچھے اچھے کپڑے ہیں ۔ پھر بھی تم مجھے یہ پہننے کو کہتے ہو ۔ واہ میں تو بال لپیٹ کر اس بھیڑ کی کھال سے اپنا جسم چھپاتی تھی ۔ کپڑے خوبصورتی بڑھاتے ہیں یا گھٹاتے ہیں ——— آخر پھر تم لوگوں نے اتنے اچھے اچھے کپڑے کیوں بنائے ہیں ؟

آدمی ۔ بیوقوف میں فلم کی شوٹنگ کر رہا ہوں ۔ تم فلم "سپیرن" کی ہیروئن ہو اور یہ ہیرو ۔ جیسا میں کہوں ویسا ہی کرو ۔ دولت اور شہرت تمہارے قدم چومے گی ۔

آدم ۔ آؤ حوا چلیں ——— یہ سب باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں ۔

حوا ۔ ہاں چلو ——— !

آدمی ۔ بیوقوف ——— گدھے ——— میں تمہیں مالا مال کر دیتا ۔ !

حوا ۔ بھائی ہمیں جانے دو ۔ چلو آدم چلو ———

(الغوزے کی آواز)

حوا ۔ خدا جانے سانپ نے تمہیں یہ کیا چیز پکڑا دی ہے اب اسے رکھ دو ۔ اس کی آواز سے لوگ ہمیں گھیر لیتے ہیں ۔ میں سارا دن گھومتے گھومتے تھک گئی ہوں ۔ اور رات کو مجھے اس کے پاس بھی جانا ہے ۔

آدم ۔ کس کے پاس جانا ہے ؟

حوا ۔ ارے بھول گئے ۔ بم بنانے والے کے پاس ۔ سانپ کیا تم سو گئے تمہارے بچے بھی تھک گئے ہوں گے ۔

سانپ ۔ نہیں تو ——— تھکا کیا ہے ۔ میں تو سوچ رہا ہوں ہم سارے دن ناچتے رہے تم پیسے جمع کرتے رہے ——— لیکن رات کو بھوکا ہی سونا ہے بیچارے آدم کو ایک جوڑا کپڑا بھی نصیب نہ ہوا ۔

حوّا ۔ (ہنستی ہے) ہماری فکر نہ کرو ۔ ہم بہت خوش ہیں انھیں دیکھ کر ہی آنکھیں ٹھنڈی ہو گئی ہیں ۔ ہمیں سب کچھ مل گیا ہے ۔ اب آرام سے بیٹھو ۔

سانپ ۔ کیا من و سلویٰ اُترے گا ؟

حوّا ۔ دیکھو کچھ لوگ سامنے سے آتے نظر آ رہے ہیں ۔

(ہلکی موسیقی ——— فیڈ آؤٹ)

ایک عورت ۔ دیکھ لو ——— ضرور کوئی دیوی ہے ۔ ناگ اس کے پیروں کو چوم رہے ہیں ایک ناگ گلے میں ہے ۔

مرد ۔ دیوتا بھی ساتھ ہے ——— کتنے خوبصورت اور شاندار ہیں بالکل جیسے رام اور سیتا یا جیسے رادھا اور کرشن ۔ !

دوسری عورت ۔ چلو بڑھ کر ماتا کے قدموں کی مٹی اُٹھائیں ——— ہم سو بھاگیہ ہیں جو دیوی نے درشن دیئے ۔ !

تیسری عورت ۔ میرے پاس تو پوجا کا تھال ہے مندر ہی جا رہی تھی دیوتاؤں نے خود درشن دے دیئے ۔ !

حوّا ۔ کیا بات ہے ۔ تم کیا چاہتے ہو ؟

مرد ۔ پجاری ہیں دیوی اور دیوتا کا اشیرواد چاہتے ہیں ۔

حوّا ۔ (ہنستی ہے) ہم تم سے مل کر بہت خوش ہوئے ۔

مرد ۔ آپ کے درشن مل گئے تو سب کچھ مل گیا ——— یہ بھینٹ لایا ہوں ۔

آدم ۔ اچھا لاؤ ———

ایک عورت ۔ یہ مٹی اب میں سیندور کی جگہ لگاؤنگی ——— رات سپنے میں دیوی نے کہا تھا میں تجھ سے ملونگی ——— دیوی نے پکار سن لی ۔ ہمیں درشن دے دیئے ۔

دوسری عورت ۔ میں نے سنا تھا دیوی اور دیوتاؤں کے قدموں کو ناگ چومتے ہیں یہ بات سچ ہے ۔ !

تیسری عورت ۔ اے لڑکی جھک کر چل ۔ دیوی کے سامنے سیدھی نہ چل ۔ سر جھکا لے ———

مرد ۔ یہ سب تھال دیوی کے قدموں کے پاس رکھ کر چلو ——— ! اور جے بولو ———

عورتیں، مرد اور بچے } (مختلف آوازیں مل کر) دیوی دیوتا کی جے ! دیوی دیوتا کی جے ! ناگ دیوتا کی جے ———!

(ہلکی ہلکی موسیقی ——— فیڈ آؤٹ)

حوّا ۔ یہاں تو پھل اور مٹھائیوں کا ڈھیر لگ گیا ہے ۔ یہ ناریل ——— لو آدم ذرا یہ ناریل توڑ لو ——— یہ مجھے ہمیشہ سے پسند ہے ۔ !

آدم ۔ یہاں کے لوگ بہت مہمان نواز ہیں ۔

سانپ۔ (ہنس کر) مہمان نواز نہیں۔ دیوتا نواز ہیں۔ انسان بن کر تم شام سے بھوکے تھے اور دیوتا بن کر تم نے ذراسی دیر میں اناج جمع کر لیا۔ جلدی سے کھا پی کر چلو ——— وہ گاؤں جا کر ساری خلقت کو اکٹھا کرلائیں گے کہ آج پیپل کے نیچے دیوی دیوتا کا استھان ہے

حوّا ۔ تو پھر چلو ——— مجھے بم بنانے والے کے پاس بھی جانا ہے اور اب رات ہو چلی ہے ۔!

آدم ۔ واقعی، انسان بن کر دنیا میں جینا بہت مشکل ہے!

حوّا ۔ (ہنستی ہے) یہ ناریل بڑا میٹھا اور تازہ ہے۔ تو سانپ تم ناریل کا دودھ پیو میں نے یہ تمہارے لئے توڑا ہے!

سانپ ۔ تمہارے جانے کے بعد جانتی ہو کیا ہوگا۔ وہی لوگ جو صبح سے تمہاری جیبیں کاٹ رہے ہیں۔ تم کو طرح طرح سے لوٹنے کی فکر کر رہے ہیں وہی اس پیپل کو پوجنے آیا کریں گے۔ یہ پیپل آج سے مقدس ہے۔ یہ پتھر ——— یہ مٹی ——— یہ سب چیزیں مقدس ہیں۔ یہاں کا ذرہ ذرہ اب رہتی دنیا تک پوجا جائے گا۔ اور عجب نہیں کہ یہ گاؤں تمہارے نام پر دیوی نگر یا دیوتا نگر کہلانے لگے۔

حوّا ۔ اچھا وہ ہمیں یاد رکھیں گے۔

سانپ ۔ تم انسان کے روپ میں دنیا کی سیر کو ناحق نکلے۔ یہاں تو انسانوں کو بھی زندہ رہنے کے لئے دیوتاؤں کا ہی روپ دھارنا پڑتا ہے۔ (ہنستا ہے) انسان کے لئے تو یہ دنیا سرائے ہی رہے گی اور یہاں ہمیشہ دیوتا راج کریں گے!

حوّا ۔ اچھا اب باتیں ختم کرو اور مجھے اس بم بنانے والے کے پاس لے چلو۔

(موسیقی ——— فیڈ آؤٹ)

(دروازے پر دستک)

سائنسدان ۔ کون ———! اندر آ جاؤ۔ (دروازہ کھولنے کی آواز)

حوّا ۔ میں ہوں!

سائنسدان ۔ تم ——— ایک عورت۔ ——— میں شاید سو رہا ہوں۔ مگر نہیں میں جاگ رہا ہوں۔ تم ——— تم یہاں کیسے آ گئیں؟ کیا تم خواب ہو ——— مگر تم بہت خوبصورت خواب ہو ———! مجھے کبھی عورت کی خوبصورتی پر غور کرنے کی فرصت نہیں ملی ——— مگر جوانی میں ایسی شکل کبھی کبھی عورت کا روپ بھر کر میرے تصور میں ابھرتی تھی لیکن اب تم کیوں آئی ہو۔ اب مجھے عورت کے بارے میں سوچنے کی بالکل فرصت نہیں ہے۔ اب میں خواب بھی دیکھنا نہیں چاہتا ——— (رک کر) تم خوبصورتی کی انتہا ہو ———! مجھے ایسا لگ رہا ہے سائنس کی دیوی میری کامیابی پر مبارک باد دینے آئی ہے۔ مگر یہ اور بھی دلچسپ بات ہے (ہنستا ہے) میں دیویوں کے وجود کا قائل نہیں ہوں۔ دیوی جی ———!

حوّا ۔ (ہنستی ہے)

سائنسدان ۔ فرائڈ کی تھیوری سے مجھے اتفاق نہیں ہے مگر خواب کے بارے میں اس کا نظریہ درست ہے جنسی خواہشات کو

میں نے اتنا کچلا ہے کہ اب میرے لاشعور میں وہ خوبصورت عورت بن کر آنے لگی ہیں۔ یہ شعور میں تو ممکن نہیں ہے۔

حوّا ۔ میں خواب نہیں حقیقت ہوں ——— میں تمہارے پاس آئی ہوں ۔!

سائنسدان ۔ تم جو بھی ہو بیٹھ سکتی ہو ۔!

حوّا ۔ تمہارا اس وقت کمرے میں جی نہیں گھبرا رہا ۔ ابھی ہلکی سی پھوار پڑ کر بادل چھٹے ہیں اور دوبارہ چاند نکلا ہے ——— چاند تارے سب دُھلے دُھلے لگ رہے ہیں ۔!

سائنسدان ۔ (ہنس کر) چاند تارے نہیں دُھلے ۔ یہ تو فضا صاف ہونے کی وجہ سے زیادہ صاف نظر آ رہے ہیں ۔

حوّا ۔ میں یہی کہہ رہی تھی ۔

سائنسدان ۔ اچھا تو تم شاعرہ ہو ۔

حوّا ۔ میں تو ایک جاہل سی عورت ہوں ۔!

سائنسدان ۔ تم کس ملک کی ہو ؟

حوّا ۔ ساری دنیا میرا گاؤں ہے !

سائنسدان ۔ تم بڑی دلچسپ ہو ۔

حوّا ۔ میں تمہارے پاس ایک کام سے آئی ہوں ۔

سائنسدان ۔ میں حاضر ہوں ——— کیا خدمت ہے ؟

حوّا ۔ مجھے تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں ۔

سائنسدان ۔ (ہنس کر) تم عورتوں کا کام باتیں ہی تو کرنا ہے ۔ لیکن تم بے حد دلچسپ اور پُر اسرار ہو میں تم سے باتیں کرونگا ۔

حوّا ۔ تو پھر باہر چلیں اس بند بندسی جگہ میں میرا دم گھٹا جاتا ہے ۔

سائنسدان ۔ آؤ باغ میں چلیں ۔ (دروازہ دوبارہ کھولنے کی آواز) میں آج ایک عرصہ بعد باغ میں آیا ہوں ۔!

حوّا ۔ کیوں ——— ؟ تمہیں یہاں اچھا نہیں لگتا ۔

سائنسدان ۔ یہ بات نہیں ——— دراصل مجھے کبھی فرصت ہی نہیں ملتی ۔ لو یہ کرسی ۔!

حوّا ۔ میں تو اس سفید پتھر پر بیٹھوں گی ——— تم ہی اس پر بیٹھو ۔ یہ کس چیز کی ہے ۔

سائنسدان ۔ (ہنس کر) ارے تم اتنا بھی نہیں جانتی ہو ۔ یہ لکڑی کی ہے ۔ تم آخر کون ہو ۔ تم میرے کمرے کی چیزوں کو بھی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں ۔ ؟

حوّا ۔ ہاں ——— میں تمہاری چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی نہیں جانتی ——— ! لیکن میں اس سنگ مرمر کو جانتی ہوں جسے تم نے خوبصورتی سے تراش کر بیٹھنے کے لئے رکھا ہے ۔ جب میں نے جنم لیا اس وقت بھی یہ پتھر تھا ۔ اور آج بھی اور شاید ہمیشہ رہے گا ۔

سائنسدان ۔ تمہاری دلچسپ باتیں ——— سانولا رنگ ——— خوبصورت چہرہ ۔ بڑے بڑے سیاہ بال ——— ایسا لگتا ہے

جیسے الف لیلیٰ کی کہانیوں والی رات ہے!

حوّا - تم کہانیاں سنتے ہو؟ سناتے ہو؟؟

سائنسدان - ہاں کبھی بچپن میں سُنی اور سنائی تھیں مگر اب مجھے ان باتوں کی فرصت کہاں ہے۔ ؟

حوّا - جاڑوں کی طویل راتوں میں جب بہت ٹھنڈ مارے ڈالتی تھی ہم کہانیاں سُنا کر وقت گزارا کرتے تھے ——— بچے کہانیاں سُنتے سُنتے سو جایا کرتے تھے۔

سائنسدان - مجھے تو ایسا لگتا ہے جیسے تم بھی کہانی ہو ——— دنیا کی پہلی اور آخری کہانی ——!

حوّا - دلچسپ ہے! میرا خیال ہے اگر تمہیں فرصت ہوتی تو تم ضرور اچھی کہانیاں کہا کرتے۔!

سائنسدان - ایک کہانی ہر وقت میرے ذہن میں رہتی ہے اور مجھے کام کرنے پر اکساتی ہے وہ ہے انسانی ارتقا کی کہانی ——— میری کوششوں کے بغیر یہ کہانی ادھوری رہے گی!

حوّا - کیسی خوبصورت رات ہے۔ جب پانی کے قطرے خشک زمین پر پڑتے ہیں تو اس کی چھاتی سے مست کر دینے والی سوندھی سوندھی خوشبو چھوٹتی ہے۔ کیا تمہیں یہ سوندھی سوندھی خوشبو پسند ہے؟

سائنسدان - (گہرا سانس لے کر) زمین کی خوشبو! میں نے کبھی اس پر غور نہیں کیا۔؟

حوّا - خوشبو تو غور کرنے کی چیز نہیں ہے محسوس کی جاتی ہے۔

سائنسدان - میں دھاتوں کے پگھلنے کی بو جانتا ہوں۔ میری لیبوریٹری میں جا کر دیکھو کتنی عجیب عجیب قسم کی خوشبوئیں اور بدبوئیں مل گئی ہیں۔ مجھے تو اب نہ خوشبو کا احساس رہا ہے نہ بدبو کا ———!

حوّا - کتنا پیارا منظر ہے کالے کالے بادلوں پر چاندنی کرنوں نے روپہلی گوٹ لگا دی ہے۔ اور یہ ان بڑے بڑے دھندلے چمکتے ہوئے پُراسرار ان گنت تارے یہ تمہارے آسمان سے باتیں کرتے ہوئے مکان ——— یہ پھولوں سے لدے ہوئے باغ ——— یہ تارکول کی چمکتی ہوئی کشادہ سڑکیں ——— ان پر رینگتی ہوئی رنگ برنگی موٹریں ——— موسیقی ——— خوبصورتی ———! دنیا بڑی پیاری جگہ ہے۔ تمہیں کیسی لگتی ہے؟

سائنسدان - تم دنیا کو اتنی شاعرانہ نظروں سے دیکھتی ہو! شاید یہ خیال سچ ہے کہ یہ سب ترقی یافتہ سیارہ ہے!

حوّا - اور ذرا سوچو تو . . . اگر یہ سب ختم ہو جائے!

سائنسدان - تو پھر لاکھوں سیاروں میں سے ایک سیارہ گم ہو جائے گا مگر اس سے نظامِ شمسی میں کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔

حوّا - یہ صرف اتنی ذرا سی بات ہے! آہ ——— خیر یہ باتیں چھوڑو ——— تم تو یہ بتاؤ کیا تم نے شادی کی ہے۔ تمہارے بچے ہیں؟

سائنسدان - میں نے شادی نہیں کی اور بہت محتاط زندگی گزاری ہے اس لئے میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میرا کوئی بچہ نہیں ہے۔!

حوّا - اسی لئے تم یہ باتیں کرتے ہو۔ اگر تمہارے گھر میں کوئی خوبصورت عورت گنگنایا کرتی ——— تمہارے ننھے منّے

بچے ہنستے شور مچاتے اور تم سردیوں کی ٹھٹھرا دینے والی راتوں میں لیبوریٹری کے بجائے اپنے گھر میں اپنے بال بچوں کے درمیان آتش دان کے پاس بیٹھا کرتے تو تم ایسی باتیں نہ کرتے !

سائنسدان ۔ تم عجیب عورت ہو !

حوّا ۔ ہاں تمہیں میری باتیں عجیب لگتی ہیں ۔ تم انسان نہیں مشین ہو ۔ جس طرح تم بٹن دبا کر سارے کام کر لیتے ہو اسی طرح تمہارا بٹن دبا کر لوگ تم سے بم بنواتے ہیں ۔

سائنسدان ۔ میں مشین ہوں ۔ (ہنستا ہے) آخر ان سب باتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے ؟

حوّا ۔ میں تم سے یہ پوچھنے آئی ہوں کہ تم بم کیوں بناتے ہو ۔ ؟

سائنسدان ۔ عجیب سوال ہے ! یہ سوال تو تم کسی سیاست دان سے کرو ۔ (ہنستا ہے) دراصل مجھے نئے نئے تجربات کرکے خوشی ہوتی ہے ۔ میں نے کبھی شادی کرکے خوبصورت بچے پیدا کرنے کے خواب نہیں دیکھے بلکہ میرے خوابوں میں بھی نئی نئی ایجادیں جنم لیتی ہیں ۔

حوّا ۔ ایک بات پوچھوں (رک کر) کیا تم نے کبھی کسی عورت سے محبت کی ہے ؟

سائنسدان ۔ محبت تو نہیں ——— البتہ ایک دفعہ معمولی سا لگاؤ ہوا تھا ۔ لیکن وہ لڑکی مجھ سے مایوس ہونے کے بعد پانی میں ڈوب کر مر گئی !

حوّا ۔ پھر ——— تم نے کبھی اسے یاد بھی کیا ——— ؟

سائنسدان ۔ ہاں ——— نئی نئی ایجادوں کے بعد مجھے کبھی کبھی یہ خیال آیا کہ وہ زندہ ہوتی تو میری ان ایجادوں پر بہت خوش ہوتی !

حوّا ۔ نہیں ——— اچھا ہوا وہ نہ ہوئی ——— وہ اپنا سر پھوڑ لیتی ——— وہ عورت تھی ۔ اس کے سینے میں دل تھا ۔ وہ محبت کرنا جانتی تھی ۔ اور . . . . . . اور اسی لئے وہ مر گئی ! بیچاری ! کیا تم کبھی اس کی قبر پر گئے ہو ۔ ؟

سائنسدان ۔ صرف ایک بار ——— دراصل مجھے اتنی فرصت !

حوّا ۔ فرصت ——— فرصت ——— ! اچھا یہ بتاؤ وہ لڑکی کیسی تھی ؟

سائنسدان ۔ وہ بہت زیادہ خوبصورت تو نہ تھی مگر وہ میری زندگی میں پہلی اور آخری عورت تھی اور وہ ایک سائے کی طرح گزر کر چلی گئی ۔

حوّا ۔ تمہارے بھائی ہیں ——— بہنیں ہیں ۔ ؟

سائنسدان ۔ ہاں میری ایک بہن اور ایک بھائی ہے ۔ ان کی شادی ہو گئی ان کے بچے بھی ہیں ۔

حوّا ۔ تمہیں وہ بچے کیسے لگتے ہیں ؟

سائنسدان ۔ مجھے ان بچوں سے بہت محبت ہے ۔ مجھے اپنا بھانجہ بہت پسند ہے ہم اسے منا کہتے ہیں ۔

حوّا ۔ کیا تمہارا جی چاہتا ہے کہ منا بہت عرصہ تک زندہ رہے اس کا بھی گھر بنے اور اس کے بھی خوبصورت بچے ہوں

سائنسدان - ہاں ——— یہ خواہش تو ہر ایک کو ہوتی ہے -

حوّا - آہ ——— تو پھر تم بم کیوں بنانے ہو - کیا تم چاہتے ہو تمہارا امتا اور بہت سے عقے ساری دنیا کے ننھے منے ختم ہو جائیں - وہ جوان نہ ہوں - اس زمین کی سوندھی خوشبو نہ سونگھ سکیں ——— آسمان کے خوبصورت رنگ نہ دیکھ سکیں ——— (رک کر) ہو سکتا ہے تمہارے منے چاند اور سورج تک پہنچ کر ان کی کرنوں کا سونا نکال لائیں ——— ہو سکتا ہے وہ دولت اور علم سے دنیا کو مالا مال کر دیں ——— لیکن تم ——— تم چاہتے ہو ان کا وجود ہی نہ رہے - !

سائنسدان - تم ——— تم کیسی باتیں کر رہی ہو ؟

حوّا - ہاں ——— تم چاہتے ہو انسان ہمیشہ کے لئے موت کی نیند سو جائے وہ انسان جسے میں نے جنم دیا ہے جسے میں نے چرخہ کات کر کپڑے پہنائے تھے جس کے لئے آدم نے زندگی بھر زمین کھود کر بیج بوئے تھے ——— وہ انسان جس نے ارتقا کی ہزاروں منزلیں طے کی ہیں - جو اب ہاتھ ہلائے بغیر بٹن دبا کر کھانا پکا لیتا ہے ——— جو ہزاروں میل کے فاصلہ پہ بیٹھ کر ایک دوسرے سے بات کرنے لگتا ہے جو پلک جھپکنے میں دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ جاتا ہے - اور ——— پھر وہ انسان جو اب بھی معصوم ہے جو گیہوں اور مکئی کے ہرے بھرے کھیتوں میں کام کرتا ہے جو بیج بوتا ہے، ہل چلاتا ہے، بیل نکالتا ہے، ملوں اور کارخانوں میں کام کرتا ہے - اور ہمیشہ اچھی اور خوبصورت زندگی کے خواب دیکھتا ہے ——— تم اسے ختم کرنا چاہتے ہو ——— تم کتنے ظالم ہو ——— میں ——— میں ——— (آواز بھرا جاتی ہے اور حوّا سسکیوں سے روتی ہے) -

سائنسدان - اوہ ——— تم رونے لگیں ——— آنسو پونچھ لو ——— تم بڑی پیاری عورت ہو آؤ میں اپنے رومال سے تمہارے آنسو پونچھ دوں ——— امت روؤ ——— !

حوّا - (بھرائی ہوئی آواز سے) میں نہ روؤں ——— میری محبت اور محنت کی عظیم نشانی یہ انسان صفحۂ ہستی سے مٹ جائے - اس دنیا پر اندھیرا چھا جائے ایسا اندھیرا جس میں چاند اور سورج بھی راستہ بھول جائیں اور ——— مجھے رونا نہیں چاہیئے ——— پھر کیا مجھے ہنسنا چاہیئے -

سائنسدان - تم بہت جذباتی ہو - !

حوّا - تم بہت سنگدل ہو ! تمہاری محبوبہ نے پانی میں چھلانگ لگا دی اور اب تمہارا امتا اپنی معصوم ہنسی کے لئے ——— اپنے خوبصورت مستقبل کے لئے تمہاری طرف دیکھ رہا ہے غور سے دیکھو ——— اپنے دل کے دروازے کھول لو ——— کتنے منے تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں -

سائنسدان - عورت ! تو نے مجھے سوچ میں ڈال دیا ——— !

حوّا - تمہیں کیا معلوم تخلیق کرنا کتنا مشکل ہے اور مٹانا کتنا آسان ہے اگر تم نے کوئی تخلیق کی ہوتی ——— کوئی جیتی جاگتی خوبصورت تخلیق ——— تب تم جان سکتے ! مجھے تو اس دھرتی سے اتنی محبت ہے کہ جب سبز سبز

گھاس پر چلتی ہوں تو اپنے قدم ہولے ہولے اُٹھاتی ہوں۔ تاکہ یہ سبز گھاس جس میں رنگ ہے رس ہے زندگی ہے مرجھا نہ جائے ——— آہ مجھے کیا معلوم تھا کہ دُنیا ارتقا کی ہزاروں منزلیں طے کر کے ایک دن تمھارے ہاتھوں ختم ہوتی ہے -!

سائنسدان - تم نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔

حوّا - جب میرے پہلے بیٹے نے جانوروں کا شکار کیا تو میں تین دن بھر کھانا نہیں کھایا تھا۔ اور دوسرا بیٹا اس سے بھی دو قدم آگے بڑھ گیا اس نے اپنے بھائی کو مار ڈالا ——— اس کے ہاتھوں میں خون کی جو بو تھی وہ اس کی نسل سے نہیں گئی ——— وہی بو مجھے آج تمھارے ہاتھوں سے آ رہی ہے۔

سائنسدان - عورت! تم کون ہو؟

حوّا - میں تمھاری ماں ہوں ———! میرا رنگ نہ گورا ہے اور نہ کالا۔ مگر میں سب گورے اور کالے انسانوں کی ماں ہوں۔ اور مجھے سب سے یکساں پیار ہے -!

سائنسدان - تم ——— تم واقعی میری ماں ہو ———! محبت کی یہ خوبصورت روشنی مجھے اپنی ماں کی آنکھوں میں نظر آیا کرتی تھی ——— میں تمھارا ہاتھ چومنا چاہتا ہوں ——— مجھے سچ مچ یہ محسوس ہو رہا ہے کہ میں تمھارا بیٹا ہوں۔ اور جیسے کسی عورت کا شوہر بھی ہوں ——— اور اپنے بچوں کا باپ ہوں ——— اور ——— جیسے مجھے اپنی لڑکی کا بیاہ کرنا ہے ——— ایسے جذبات میرے سینے میں کبھی پیدا نہ ہوئے تھے

حوّا - تو ——— تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم بم نہیں بناؤ گے!

سائنسدان - (چونک کر) کیا کہا ——— میں تم سے وعدہ کروں کہ میں بم نہیں بناؤں گا (قہقہہ لگا کر) عورت تو کوئی جادوگرنی ہے۔ تو نے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔ میں جذبات کی رو میں بہہ گیا تھا اب مجھے پھر ہوش آگیا ہے۔ اب میں جاگ رہا ہوں۔

حوّا - تم جاگنے لگے تھے اور اب پھر سونا چاہتے ہو۔! تو ——— تم ......!

سائنسدان - ہاں ——— میں کوئی وعدہ نہیں کروں گا۔ میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا ——— خدا کے لئے میرے سامنے سے ہٹ جاؤ ——— مجھے پاگل نہ بناؤ ——— میں پانچ سال سے جس بم پر محنت کر رہا تھا آج صبح میں نے وہ عظیم بم بنا لیا ہے اس تجربے پر میری محنت اور لاکھوں روپیہ خرچ ہوا ہے۔ یہ سب کھیل نہیں ہے! میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا ———!

حوّا - تم کوئی وعدہ نہیں کر سکتے۔ تم زندگی اور روشنی کے دشمن ہو۔ تم موت کے ساتھی ہو ——— تم اندھیرے کے غلام ہو!

سائنسدان - کیا بکواس لگا رہی ہے ——— مجھے تمھاری تقریریں متاثر نہ کر سکیں گی۔ آج پانچ برس کی محنت کے بعد جب میں کامیابی کی منزل پر کھڑا ہوں۔ تم اچانک آ کر مجھے دھکا دینا چاہتی ہو۔ میرے سامنے دولت اور شہرت کے

دروازے کھلے ہیں۔ کل صبح کا سورج مجھے دنیا کا سب سے بڑا آدمی بنا دے گا کل میں بورڈ کے سامنے نئے بم کا فارمولا پیش کروں گا۔

حوا - نہیں ——— نہیں تم یہ نہ کرنا ———! میں ماں ہو کر تمہارے پیر پکڑتی ہوں۔

سائنسدان - (چلاتے ہوئے) میں کہتا ہوں ——— ہٹ جاؤ ——— خدا کے لئے میرے سامنے سے چلی جاؤ ——— یہ سب جذباتی باتیں اور حرکتیں کر کے مجھے پاگل مت کرو ———! مجھے تنہا چھوڑ دو۔

حوا - جب تک تم وعدہ نہ کروگے ——— میں نہیں جاؤں گی!

سائنسدان - اوہ ——— تم نہیں جاؤ گی ——— میں کہہ چکا ہوں میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا ——— خواہ تم میری جان ہی لے لو ———!

حوا - کاش میں تمہاری جان لے سکتی۔ تو میں یہ بھی کر لیتی! اس وقت میرا جی چاہتا ہے (چلاتے ہوئے) میرا جی چاہتا ہے میں تمہیں مار ڈالوں (آہستہ سے رک کر) مار ڈالوں!

سائنسدان - تو پھر میری شکل کیوں دیکھ رہی ہو۔ میری جیب میں پستول ہے ——— لو یہ لو ———! اس کی لبلبی دبا دو تمہاری خواہش پوری ہو جائے گی ———!

حوا - یہ پستول ———! اس کی لبلبی دبا دوں ——— (ٹھاہ کی آواز)

(چند لوگوں کے چلانے اور دوڑنے کا شور رفتہ رفتہ فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے)

ایک آواز - یہ کیا ———! پروفیسر صاحب نے خودکشی کر لی! ان کا مردہ ہاتھ اب تک پستول تھامے ہے ——— اُف ———!

سیکرٹری - اف خدا یہ کیا ہوا ——— کیسے ہوا؟ میرا دماغ کام نہیں کرتا۔

ایک آواز - کیا آپ ان کے سیکرٹری ہیں -؟

سیکرٹری - جی ہاں ——— میں ان کا سیکرٹری ہوں!

دوسری آواز - کل شام ان کی طبیعت ٹھیک تھی؟

سیکرٹری - جی ہاں وہ بہت خوش تھے۔ ان کی طبیعت بالکل اچھی تھی۔ کل صبح انہوں نے اپنا مشہور بم بنایا تھا جس پر وہ گذشتہ پانچ سال سے شب و روز محنت کر رہے تھے۔ اور آج صبح وہ اس کا فارمولا بورڈ کے سامنے پیش کرنے والے تھے۔

ایک آواز - وہ کل رات کیا کرتے رہے؟

ایک عورت - جناب وہ کل رات کھانا کھانے کے بعد اپنے کمرے میں ہی تھے۔ مجھے رات کو یہ محسوس ہوا جیسے وہ جاگ رہے ہیں ان کے کمرے سے باتوں کی آواز سنائی دیتی تھی۔ جیسے وہ خواب میں کسی سے باتیں کر رہے ہوں ———!

دوسری آواز - آپ اس گھر میں کب سے ملازم ہیں۔

ایک عورت ۔ پروفیسر صاحب کی والدہ نے مجھے ملازم رکھا تھا۔ یہاں میری جوانی گذری اور اب بڑھاپا گذر تا ——!

سیکرٹری ۔ وہ تنہا تھے! آپ کو پورا یقین ہے!

عورت ۔ جی ہاں —— وہ بالکل تنہا تھے انھوں نے آخری بار دس بجے کافی بھی منگوائی تھی۔ اس وقت وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے ——!

سیکرٹری ۔ یہ نرگس کے پھول —— یہ ان کے تکیے پر کہاں سے آ گئے!

عورت ۔ (تعجب سے) نرگس کے پھول ——!

دوسری آواز ۔ آپ کو ان پھولوں پر اتنا تعجب کیوں ہے؟

عورت ۔ میں نے انھیں پھول چھوتے یا سونگھتے نہیں دیکھا —— یہ نرگس کے پھول۔ اور —— پروفیسر صاحب کے کپڑے اوس میں بھیگ رہے ہیں۔ غالباً وہ رات کو کسی وقت باغ میں بھی گئے تھے —— اور ان کے سرہانے یہ کیا ہے —— ٹھہریئے میں دیکھوں ——۔

سیکرٹری ۔ یہ پرچہ —— یہ کیا ——! یہ تو پروفیسر صاحب کی تحریر ہے!

عورت ۔ پروفیسر صاحب کی تحریر ——! بڑے آدمیوں کی زندگی میں بھی نازک ترین لمحے آتے ہیں۔ آہ یہ سب کیا ہے۔ (دکھ سے) سیکرٹری صاحب اس پرچہ کو پڑھیئے۔

سیکرٹری ۔ یہ کسی کے نام نہیں —— البتہ اس پر ان کے دستخط ہیں۔ لکھا ہے (بلند آواز سے پڑھتا ہے) میں گذشتہ پانچ سال سے جس بم پر محنت کر رہا تھا آج صبح میں نے وہ بم بنا لیا۔ لیکن اس طاقتور بم کا مالک ہونے کے بعد میں خود کو بے انتہا حقیر کمزور اور بے بس محسوس کر رہا ہوں۔ ایک عالم —— کسی گروہ —— کسی قوم —— کسی ملک کی ملکیت نہیں۔ وہ ساری دنیا کی ملکیت ہوتا ہے۔ اور اس کے سامنے ساری انسانیت کا مفاد ہوتا ہے۔ میں اپنے ننھے منّوں سے وعدہ کرتا ہوں کہ دنیا سے اس کا خوبصورت اُجالا۔ زمین سے اس کی سوندھی سوندھی خوشبو اور زندگی سے اس کا رس اور رنگ نہیں چھینوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں —— وعدہ —— (آواز آہستہ آہستہ فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

(ہلکی موسیقی شروع ہوتی ہے جو کلائمکس پر پہنچ کر ختم ہو جاتی ہے)

———

ہماری نئی مطبوعات

جناب

صاحب کے بعد یہ محمد طفیل کے اسکیچوں کا دوسرا مجموعہ ہے جس کے متعلق خود طفیل صاحب کہتے ہیں :-

"یہ کوئی غیر فانی اور زندہ رہنے والی کتاب نہیں مگر اس میں غیر فانی شخصیتوں کے بارے میں میرے تاثرات ہیں۔ میری یہ کوشش اپنی طرز نگارش کی بجائے ان شخصیتوں کی وجہ سے زندہ رہے گی جن پر میں نے قلم اٹھایا ہے۔"

قیمت -/۳

عبرتِ بہارستان

امیر مینائی کے اس غیر مطبوعہ دیوان کا نام ہے جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا تھا۔ اب خالد مینائی نے بڑی تلاش سے اس کا کچھ حصہ دوبارہ مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں امیر مینائی کے حالات، شاعری کے محاسن اور کلام کا بہترین انتخاب بھی ہے۔ قیمت ۲/۵۰

برف کے پھول (کرشن چندر)

کرشن بلا سوچے سمجھے قلم نہیں اٹھاتے۔ ان کی تحریروں میں، دل کی دھڑکنوں کے ساتھ، وقت کی آواز بھی صاف سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے جو کچھ بھی لکھا، اس سے اردو افسانے کی آبرو قائم ہے۔ یہ ناول، خالصتاً رومانی داستان ہے جسے اردو افسانے کے ایک "جادوگر" نے لکھا ہے۔

قیمت -/۳

رات، چور اور چاند

(بلونت سنگھ)

آج تک اردو میں کل تین چار ہی تو قابلِ ذکر ناول لکھے گئے ہیں۔ ان میں بھی اب جا کر ایک اور معرکے کے ناول کا اضافہ ہوا ہے۔ جسے بلونت سنگھ نے لکھا ہے۔ یہ ناول قسط وار نقوش میں شائع ہوتا رہا ہے۔ جس کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اس میں بلونت سنگھ کا فن عروج پر ہے۔ جزئیات نگاری بلونت سنگھ پر ختم ہے۔ پنجاب کی زندگی کا بھرپور نقشہ جیسے بلونت سنگھ نے پیش کیا ہے، وہ انہی کا حصہ ہے۔

قیمت -/۷

ادارۂ فروغِ اردو، لاہور

ہماری کتابیں

ادارۂ فروغِ اردو نے جتنی بھی کتابیں چھاپی ہیں —
ان کی اہمیت کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔

۱ — شعلۂ طور	جگر مرادآبادی	۷/۵۰
۲ — بازارِ حیات	احمد ندیم قاسمی	۲/۵۰
۳ — آنچل	احمد ندیم قاسمی	۳/-
۴ — اندازے	فراق گورکھپوری	۵/-
۵ — اردو غزل گوئی	فراق گورکھپوری	۲/-
۶ — صاحب	محمد طفیل	۲/-
۷ — جناب	محمد طفیل	۳/-
۸ — منٹو	ابو سعید قریشی	۴/۲۵
۹ — سرکنڈوں کے پیچھے	منٹو	۳/-
۱۰ — غیرتِ بہارستان	امیر مینائی	۳/۵۰
۱۱ — قول و قرار	عدم	۲/۵۰
۱۲ — زیچ و خم	عدم	۳/-
۱۳ — باغ و بہار	عدم	۲/۵۰
۱۴ — روزن	قتیل شفائی	۲/-
۱۵ — رات، چور اور چاند	بلونت سنگھ	۷/-
۱۶ — برف کے پھول	کرشن چندر	۲/-
۱۷ — مٹی کی مونا لیزا	اے حمید	۴/-
۱۸ — ایک حمام میں	عشرت رحمانی	۲/-
۱۹ — انتقاد	سیّد عابد علی عابد	۲/-
۲۰ — یدِ بیضا	سید عابد علی عابد	۵/-

۲۱	ہماری داستانیں	سید وقار عظیم	۵/-
۲۲	سیاستِ الٰہیہ	ابن تیمیہ	۲/۵۰
۲۳	مضامین جمال الدین افغانی		۵/-
۲۴	امراؤ جان ادا	مرزا رسوا	۴/-
۲۵	آنچ	قیسی رامپوری	۳/-
۲۶	عزیزم کے نام	ڈاکٹر تاثیر	۲/۵۰

(اسلامی کتب)

۲۷	خلفائے محمد	عمر ابو النصر	۱۰/-
۲۸	بلال رضؓ	عباس محمود العقاد	۲/۲۵
۲۹	عہدِ نبوی کی اسلامی سیاست	عبد المتعال الصعیدی	۵/-
۳۰	خدیجہ	عبد الحمید الزہراوی	۴/-
۳۱	نبی امی	عمر ابو النصر	۵/-
۳۲	اسلام کا نظامِ عدل	محمود بن محمد بن عرنوس	۴/-
۳۳	عرب کے تین مدبر	عمر ابو النصر	۳/-

تصانیف شوکت تھانوی

۳۴	بھابی	۴/۵۰	۳۵	نیلوفر	۶/-
۳۶	بارِ خاطر	۴/-	۳۷	بے قاعدہ	۲/-
۳۸	مولانا	۳/۵۰	۳۹	غزالہ	۶/-
۴۰	خدانخواستہ	۳/-	۴۱	سودیشی ریل	۳/-
۴۲	کتیا	۲/۵۰	۴۳	سانچ کو آنچ	۳/۵۰
۴۴	سسرال	۲/۲۵	۴۵	کارٹون	۲/۵۰
۴۶	مابدولت	۳/-	۴۷	لقراط	۳/۵۰
۴۸	جوڑ توڑ	۴/-	۴۹	مضامین شوکت	۲/۵۰
۵۰	قاضی جی۔ فی حصہ	۳/۵۰	۵۱	غالب کے ڈرامے	۲/۵۰
۵۲	وغیرہ وغیرہ	۳/-	۵۳	نمک مرچ	۳/-

ادارہ فروغ اردو لاہور

تین کتابیں

آنچ
قیسی رامپوری

جراثم کی اس دنیا میں ہزاروں آدمی سانس لے رہے ہیں اور ان کے سانس کے ساتھ صدہا جراثیم ان کے جسم میں غیرارادی طور پر داخل ہو جاتے ہیں۔ ہوش آتا ہے تو معلوم ہوتا ہے جیسے ہم پیدا ہی گناہ کیلئے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ ہوش از خود نہیں آتا۔ دلایا جاتا ہے تربیت کے ذریعے، اصول کے ذریعے، مذہب کے ذریعے اور کسی قانون کے ذریعے ہر شخص کو آنچ کی ضرورت ہے تا کہ کسر نہیں رہنی چاہیئے۔ ناول آنچ میں اس خیال کو ایسی خوبی سے پھیلایا گیا ہے کہ بے اختیار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ قیمت -/۲

مٹی کی مونالزا
اے حمید

بے حد خوبصورت افسانے اے حمید نے لکھے ہیں، کم کسی نے لکھے ہوں گے۔ رومانی ہی رومانوی فضا، سارے ہی رومانی کردار۔ یہ خاصہ صرف حمید کے افسانوں میں ملے گا۔ یہ مجموعہ اے حمید کے نئے افسانوں کا مجموعہ ہے جس کا ایک ایک افسانہ، دل ہی کی دھڑکنوں کے ساتھ لکھا گیا ہے اور دل ہی دل کی دھڑکنوں کے ساتھ پڑھا جائے گا۔

قیمت -/۴

ایک حمام میں
عشرت رحمانی

یہ ڈرامہ ایک بڑے ہی معروف ڈرامے "لارنس" کا اُردو ترجمہ ہے جسے عشرت رحمانی نے اُردو میں منتقل کیا۔ ڈرامے کی رومانوی فضا اور اس کے کردار، پھر ان سب کا فنی تجزیہ۔ ان سب خصوصیات نے مل کر اس ڈرامے کو ناقابلِ فراموش شہکار بنا دیا ہے۔ اس ڈرامے کی ایک ایک سطر من موہنی ہے۔

قیمت -/۲

ہماری کتابیں
ادب کی آبرو ہیں

ادارۂ فروغِ اردو
لاہور

تین کتابیں

بلال رض

بلال رض رسول اللہ کے سچے جاں نثار تھے۔ رسول [redacted] ان کی قدر کرتے تھے۔ کہنے کو تو بلال حبشی تھے ان کا رنگ سیاہ تھا [redacted] ایمان سے منور تھا۔ رسولِ اکرم اور صحابہ کرام انھیں جس احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے اس سے بڑے بڑے باجبروت فرمانروا بھی محروم تھے۔ بلال رض کی شخصیت پر یہ پہلی کتاب ہے۔

قیمت ۲ روپے ۵۰ پیسے

عہدِ نبوی کی اسلامی سیاست

ابتدا عالمِ انسانیت جہالت، ناانصافی، ظلم وجور، نسلی تفاخر کے دور سے گزر رہی تھی۔ رسولِ مقبول نے دنیا کو ایک ایسی سیاست سے روشناس کرایا جس میں عدل وانصاف، اتحاد واتفاق اور مساوات تھی۔

یہ کتاب رسول اللہ کے دور کی سیاسی تاریخ ہے۔

قیمت ۵ روپے

اسلام کا نظامِ عدل

اسلام نے ابتدا ہی میں بڑے بڑے عالموں کو اس لیے قاضی مقرر کر دیا تھا کہ عدل و انصاف ہر چھوٹے بڑے کے لیے ارزاں ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قاضیوں کے فیصلے حاکمانِ وقت بھی نہیں بدل سکتے تھے اور قاضی جو فیصلے صادر کرتے تھے۔ وہ [redacted] اور قرآن کی [redacted] مطابق ہوتے تھے۔ یہ [redacted] نظام میں بھی ہدایت کا [redacted] قیمت ۴ روپے

ادارہ فروغ اردو ... لاہور



باغ دو حصوں پر منقسم ہے ایک حصہ پرائیویٹ باغ کہلاتا ہے۔ جہاں رائے پنڈت جنار دھن خود رہتے تھے دوسرا عوام کے لیے ہے جو پرائیویٹ باغ سے رقبہ و وسعت اور عمارات و اشجار میں بہت بڑا ہے دونوں باغوں کو ایک سڑک جدا کرتی ہے جو باغ ہی کی زمین سے ہو کر موضع سانده کی طرف چلی جاتی ہے پرائیویٹ باغ بائیں جانب ہے اور وقف عام باغ دائیں جانب ہے دونوں باغوں کی چار دیواری کہیں پختہ قد آدم ہے کہیں بنیاد پختہ بنا کر ان پر لکڑیاں لگا دی گئی ہیں دونوں باغوں میں جانے کے لیے یوں تو کئی ایک رستے ہیں مگر اصل رستے دو ہی ہیں جن کے بڑے بڑے پھاٹک ہیں۔

بڑے باغ یا وقف عام باغ میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ چھوٹے چھوٹے فوارے آتے ہیں جو سنگ مرمر کی مورتیوں کی شکل میں ہیں ان میں کئی ایک مور بیکار ٹوٹ گئی ہیں بعض مورتیوں پر زنگ اس قدر غالب آ گیا ہے کہ سنگ مرمر نظر ہی نہیں آتا۔ اس باغ میں بہت سی سڑکیں۔ روشیں۔ خیابان۔ گل بوٹے۔ درختان بے ثمر و ثمردار۔ حوض۔ فوارے۔ کمرے۔ بارہ دریاں۔ آسمانی کنوئیں۔ تخت سنگ مرمر۔ دو شیر۔ قد آدم محافظ سپاہیوں کی تصویریں۔ فواروں کے لیے پانی جمع کرنے کے تالاب۔ مختلف نشست گاہیں سیر کرنے والے کے دل کو فرحت دیتی ہیں۔

آسمانی کنوئیں کے ساتھ ایک چھوٹی سی بارہ دری ہے جس کا فرش سفید و سیاہ سنگ مرمر کا ہے۔ اس کے نیچے ایک خوب صورت سی آبشار ہے جس پر پانی لہریں مارتا ہوا پانچ فواروں والے حوض میں جاتا ہے جس کا وسطی فوارہ دوسرے فواروں سے بڑا ہے۔

اسی باغ کے اس حصہ میں جو سڑک کے کنارے ہے دو شیروں کی تصویروں کے پاس رنگین فوارے ہیں فواروں کی شکل بھی رنگ دار ہے۔ اور جب ہو[illegible] کے دن آتے ہیں تو ان سے پانی بھی رنگدار ہی نکلتا ہے۔ اور شور و [illegible] اور ہاؤ ہو کے بغیر عبیر و گلال کے پھینکے جانے کا لطف آتا ہے۔

اس باغ میں مالٹا۔ آڑو۔ آلوچہ۔ سنگترہ۔ رنگترہ۔ نارنگی۔ آم (سندوری۔ قلمی۔ کالے۔ ہنڈولی وغیرہ) امرود۔ انار۔ لیموں میٹھا کھٹا۔ گل گل کے درخت ہیں۔ ان کے علاوہ سفیدہ۔ [illegible] کے درخت اور کئی قسم کے اور درخت مختلف پھولوں کی بہار دکھانے والے بھی ہیں۔ ان کے علاوہ ایک ایسے گلاب کے بھی وہاں بوٹے ہیں جس کو ہرا گلاب کہتے ہیں جس کے پتے بھی ہرے رہتے ہیں جس کی کلی بھی ہمیشہ ہری اور جس کا پھول بھی ہمیشہ ہرا رہتا ہے اور جو نہایت بھلا اور خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔

رنگین فواروں کے پاس ہی سڑک کے پاس ایک چھوٹا سا دروازہ ہے جس کے دونوں طرف قد آدم محافظ سپاہیوں کی مع ان کی بندوقوں کے تصویریں ہیں دروازے کے سامنے سنگ مرمر کا ایک چبوترہ ہے جس پر سنگ مرمر ہی کا ایک تخت ہے۔ تخت کا دایاں بازو موجود ہے بایاں شکستہ صورت میں الگ پڑا ہوا ہے۔

جس طرح تخت کے دروازے کے ساتھ پانچ رنگین فوارے ہیں اسی طرح اس کے سامنے جو تالاب ہے وہاں بھی سنگ مرمر کے پانچ کلاں فوارے موجود ہیں۔ سنگ سرخ کی آٹھ سیڑھیوں کے بعد تالاب کا دروازہ آتا ہے۔ دروازے سے تالاب تک چند قدم کا جو رستہ ہے وہاں بھی سنگ سرخ ہے۔ بلکہ اس تالاب کے گرد جو چبوترہ ہے اور چبوترہ پر چاروں طرف جو مسقف برآمدے ہیں ان کے ستون اور چھت سب سنگ سرخ کے ہیں۔ تالاب قد آدم گہرا ہے اور مستطیل ہے۔ اس کے

چاروں طرف دروازے ہیں جو عورتوں کے نہانے کے وقت بند کر دیئے جاتے ہیں۔

تالاب کی ایک طرف بڑی آبشار ہے جس کا اصل رستہ تو سڑک سے ملحق ہے لیکن جس کا ایک دروازہ تالاب کی طرف سے بھی ہے۔ آبشار سے تین طرف سقف بڑے بڑے برآمدے ہیں ہر برآمدہ میں پانچ پانچ در ہیں۔ برآمدوں کا فرش سنگ سُرخ کا ہے آبشار کے گرد چاروں طرف سیاہ و سفید سنگِ مرمر کے خطوط اپنی خوب صورتی کی بہار دکھلاتے ہیں۔ آبشار کے نیچے آٹھ سیڑھیوں کے بعد ایک حوض آتا ہے جس میں تیس چالیس فوارے ہیں اور جن کا درمیانی فوارہ نہایت خوب صورت و بلند ہے۔ اس پر جانوروں اور آدمیوں کی کئی تصویریں ہیں یہ سب فوارے سنگ مرمر کے ہیں مگر پانی نے ان کو زنگ آلودہ کر دیا ہے بہت سے فوارے شکستہ حالت میں ہیں۔ جہنم صاحب نے توقع دلائی تھی کہ ان فواروں کی بہت جلد مرمت ہونے والی ہے۔

آبشار کلاں کے تینوں برآمدوں کی چھت نقش و نگار سے آراستہ ہے کہیں کہیں شیشے بھی چھت میں لگے ہوئے ہیں۔

جس طرح بادشاہی شالامار باغ میں آبشار کے اوپر ایک وسیع بارہ دری ہے۔ اسی طرح اس باغ میں بھی آبشار کے اوپر بارہ دری بنائی گئی ہے گو اس شوکت و عظمت کو نہیں پہنچتی لیکن پھر بھی بانیٔ باغ کی خوش مذاقی کی داد دینی پڑتی ہے سنگ سرخ کی پندرہ سیڑھیاں طے کرنے کے بعد یہ مختصر سی بارہ دری آتی ہے۔ جس کے بارہ محرابی در ہیں۔ فرش پر سیاہ و سفید دونوں قسم کا سنگ مرمر ہے مگر ستون صرف سفید سنگ مرمر کے ہیں یہاں سے مغربی جانب کے کھیتوں کا سبزہ زار ایک دلچسپ نظارہ پیش کرتا ہے۔

بارہ دری اور آبشار کے عقب میں وہ نہایت ہی عمیق کنواں ہے جس سے پنڈت جنار دھن کے زمانہ میں انجن کے ذریعہ پانی نکالا جاتا تھا۔ اور جس کو اب موجودہ جہنم نے بہت بڑا انجن منگوا کر اور بھی وسعت دے دی ہے۔ اسی کے ساتھ بجلی کا ایک کارخانہ بھی تیار ہو رہا ہے۔ جو اسی انجن کے ذریعہ چلا کرے گا اسی جگہ وہ حوض ہے جہاں گرمیوں میں نہایا جاتا ہے اور جس کی چھت میں ایک عظیم فوارہ لگا ہوا ہے۔

پرائیویٹ باغ کے بھی کئی دروازے ہیں مگر بڑا دروازہ وہی ہے جو بڑے باغ کے دروازہ کے سامنے ہے۔ اس میں سیب۔ ناشپاتی۔ لیچی۔ بادام۔ انار۔ سنگترے۔ بارہ ماسی نارنگی۔ گلاب جامن آم وغیرہ کے بکثرت درخت ہیں بائیں طرف ایک خوشنما حوض آتا ہے۔ جس کے گرد چند ایک عمارتیں ہیں پھر لنگر خانہ کے مکانات ہیں جن کے ساتھ زنانہ و مردانہ عالیشان سہ منزلہ مکانات بنے ہوئے ہیں انہی مکانات میں پنڈت جنار دھن خود رہا کرتے تھے۔ مکانات کے سامنے ایک وسیع تالاب تیس فٹ لمبا اور اسی قدر چوڑا ہے جس کی گہرائی سات آٹھ فٹ تک ہے اس کے چاروں طرف لال ٹینیں ہیں ان کی روشنی کا عکس جب پانی میں پڑتا تھا تو عجب لطف آتا تھا۔ بانیٔ باغ کی وفات کے بعد یہ تالاب مٹی سے بھروا کر اس کے اوپر پختہ فرش کر دیا گیا ہے۔

اس باغ کے دو پودے قابل ذکر ہیں ایک گلاب جامن جس کا پھل دو آتشہ گلاب کا ذائقہ دیتا ہے ایک بارہ ماسی نارنگی جو بارہ مہینے پھل دیتی رہتی ہے اور سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ ایک ہی درخت میں کسی جگہ نارنگی پختہ ہو کر سُرخ ہو چکی ہے کہیں خام ہے اور سبز ہے۔ کہیں کلیاں پھوٹ رہی ہیں۔ کہیں شگوفے نکل رہے ہیں کسی شاخ پر پت جھڑ کا موسم ہے اور کوئی